ملائیشیا

میں چند روز

رضوان صدیقی

ملائیشیا میں چند روز

محترم جناب امر جلیل صاحب
کی خدمت میں
پُر خلوص کے ساتھ

رضوان صدیقی
2/6/13

جملہ حقوق بحق بیگم رضوان محفوظ

مصنف ..... رضوان صدیقی

اہتمام ..... علی حسن ساجد

کمپوزنگ ..... شازیہ ناجی

سرورق/تصویری خاکے ..... عدیل الظفر

قیمت 500روپے

تعاون بشکریہ

بلدیہ عظمیٰ کراچی

بیرون ملک رابطہ کیلئے

مظہر صدیقی 8322835365 (ہیوسٹن)، محمد کامل شیخ 5168128514 (نیویارک)

تقسیم کار

فضلی سنز پرائیویٹ لمیٹڈ، اردو بازار کراچی، ویلکم بک پورٹ، اردو بازار کراچی،
فرید پبلشرز، اردو بازار کراچی

رضوان صدیقی C-40 'بلاک 3' گلستان جوہر' کراچی۔ فون: 0333-2096442

انتساب

سفیان ارسلان، ریان ارسلان
زنیرہ کاظمی، انوشا عدیل، رشنا عدیل

کے نام

اس دعا کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ انہیں علمِ نافع
عطا فرمائے، معاشرہ کا مفید شہری
اور انسان دوست بننے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

فہرست

☆ اظہارِ تشکر 5
☆ محمود شام 7
☆ الطاف شیخ 10
☆ ملائیشیا کے لئے پرواز 12
☆ لنکاوی 27
☆ برڈ پارک 44
☆ کالی ریت کا ساحل 50
☆ مگرمچھ کا تماشہ 52
☆ تتا پانی 57
☆ سمندر میں میٹھا پانی 65
☆ سفید ریت کا ساحل 75
☆ عقابوں کا نشیمن 80
☆ پینانگ 97
☆ بوٹو نیکل گارڈن 113
☆ کرافٹ باتک 119
☆ خوابیدہ بدھا 122
☆ فورٹ کارنیلئس 127
☆ کومتار ٹاور 151
☆ نیگری مسجد 162
☆ جینٹنگ ہائی لینڈ 181
☆ فرسٹ ورلڈ ریزورٹ 185
☆ کنگ پیلس 224
☆ نگارا میوزیم 228
☆ قومی یادگار 234
☆ اسٹیٹ مسجد 258
☆ گھر کی طرف واپسی 285

اظہارِ تشکر

شکریہ ادا کرنا جس قدر آسان ہوتا ہے اسے تحریر میں بیان کرنا اسی قدر مشکل ہوتا ہے۔ سب سے پہلے تو میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے لکھنے کی صلاحیت عطا کی جس کے نتیجے میں میری ایک اور کتاب قارئین کے ہاتھوں میں ہے۔ 2008ء میں' میں نے اپنی اہلیہ کے ساتھ ملائیشیا کا سفر کیا تھا۔ واپس آ کر دو ماہ میں سفر کے تاثرات اور مشاہدات لکھ بھی لئے تھے مگر میری انتھک کوششوں کے باوجود اس کی طباعت اور اشاعت کا کوئی بندوبست نہیں ہو پا رہا تھا۔ اُدھر امریکہ سے ہمدمِ دیرینہ کامل شیخ کا اصرار کہ سفرنامہ جلد چھپے۔

رواں سال مارچ کے مہینے میں میرے ایک پرانے ساتھی اور ہمدرد محمد حسین سید نے ایک ملاقات کے دوران پوچھا کہ بہت دنوں سے آپ کی کوئی تازہ کتاب نہیں آئی۔ میں نے اپنی مشکلات بیان کیں تو کہنے لگے پریشان کیوں ہوتے ہو اس کی طباعت ہم کرائے دیتے ہیں کہ کراچی میونسپل کارپوریشن کے پاس اپنی جدید پرنٹنگ مشینریز ہیں اور طباعت و اشاعت کے لئے ایک علیحدہ شعبہ قائم ہے۔

اس گفتگو کے بعد ان کی ہدایت کے مطابق میں نے ایک خط لکھا اور اپنا کمپوز کیا ہوا مسوّدہ ان کے سپرد کر دیا۔ اور یوں تقریباً ساڑھے تین برس کے بعد یہ تازہ سفرنامہ زیورِ طباعت سے آراستہ ہوا۔ میں ذاتی طور پر محمد حسین سید صاحب کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مشکل گھڑی میں میری مدد کی۔ اس موقع پر عدیل الظفر کہ جنہوں نے کتاب کا سرِ ورق اور تصویری

خاکے تخلیق کئے نیز علی حسن ساجد کہ جنہوں نے کتاب کی طباعت میں میری معاونت کی بجا طور پر میرے شکریہ کے مستحق ہیں۔

جناب مستنصر تارڑ صاحب کے سفر نامے میں نے طالب علمی کے زمانے سے پڑھنا شروع کئے مگر زندگی میں کبھی ان سے ملاقات نہیں ہوئی اور وہ شاید مجھے جانتے بھی نہیں لیکن جب میں نے فون پر ان سے اپنی کتاب پر فلیپ لکھنے کی خواہش کا اظہار کیا تو انہوں نے از راہ عنایت مجھ سے وعدہ کیا، میں نے کتاب کا مسوّدہ ان تک پہنچایا اور چند روز ہی میں انہوں نے اپنی محبت بھری رائے سے نوازا۔ ان کے ساتھ جناب محمود شام اور جناب الطاف شیخ کا بھی بے حد شکریہ کہ انہوں نے میرے ''سفر نامہ'' پر اپنے گراں قدر خیالات کا اظہار کیا۔ آخر میں' میں اپنے نہایت مہربان دوست سینیٹر عبدالحسیب خان کا بھی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے ''ملائیشیا میں چند روز'' کی طباعت و اشاعت کے لئے معاونت کا یقین دلایا تھا کہ اسی دوران محمد حسین سید نے میرے ہاتھوں سے مسوّدہ لیا اور اُسے زیور طباعت سے آراستہ کر کے آپ تک پہنچانے کا اہتمام کیا۔

اللہ تعالیٰ ان سب لوگوں کو آسانیاں فراہم کرے۔ آمین

۱۹ر نومبر ۲۰۱۲ء

محمود شام

کہنہ مشقی۔ بزرگی۔ مضمحل قویٰ کے ساتھ اگر کسی اور عمل کا رشتہ ہے تو وہ ہے دیباچہ نگاری۔ اسے بڑھاپے کا جبر کہہ لیجئے۔ دوست اور اجنبی بھی۔ سب آپ کو اسی قابل سمجھتے ہیں۔ ان سب کرم فرماؤں کا یہ خیال ہوتا ہے کہ

مضمحل ہوگئے قویٰ غالب
اب عناصر میں اعتدال کہاں

اب یہ لکھنے اور لکھانے کے اہل نہیں رہے۔ تخلیقی سوتے خشک ہو چکے ہیں۔ یہ مسودے پڑھ کر دیباچہ ہی لکھ سکتے ہیں۔ جن مہذب ملکوں میں ایسی کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ جن کی ان معاشروں میں بہت افادیت ہوتی ہے اور یہ وہاں کی سوچ کو آگے لے کر جاتی ہیں۔ وہاں جن صاحبان فضل کو پیش لفظ۔ دیباچہ یا تقریظ کی زحمت دی جاتی ہے۔ وہ یقیناً علم کے ایسے مقام پر ہوتے ہیں کہ ان کی تحریر اپنی جگہ ایک دستاویز ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں بھی بہت سی لازوال کتابوں کے مقدمے آج بھی ایک الگ علمی، ادبی و تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ مغرب میں بھی بعض تصنیفات کو ان کے پیش لفظ کی وجہ سے مقبولیت حاصل ہوتی ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ سرورق پر کتاب کے مصنف سے کہیں زیادہ پیش لفظ لکھنے والے کا نام نمایاں ہوتا ہے۔ خریدار اس دھوکے میں کتاب خرید لیتے ہیں کہ یہ تو بڑے ملکوں کے بڑے لوگوں کی بڑی باتیں ہیں۔

رضوان صدیقی بہت نفیس۔ متین اور جاذب نظر شخصیت ہیں۔ لکھتے بھی اچھا ہیں اور بولتے بھی۔ مجھے قطعاً معلوم نہیں ہے کہ میرے پیش لفظ سے ''ملائیشیا میں چند روز''..... میں کتنے چاند لگ جائیں گے۔ اب تک تو اردو میں عہد حاضر میں جو سفر نامے نظر انداز ہوئے ہیں۔ ان میں مسافر اکیلا ہی غیر ملکی حسینوں کے درمیان راجہ اندر بنا دکھائی دیا۔ ان سب عاشق مزاج بزرگوں کا مشورہ یہی تھا کہ اجنبی سرزمینوں میں جاؤ تو اکیلے۔ تاکہ کسی دباؤ اور تناؤ کے بغیر نظارے کر سکو۔ سفر کی ترغیب دی جاتی ہے۔ تو ہورڈنگز میں یہی لکھا ہوتا ہے۔ Stress Free۔ (دباؤ کے بغیر)۔

رضوان صدیقی اپنا دباؤ اپنے ساتھ لیکر چلتے ہیں۔ مجھے ان کے ساتھ ایک ہی غیر ملکی سفر کا اتفاق ہوا ہے اور میں ہمیشہ اس کے لئے ان کا ممنون و مرہون بھی رہا ہوں ..... کہ عمرے کی سعادت ان کے وسیلے سے حاصل ہوئی۔ وہاں تو خیر بیگم کو ساتھ لے جانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ان کے انتظامات بہت آرام دہ تھے۔ اس سفر میں ناصر زیدی بھی تھے۔ احمد فراز بھی۔

عمر بھر شاعری دیتی رہی اعزاز ہمیں
آج حرمین میں لے آئی بصد ناز ہمیں

''ملائیشیا میں چند روز'' میں رضوان صدیقی لکھتے نہیں بولتے سنائی دیتے ہیں۔ لگتا یہی ہے کہ وہ اپنے مخصوص شائستہ لہجے۔ مرصع الفاظ میں ہمیں ساتھ لے کر چل رہے ہیں۔ بار بار وہ خود ہی احساس دلاتے ہیں کہ ان پر دباؤ ہے۔ وہ اپنی ''نیب'' ساتھ لئے چل رہے ہیں کہیں کہیں ان کے محو خواب ہونے یا نماز کی ادائیگی میں مصروف ہونے سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ تاکا جھانکی کرتے ہیں۔ لیکن دوسرے سفر نگاروں کی طرح کسی نئے رومانی سلسلے میں بندھ نہیں جاتے۔ بس اتنا ہے۔

تک دیکھ لیا دل شاد کیا اور چل نکلے

ملائیشیا ہم نے بھی کچھ کچھ دیکھا ہے لیکن ہمارا مشاہدہ صرف کوالالمپور اور پترا جایا تک محدود رہا۔ ایک بار ہم محترمہ بے نظیر بھٹو کے دورے میں بطور صحافی گئے۔ ڈاکٹر مہاتیر محمد کو دیکھنے اور ان سے ہاتھ ملانے کی آرزو پوری ہوئی۔ ڈسکو بھی دیکھے۔ مسجدیں بھی۔ میخانے بھی۔ شاہراہوں پر خواتین اسکرٹ میں بھی نظر آئیں۔ مکمل حجاب میں بھی۔ واحد ایشیائی مسلم ملک ہے جس نے مغرب کو للکارا بھی اور ترقی کر کے بھی دکھائی۔ جمہوریت بھی ہے۔ اور تقریر و تحریر پر پابندیاں بھی اسی لئے معیشت مستحکم رہی ہے۔ کسی کے ''عقیدے کو نہ چھیڑو۔ اپنا عقیدہ نہ چھوڑو'' مذہبی تضادات بھی تھے۔ نسلی اور لسانی تصادم بھی۔ مگر سنجیدگی اور اعتدال پسندی سے ان بحرانوں پر قابو پایا گیا۔ دوسری بار ہمارا جانا ہوا صدر جنرل پرویز مشرف کے دور میں۔ یہاں تاریخی اسلامی سربراہ کانفرنس منعقد ہوئی تھی بہت اہم تقریریں۔ قراردادیں۔ اقتصادی فیصلے۔ یہیں ہماری ملاقات روس کے موجودہ سربراہ پیوٹن سے بھی رہی۔

مگر جو ملائیشیا ہمیں رضوان صدیقی دکھا رہے ہیں۔ وہ اس سرکاری آداب و احترام اور پروٹوکول سے مختلف ہے۔ گئے وہ اپنے خرچ پر۔ لیکن ہمیں مفت میں ملائیشیا کے مختلف شہر اور

قصبے دکھا رہے ہیں۔ ساتھ ساتھ لئے چلتے ہیں۔ ایئر پورٹوں کی منظر کشی۔ ہوٹلوں کی تفصیلات۔ بازاروں کی رونقیں۔ ایک طرح سے وہ ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔ زرمبادلہ کی شرح بھی بتاتے ہیں۔ کہاں کیا مشکلات پیش آسکتی ہیں۔ ان کا سامنا کیسے کرنا ہے۔ کیا کھانا ہے کیا نہیں بیگم کے ساتھ ہوتے ہوئے حسن کا نظارہ کس طرح کرنا ہے۔ حرفِ بازناں گفتن میں کیسے کامیاب ہوتا ہے۔ قدم قدم پر وہ معلومات بھی فراہم کرتے ہیں۔ صرف جذباتیت اور رومان سے صفحات رنگین نہیں کرتے۔ ہر مقام کے بارے میں ضروری اطلاعات بھی دے رہے ہیں۔ اپنے مخصوص انداز تحریر کے ساتھ کچھ خاکے بھی دے رہے ہیں جو تصاویر سے زیادہ موثر ہیں۔ رضوان صاحب کا تصویری خاکہ بہت پرکشش ہے۔ جس نے بھی یہ لکیریں کھینچی ہیں۔ وہ قابل تحسین ہیں۔

ملائیشیا میں نظاروں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے وہ پاکستان کو نہیں بھولتے۔ تقابلی مطالعہ جاری رہتا ہے۔ کراچی کی یادیں تازہ ہوتی رہتی ہیں۔ دوست احباب کے چہرے ان کے سامنے لہراتے رہتے ہیں۔ شکر ہے کہ وہاں انہیں ہم یاد نہیں آئے۔ قمر علی عباسی کی دوستی ان پر غالب رہی حالانکہ ان کے سفرناموں میں اتنی سنجیدہ اطلاعات اور معلومات نہیں ہوتیں۔ وہاں زلف ورخسار کی باتیں زیادہ ہوتی ہیں۔

میں رضوان صاحب کو مبارکباد دینا چاہوں گا کہ وہ اس کتاب کے ذریعے پاکستان کے قارئین کو بالواسطہ اعتدال۔ برداشت۔ تحمل اور میانہ روی بھی سکھا رہے ہیں اور یہ بات بھی ذہن میں بٹھا رہے ہیں کہ شہر کیسے بسائے جاتے ہیں۔ ان میں انسانوں کے لئے سہولتیں کیسے فراہم کی جاتی ہیں۔ کاش اسے وہ لوگ پڑھ سکیں۔ جن کے فرائض میں پاکستان میں زندگی آسان بنانا شامل ہے۔

☆☆☆

الطاف شیخ

ملائیشیا سے میرا تعلق 1968ء سے جاری ہے پہلے جہاز چلانے کے دوران، پھر وہاں ملازمت کے سلسلے میں اور اب بھی وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے مختلف تعلیمی اداروں میں تدریس دیتا رہتا ہوں میں اپنے کسی ہم وطن کو ملائیشیا میں دیکھتا ہوں تو اسے اپنے سفر کا احوال قلمبند کرنے کا کہتا ہوں کیونکہ انسان کی باہر کی آنکھ تو وہی نظارہ دیکھتی ہے لیکن ہر ایک کی اندر کی آنکھ مختلف منظر کو الگ ہی انداز سے دیکھتی ہے مجھے رضوان صدیقی پر حیرت ہوتی ہے کہ انہوں نے جس انداز سے اپنے سفر کی روداد تحریر کی ہے وہ نہ صرف ادبی لحاظ سے ایک پرکشش سفر نامہ ثابت ہوا ہے بلکہ معلوماتی نقطہ نظر سے ایک نئے مسافر کے لئے گائیڈ بک کی حیثیت رکھتا ہے۔

رضوان صدیقی ادبی دنیا کی ایک مشہور شخصیت ہیں وہ سرکاری ملازمت میں مشغول ہونے کے باوجود ادب کی خدمت میں بھی جتے ہوئے ہیں وہ افسانہ نگار، ڈرامہ نگار کے ساتھ ساتھ سفر نامہ نویس بھی ہیں کافی عرصہ قبل میں نے ان کے افسانوں کا مجموعہ ''ایک گاؤں کی کہانی'' اور ایک سفر نامہ۔۔۔''ذکر ایک عمرہ کا'' پڑھا تھا اس کے علاوہ ان کی دوسری بھی کئی مشہور تصانیف ہیں مثلاً ''روشن اندھیرے، جوہر طراز، جھیل سیف الملوک اور آستانے سے پیرس تک''

''ملائشیا میں چند روز'' ان کے تازہ سفر کا احوال ہے حالانکہ یہ سفر انہوں نے ''بزرگی'' کی عمر میں کیا لیکن ان کی تحریر میں نوجوانوں والی شرارتیں اور طنز و مزاح بدرجہ اُتم موجود ہیں۔ ایک بار مطالع شروع کیا جائے تو ایئر ہوسٹس کے متعلق ان کی حقیقت پسندانہ کمنٹس، ملائیشیا کے لوگوں اور ماحول کے متعلق بیان کردہ Observation پڑھ کر ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ آجاتی ہے کہیں کہیں قہقہہ ضبط کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ رضوان صدیقی صاحب نے ملائیشیا کے اہم شہروں کوالالمپور، پینانگ اور لنکاوی جزائر کا احوال ایسے دلنشین انداز میں پیش کیا ہے کہ میں ملائیشیا کی سیر کو جانے والوں کو مشورہ دوں گا کہ وہ اس قسم کا سفر نامہ پڑھ کر روانگی اختیار کریں تاکہ انہیں معلوم ہو سکے کہ انہیں کس شہر میں کیا کچھ دیکھنا چاہیے اور ان چیزوں کی سماجی اور

تاریخی حیثیت کیا ہے۔

لنکاوی گو کہ خوبصورت جزیرہ ہے اور کثیر تعداد میں ٹورسٹ ، خاص طور پر یورپ کے اطراف کے لوگ یہاں شوق سے آتے ہیں جب کہ ہمارے لوگوں کے لئے پینانگ جزیرہ زیادہ کشش رکھتا ہے انگریزوں کا آباد کیا ہوا یہ جزیرہ ایسا خوبصورت منظر پیش کرتا ہے جیسا کہ ستر کی دہائی سے قبل کراچی کا صدر اور بولٹن مارکیٹ کے علاقے پیش کرتے تھے ہمارے مصنف رضوان صدیقی صاحب نے پینانگ کا اس قدر تفصیلی احوال بیان کیا ہے کہ اس کتاب کو پڑھنے والا پینانگ میں کسی گائیڈ کی ضرورت محسوس نہیں کرے گا۔

رضوان صدیقی صاحب کو چاہئے کہ وہ ملائیشیا کے مزید دو تین چکر لگائیں اور وہاں کے دیگر اہم شہروں پر بھی ایسا تفصیلی احوال تحریر کریں مثلاً پیراق ریاست کا شہر ایوح، جوہر ریاست کا شہر جوہر بارو، جو کازوے کے ذریعے سنگاپور کے ساتھ جڑا ہوا ہے، ملائیشیا کا تاریخی شہر ملاکا (جہاں میں یہ سطریں تحریر کر رہا ہوں) اور ملائیشیا کے مشرقی کنارے کی پرسکون ریاستیں ترنگانوں اور کیلنتان، جن کے خوبصورت سمندری کنارے دنیا بھر میں مشہور ہیں۔اس کے علاوہ رضوان صاحب دنیا کے دیگر شہروں اور ملکوں کی سیاحت کے لئے بھی نکلیں تا کہ ہمیں ایسے خوبصورت سفرنامے پڑھنے کو ملیں۔ملائیشیا کے بارے میں یہ پہلا سفرنامہ ہے جو بے حد دلچسپ اور خوبصورت ہے۔

☆☆☆

ملائیشیا کے لئے پرواز

رضوان صدیقی

سفر کی تیاری مکمل ہوئی ۔باقی معاملات اللہ پر چھوڑ دیئے۔۔گھریلو امور اور تقریبات میں بیگم وقت کی پابندی کا احساس دلاتی رہی ہیں اس لئے ہم بہت سی تقریبات میں پہلے پہنچنے والے مہمانوں میں شامل ہوتے ہیں اور خود ہی اپنے آپ سے شرمندہ ہوتے رہتے ہیں کہ ہم نے معاشرہ میں مروجہ روایت کی خلاف ورزی کی ہے۔بیگم ہی کے اصرار پر ہم رات سوا نو بجے گھر سے نکلے۔۔۔ارسلان ہمارے ساتھ تھا۔تقریباً ہم ساڑھے نو بجے ایئرپورٹ پہنچے۔ پروگرام کے مطابق حسان۔۔۔میجر کوثر کاظمی۔۔المنیٰ اور زینی بھی ایئرپورٹ پر موجود تھے۔چھوٹی بیٹی نہدیہ اوران کی بچیاں انوشا اور رشنا کو ہم نے ایئرپورٹ تک چلنے سے منع کر دیا تھا اس لئے انہوں نے ہمیں گھر سے روانگی کے وقت خدا حافظ کہا۔۔

جاوید حسن نے اپنے ایک ساتھی نثار کو ہماری رہنمائی کے لئے ایئرپورٹ پر پہنچنے کی ہدایت کی تھی۔۔۔ہم ابھی نثار کی تلاش میں تھے کہ ہمارے دوست ناظم ہمیں ایئرپورٹ پر مل گئے۔۔۔وہ آرٹس کونسل کے رکن اور ہمارے طرفدار ہیں۔

پوچھا کہاں کا ارادہ ہے۔کیا باہر جارہے ہیں۔

ہم نے بتایا ملائیشیا جارہے ہیں۔

خوش ہوئے اور بولے کوئی مسئلہ تو نہیں ہے۔

میں نے کہا نہیں سب ٹھیک ہے۔

محبت سے کہنے لگے۔۔۔۔۔۔کوئی کسٹم کا کام ہو تو بتائیں تکلف نہ کریں۔

ہمارے جی میں آئی کہ۔۔۔۔کہہ دیں کہ کچھ پاکستانی بسکٹس کے پیکٹ اور بیگم کے ہاتھ کی پکائی ہوئی ٹکیاں ہمارے پاس ہیں جنہیں ہم، سفر کے دوران جگالی کرنے کے لئے لے

جارہے ہیں۔۔۔۔پھر خیال آیا کہ ان کی نگاہ میں رضوان صدیقی ریٹائرڈ سرکاری افسر ہیں شہر میں ان کا بڑا نام ہے ہر سال آرٹس کونسل آف پاکستان کراچی کے سالانہ انتخابات میں انہیں ووٹ دیتے ہیں حیرت ہے کہ وہ اپنے ہمراہ کچھ لے کر نہیں جارہے۔۔۔بس یہی سوچ کر بڑی بے نیازی سے جواب دیا کہ کسٹم وغیرہ کا بندوبست کرلیا ہے۔

بولے ضوان بھائی۔۔۔۔ابھی میں کافی دیر تک ایئرپورٹ پر ہی ہوں کوئی پرابلم ہو تو بلاتکلف بتا دینا۔۔۔۔۔۔۔۔۔بلکہ آپ یوں کریں میرا فون نمبر لکھ لیں۔۔۔۔۔۔۔۔ہم نے قلم نکال کر ایک کاغذ پر ان کا سیل نمبر لکھ لیا اور ان کا شکریہ ادا کیا۔۔ناظم اپنے کسی دوست کو خدا حافظ کہنے آئے تھے اس لئے اجازت لیکر ہجوم میں گم ہوگئے۔۔۔۔اسی دوران ہمارا بھتیجا ظلّ الرحمٰن صدیقی نظر آ گیا۔

حیرت سے کہنے لگا۔۔۔۔۔۔۔۔چاچا۔۔۔۔۔۔۔آپ کہاں جارہے ہیں ہم نے بتایا کہ کوالالمپور جارہے ہیں مگر تم یہاں کیسے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔؟

کہنے لگا۔۔۔۔طاہرہ کے بچے امریکہ جارہے ہیں پاپا بھی آئے ہوئے ہیں۔

ہم مرتاض بھائی کی تلاش میں ذرا آگے بڑھے کہ نثار صاحب نے ہم کو پہچان لیا۔۔ انہوں نے ہم سے پاسپورٹ، جہاز کے ٹکٹ اور دیگر کاغذات لئے اور کہنے لگے آیئے جلدی کریں۔۔۔

ہم خاصے عرصے بعد ملک سے باہر جارہے تھے۔۔۔۔۔۔ہم نے سب بچوں کو خدا حافظ کہا۔۔۔۔۔بیگم نے ارسلان اور حسان کو گھر کے متعلق کچھ ضروری ہدایات دیں اور گلے لگا کر پیار کرتے ہوئے ہاتھ ہلا کر اللہ حافظ کہا اور ٹرالی پر رکھے مختصر سے سامان کے ساتھ ڈیپارچر لاؤنج کی طرف چل دیئے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

ملک سے باہر جانے والے مسافروں کو کئی مرحلوں سے گزرنا ہوتا ہے۔۔۔۔۔لیکن نثار صاحب کی وجہ سے ہم جلد ہی امیگریشن سے فارغ ہوکر سکیورٹی گیٹ تک پہونچ گئے۔۔۔۔ یہاں پر چند لوگ قطار میں کھڑے تھے ہم یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ مسافروں سے جوتے اتروا کر ان کے جوتے اسکیننگ مشین سے گزارے جارہے تھے بیگم نے حیرت سے یہ منظر دیکھا تو، سرگوشی میں کہنے لگیں

کیا، ارباب غلام رحیم بھی اسی جہاز سے جارہے ہیں۔۔۔۔؟

معلوم نہیں، لیکن ہمارے لئے یہ صورتحال پریشان کن تھی ۔۔۔۔اب صورتحال یہ تھی کہ لوگ اپنے جوتے اتارنے کے لئے بغیر کسی سہارے اور نشست کے U ٹرن لیتے ہوئے فیتے کھولتے ۔۔۔۔دونوں جوتوں کو ہاتھ میں پکڑ کر اسکیننگ مشین پر رکھتے اور ازاں بعد ننگے پیر خود اسکینر گیٹ سے گزرتے جاتے ۔۔۔۔۔۔پھر بازو سیدھے کرتے پھر بازو اوپر اٹھاتے ۔۔۔۔اور عوامی زبان میں اپنی جھاڑا تلاشی کراتے ۔۔۔میرا خیال ہے کہ ان میں سے کچھ مسافر تو ایسے تھے جنہوں نے اسکول میں کبھی P.T بھی نہیں کی ہوگی اور نہ وہ ورزش کرنے کے عادی معلوم ہوتے تھے یہ مناظر نا گوار تو بہت گزرے مگر اس خیال سے چپ رہے کہ امریکہ اور دیگر یورپی ممالک میں ہم پاکستانیوں کے ساتھ یہی کچھ سلوک ہوتا ہے اور وہ بھی غیروں کے ہاتھوں ۔۔۔۔۔۔جب ہم اسے برداشت کر لیتے ہیں تو چلوں حفاظتی احتیاط کے نام پر یہ سب کچھ اتنا خراب بھی نہیں یوں بھی مثل مشہور ہے کہ اپنا مارتا ہے تو چھاؤں میں رکھتا ہے۔

ہماری باری آئی تو کہا گیا کہ Metal کی چیزیں یہاں رکھ دیں ۔۔۔۔ہمارے پاس کچھ نہیں تھا سوائے ایک سگریٹ لائٹر کے ۔۔۔۔۔وہ ان کی خدمت میں پیش کر دیا کہ دیکھ کر واپس کر دیں گے لیکن Security Person نے نہایت بے نیازی سے سگریٹ لائٹر لے کر کرسی کے نیچے ایک باسکٹ میں پھینک دیا جہاں درجنوں لائٹرز پڑے تھے ۔۔۔۔۔ہم چپ رہے ۔۔۔۔۔ہم ہنس دیئے ۔۔۔۔۔۔پھر ایک صاحب نے اشارہ کیا کہ بیلٹ کھول دیں۔

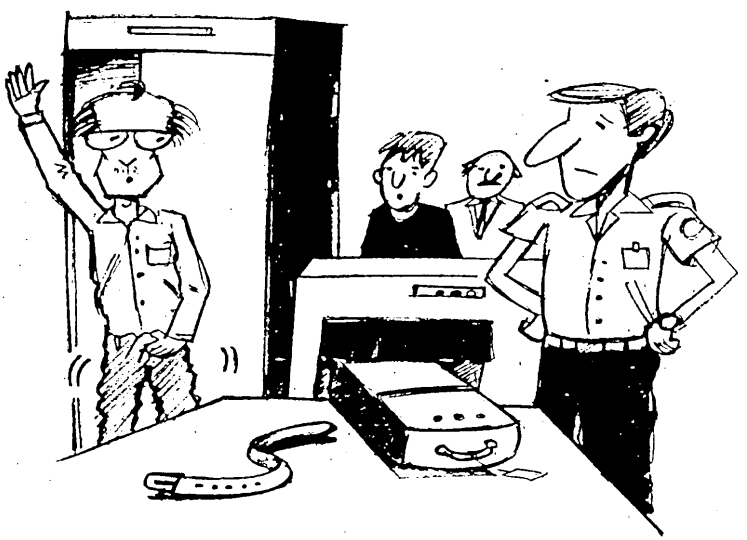

جی!!۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔میں پریشان ہوگیا کیونکہ صرف مجھے معلوم تھا کہ ہماری جینز دو انچ ڈھیلی ہے یہ ایسا ہی تھا کہ بیچ بازار کسی شریف آدمی کی شلوار سے اس کا کمر بند کھینچنے کی کوشش کی جائے۔۔۔۔۔۔اب ہر کوئی راون تو ہوتا نہیں کہ درجن بھر ہاتھوں سے کھلی اور بکھری شلوار کو قابو کر لے۔۔۔۔۔۔۔بیلٹ کھولنے کا مطلب تو یہی تھا کہ ہم دونوں ہاتھوں سے جینز کو پکڑے کھڑے رہیں۔۔۔۔ابھی ہم اسی تذبذب میں تھے کہ انہوں نے پھر اصرار کیا۔۔۔۔مجبوراً ہم نے پتلون سے اپنا بیلٹ نکال کر ان کی خدمت میں پیش کر دیا اور دونوں ہاتھوں سے ڈھیلی اور گرتی ہوئی جینز کو بالکل اسی طرح پکڑ لیا جیسے اسکول کے زمانے میں Annual Sports Week کے دوران بوری ریس کے مقابلے میں حصہ لیتے وقت دونوں ہاتھوں سے بوری پکڑ لیتے تھے اور اچھل اچھل کر دوڑ لگاتے تھے اب ہمیں ہدایت کی گئی کہ اسکینر گیٹ سے گزر جائیں۔۔۔۔یہ مرحلہ ہم نے جیسے تیسے طے کیا تو سامنے کھڑے سپاہی نے حکم دیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔کہ ہاتھ اوپر اٹھائیں یہ تو ہمارے لئے کسی طرح بھی ممکن نہیں تھا کہ ہم تو بچپن میں پھلیلی نہر میں نہاتے وقت بھی کپڑے نہیں اتارا کرتے تھے۔۔۔۔۔انہوں نے دوبارہ حکم دیا تو ہم نے اشارہ سے انہیں اپنی مجبوری بتائی سپاہی کو ہماری ڈھلتی جوانی۔۔۔۔بڑھتی عمر اور درمیانی بزرگی کا خیال آ گیا اور یہ رعایت دی کہ پہلے ایک ہاتھ اوپر اٹھائیں اور دوسرے سے گرتی پتلون کو پکڑے رہیں یہی عمل ذرا تبدیلی کے ساتھ دوبارہ دوہرایا گیا اور یوں ہم اس مشکل مرحلے سے نکل آئے۔۔۔۔۔۔اب ہمیں یہ خوف لاحق ہوا کہ سگریٹ لائیٹر کی طرح اگر انہوں نے ہماری بیلٹ بھی ضبط کر لی تو ہزاروں میل کا سفر بوری ریس کی طرح اچھل اچھل کر کیسے طے کریں گے وہ تو ہم نے اسکیننگ مشین سے باہر آتے ہوئے سامان پر نظر دوڑائی تو ہماری بیلٹ اس میں موجود تھی ہم نے سامان بعد میں اٹھایا پہلے بیلٹ پکڑی اور گہرا سانس لیا کہ کب سے سانس روکے اپنے پیٹ کو غبارے کی طرح پھلائے ہوئے کھڑے تھے ہم یہ بات بتانا بھول گئے کہ جوتے ہم سے نہیں اتروائے گئے کیونکہ وہ ربڑ کے تھے ان میں Metal استعمال نہیں ہوا تھا۔

اب تمام مراحل مکمل ہو چکے تھے۔۔انٹرنیشنل لاؤنج کی راہداری بہت طویل ہے ٹرالی ہم پیچھے چھوڑ آئے تھے کل سامان Handy کے طور پر ہمارے ساتھ تھا اب اس زادِ سفر کو آخری سرے تک یعنی گیٹ نمبر 18 تک اٹھا کر ساتھ لے جانا ہمارے لئے خاصا دشوار تھا اس مرحلے پر بھی نثار نے ہماری مدد کی یہاں جیپ سے ملتی جلتی ایک سواری موجود تھی اس کے وہیل بہت موٹے

تھے ٹریکٹر کے پہیوں سے زرا چھوٹے ۔۔۔۔۔۔۔۔ان میں آٹھ نشستیں تھیں اور کچھ میں اس سے بھی زیادہ نشستیں۔۔۔نثار نے اشارہ کیا تو جیپ نما سواری ہمارے قریب آ گئی ہم نے سامان رکھا دونوں میاں بیوی نشستوں پر بیٹھے اور روانگی سے پہلے نثار کا شکریہ ادا کر کے انہیں خدا حافظ کہا ۔۔۔گاڑی چلی تو ہم نے ڈرائیور سے پوچھا اس کا نام کیا ہے کہنے لگا ہم اسے بگھی کہتے ہیں ۔۔سواری بے آواز اور سبک رفتار تھی چند لمحوں میں گیٹ نمبر 18 کے قریب پہنچ گئے سامان اتار کر ڈیپارچر لاؤنج میں داخل ہوئے بہت کشادہ جدید اور خوبصورت لاؤنج ہے۔۔ ہماری فلائٹ کا وقت 11 بج کر 55 منٹ تھا 12 بجنے میں 5 منٹ کی تخفیف کا تکلف اس لئے کیا گیا تھا کہ 17 جون نہ ہو جائے پہلے ہم نے گیٹ نمبر 18 تلاش کیا اور اس کے قریب خالی نشستوں پر بیٹھ گئے سامان اپنے قریب کر لیا فلائٹ کی روانگی میں ابھی کافی دیر تھی۔۔۔۔۔مسافروں کی بڑی تعداد اپنی اپنی منزل کی جانب روانگی کے لئے تیار اور اعلان کی منتظر تھی لوکل ٹی وی پر اشتہارات دکھائے جا رہے تھے کچھ مسافر ڈیوٹی فری شاپس پر Window Shopping کر رہے تھے کافی دیر سے ہم نے سگریٹ نہیں پیا تھا اور یہ معلوم تھا کہ جہاز میں بیٹھنے کے بعد سگریٹ نوشی کی قطعی اجازت نہیں ہوگی۔۔۔۔۔پہلی بار ہمیں اونٹ پر پیار آیا کہ یہ ریگستانی جہاز ایک بار پیٹ بھر لیتا ہے اور پھر کئی دنوں تک بے آب و گیار یگستانوں میں چلتا رہتا ہے۔۔۔۔قدرت نے اونٹ کا پیٹ انسان کو عطا نہیں کیا۔۔۔۔۔اس میں میرے رب کی بڑی حکمت ہے ورنہ غریب آدمی اور گھریلو ملازمائیں خوشحال لوگوں کے بچے کھچے کھانوں سے اپنا پیٹ کیسے بھرتے۔۔۔۔۔۔۔۔شادی بیاہ کی رونقیں ماند پڑ جاتیں۔۔۔۔بڑے بڑے Dinners اور At Homes منعقد نہیں ہوتے بس چند قریبی عزیزوں کو مدعو کر کے نکاح اور ولیمے کی رسم ادا کی جاتی۔۔۔مہمان داری کا تو تصور ہی نہیں ہوتا اور افطار کرانے کے ثواب سے بھی لوگ محروم رہ جاتے۔۔۔۔۔ہاں خواتین کو فائدہ ہوتا ہفتہ عشرے میں بس ایک بار اکٹھا کھانا پکا لیتیں اور سب گھر والے دسترخوان کے گرد بیٹھ کر ہفتے، دس دن کے لئے پیٹ بھر لیتے۔۔۔۔۔۔۔۔بات سگریٹ نوشی کی ہو رہی تھی اور ذہن قلم کو لے کر کہاں نکل گیا۔۔۔مجھے یاد آیا کہ سفر شروع کرنے کے آخری مرحلے یعنی جہاز میں بیٹھنے سے پہلے سگریٹ نوشی کے عادی کہیں نہ کہیں سگریٹ ضرور پیتے ہیں اور اس عادتِ بد کے لئے یقیناً آس پاس سگریٹ نوشی کے لئے کوئی کمرہ مختص ہوگا۔ہم نے پہلے بیگم کو سامنے ٹک شاپ سے کافی لا کر دی اور

خود Smoking Zone کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے ایک صاحب نے اشارہ سے بتایا کہ دائیں طرف غیر شفاف شیشوں کی دیوار کے پیچھے ایک کمرہ ہے۔۔۔ہم دروازہ کھول کر اندر گئے۔۔۔عجیب منظر تھا کمرے میں دھواں اور سگریٹ کی بو پھیلی ہوئی تھی بہت سے سگریٹ نوش پلاسٹک کی کرسیوں پر بیٹھے اور باقی ایک ستون کے ساتھ لگی ہوئی گول میز کے گرد کھڑے جلدی جلدی سگریٹ پی رہے تھے عام طور پر ایک سگریٹ تین چار منٹ میں آرام آرام سے لطف لیتے ہوئے پیا جاتا ہے یہاں سگریٹ نوشی نہیں۔۔۔۔۔۔سگریٹ چوشی ہو رہی تھی یاد آیا طالب علمی کے زمانے میں جب جیب خرچ برائے نام ملتا تھا تو کبھی کبھی ایک سگریٹ کو دو تین دوست مل کر پیتے تھے اس وقت جس کے ہاتھ سگریٹ لگتی وہ ایسے دم کھینچتا کہ ایک ہی سانس میں سگریٹ آدھی کر دیتا دوسرا ساتھی اپنا حصہ یعنی سگریٹ چھین کر حاصل کرتا تھا۔۔۔ہم نے کافی کا پیپر کپ گول میز پر رکھا ڈبیہ سے سگریٹ نکال کر جلائی اور باقی لوگوں کی طرح جلدی جلدی کش لگانے لگے اس وقت احساس ہوا کہ نشہ بری عادت ہے۔۔۔خواہ کسی کا بھی ہو۔۔۔۔۔۔۔۔ہم سگریٹ نوشوں کی حالت بالکل ایسی تھی جیسے ہاکی میچ شروع ہونے سے پہلے ٹیم کے تمام کھلاڑی ایک دائرہ میں کھڑے ہوکر، سر جوڑ کر کھیل شروع کرتے ہیں اور اسی طرح ''مدیچی اور ہیروئنچی'' اکڑوں بیٹھ کر اپنا اپنا نشہ کرتے ہیں مجھے خیال آیا کہ بری عادتوں میں مبتلا لوگ بھی اپنے شوق کی تکمیل باہم بیٹھ کر اور سر جوڑ کر کرتے ہیں تو ہمارے حکمران قومی اور ملکی معاملات کو حل کرنے کے لئے کیوں باہم مل کر سر جوڑ کر نہیں بیٹھ سکتے۔۔۔ماضی میں اس کے اسباب کیا تھے۔۔۔۔اس سے قطع نظر فی الحال تو ہم یہی سمجھتے ہیں کہ سر جوڑ کر بیٹھنے سے لیڈروں کے چہرے ٹی وی کیمروں میں نہیں آسکتے اور سیاسی رہنما۔۔۔ٹی وی کیمروں کے سامنے ہی پارٹی اجلاس اور باہمی مشاورت کرتے ہیں ٹی وی ٹیم نہ پہنچے تو اجلاس کو مؤخر کر دیتے ہیں۔۔۔خیر اس کمرے میں ہم نے کافی کی مدد سے جس قدر سگریٹ کا دھواں اپنے پھیپڑوں میں Stock کر سکتے تھے وہ کیا کیونکہ ہم جانتے تھے کہ اب شاید دس گھنٹے کا روزہ رکھنا ہوگا کیونکہ چھ گھنٹے میں ہم کوالالمپور پہنچیں گے اور اس کے تین گھنٹے بعد ''لنکاوی'' کی فلائٹ پکڑینگے۔ممکن ہے سگریٹ نوشوں کے لئے کوالالمپور کے لاؤنج میں بھی Smoking Zone بنا رکھا ہو سنا ہے ملائیشیا والے بلا کے مہمان نواز ہیں تب ہی تو دنیا بھر سے سیاح تفریح اور آرام کے لئے ان کے ملک کا انتخاب کرتے ہیں۔

اب ہم بیگم کے پاس آکے بیٹھ گئے آس پاس کے ماحول کا جائزہ لیا تو ذرا حیرت ہوئی

نوجوان مسافروں میں سے اکثر نے جینز پہنی ہوئی تھی تقریباً تمام کم عمر لڑکیوں نے بھی جینز ہی ٹانگوں پر منڈھی ہوئی تھی۔۔۔۔ممتاز شاعر مرحوم سید محمد جعفری کے بقول بندوق کا غلاف ٹانگوں پر چڑھایا ہوا تھا کراچی کے فیشن ایبل علاقوں میں یہ مناظر نظر آتے ہیں لیکن یہاں لباس اور سکڑ گیا تھا دوسروں کی شکایت کیسی ہم خود بیٹے کی جینز پہنے ہوئے تھے بیلٹ کس کر کمر پر باندھی ہوئی تھی اور لمبائی کو کم کرنے کے لئے پائنچے الٹے کئے ہوئے تھے۔۔۔جیسے وضو کرتے وقت آستین کو الٹ لیتے ہیں۔

یہ جینز بھی عجیب پہناوا ہے اس کے کپڑے کو Danim کہا جاتا ہے جانے اسے کب انگریزوں نے ایجاد کیا سچ بات تو یہ ہے کہ بڑے کام کی چیز ہے بس ایک بار خرید لو۔۔۔نہ استری کی ضرورت۔۔۔نہ دھلائی کی حاجت۔۔۔اس کو پہن کر کام پر چلے جاؤ۔۔۔اسے پہنے پہنے پکنک منا لو۔۔۔اسی کو پہن کر نماز پڑھ لو۔۔۔نہ کریز ٹوٹنے کا ڈر۔۔۔نہ استری خراب ہونے کا خوف۔۔۔جینز پہن کر کسی چبوترے پر بیٹھ کر گپ لگاؤ اور رات اسی کو پہن کر سو جاؤ۔۔۔اس کے کپڑے Danim کی مضبوطی کا یہ عالم کہ اب جینز بنانے کی بین الاقوامی کمپنی LEVIS دنیا بھر سے پھٹی پرانی جینز خرید کر اس سے جوگرز بنا رہی ہے۔اور مہنگے داموں فروخت کر رہی ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ جینز کے بنے ہوئے جوگرز خوب فروخت ہو رہے ہیں خیال رہے کہ ہمارے دوست مرزا اختیار بیگ بہت معیاری Danim بناتے ہیں۔۔۔بہر حال جینز کو بین الاقوامی پہناوے کا اعزاز حاصل ہے۔جہاز پر بیٹھ کر بیگم نے Cell فون سے آخری بار منّی کو فون کیا۔۔۔۔۔۔اور اطلاع دی کہ ہم تمام مراحل سے گزر کے الحمدللہ جہاز پر بیٹھ گئے ہیں جواب میں منّی نے بتایا کہ امی! حیدرآباد والے نانا ابا کا انتقال ہو گیا ہے بیگم نے فوراً مجھے اطلاع دی تو میں نے فون لے کر منّی سے اظہار افسوس کیا اور کہا کہ حیدرآباد جاؤ تو برکات سے تعزیت کرنا۔۔

مولانا محمد علی رضوی میرے داماد میجر کوثر کاظمی کے رشتے میں نانا ہوتے ہیں۔۔۔۔پچاس سال سے میرا مرحوم سے نیاز مندانہ تعلق تھا۔۔۔رشتہ داری بھی تھی میرے والد قبلہ ظہور احمد صدیقی مرحوم کے وہ رشتے میں ماموں ہوتے تھے 1970 کے الیکشن میں مولانا محمد علی رضوی جمعیت علمائے پاکستان کے ٹکٹ پر حیدرآباد سے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے اس وقت میرے والد مرحوم J.U.P حیدرآباد کے ڈپٹی سیکریٹری اطلاعات تھے الیکشن کے فوراً بعد ہمارے گھر حیدرآباد کے تمام منتخب

اراکین پارلیمنٹ کے اعزاز میں پہلی تقریب منعقد ہوئی تھی اس میں مولانا محمد علی رضوی کے علاوہ صوبائی اسمبلی کے رکن منیر آرائین اور عثمان کنیڈی نے بھی شرکت کی تھی۔

مولانا محمد علی رضوی صاحب کردار انسان تھے۔۔۔۔۔سیاست کے آلودہ ماحول میں رہ کر بھی دامن پر کوئی داغ تو کجا شکن بھی پڑنے نہیں دی طویل عرصے سے بستر علالت پر تھے۔۔۔۔ان کے انتقال سے حیدر آباد کا ایک عہد ختم ہو گیا۔۔۔۔ پرانی روایتوں کے امین عشق مصطفیٰ ﷺ میں سرشار۔۔۔۔۔اسلامی اقدار پر کامل یقین۔۔۔۔۔اور پاکستان سے گہری محبت ان کی شناخت تھی۔۔۔۔۔خبر سن کر مجھے بہت دکھ ہوا اظہار عقیدت کے طور پر ان کا تذکرہ کرنا میرے لئے ضروری تھا اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا ہے کہ پروردگار ان کی مغفرت فرمائے

ہم جس جہاز پر سفر کر رہے تھے وہ کافی بڑا تھا تین حصوں پر مشتمل تھا اور سینکڑوں مسافر اس میں سوار تھے۔۔۔۔۔ہر سفر نامہ نگار ایئر ہوسٹس کا ذکر ضرور کرتا تھا۔۔مگر یہ اس زمانے کی بات جب خال خال لوگ سفر کرتے تھے اور عام آدمی نے تو ایئر ہوسٹس کا فوٹو بھی نہیں دیکھا تھا۔۔۔۔۔پاکستان میں ایئر ہوسٹس کو Romance کی صف میں مومی گل نے شامل کیا ۔۔۔۔PIA کے ہر اشتہار میں مومی گل کی تصویر شائع ہوا کرتی تھی دنیا کے جس جس شہر میں PIA کا دفتر ہوتا تھا اس میں ملک کی اہم تاریخی عمارات اور اہم شخصیات کے ساتھ مومی گل کی آدم قد تصویر موجود ہوتی تھی حج اور عمرے پر جانے والے زائرین کو جدہ کے علاقے بلد میں واقعہ PIA کے دفتر ضرور جانا ہوتا ہے اس دفتر میں بھی مومی گل کی تصویر لگی ہوئی تھی وہ اس قدر خوبصورت تھی کہ اگر حاجی حالت احرام میں بھی ہو تو مومی گل کو کن انکھیوں سے ضرور دیکھتا تھا مومی گل کو نہیں۔۔۔۔۔مومی گل کی تصویر کو۔۔۔۔وہ اگر خود سامنے موجود ہو اور کامل توجہ اور دلچسپی سے دیکھا جائے تو ممکن ہے کہ دم واجب ہو جائے۔۔ہم نے خود لندن، جدہ اور نیویارک میں PIA کے دفتر میں مسکراتی ہوئی مومی گل سے ملاقات کی سچ بات تو یہ ہے ک اس زمانے میں بہت سے لوگ PIA سے ہوائی سفر اس لئے کرتے تھے کہ شاید ان کی فلائٹ میں مومی گل موجود ہو اور وہ انہیں Serve کرے

جیسا کہ ہم نے پہلے ذکر کیا کہ اس زمانے سفر نامہ لکھنے والے اپنی کتاب کے ابتدائی صفحات میں ایئر ہوسٹس کا ذکر ضرور کرتے تھے ایئر ہوسٹس پر قلم اس طرح اٹھاتے جیسے کہ قلم نہیں

انگلی اٹھائی جا رہی ہے ۔۔۔۔۔PIA والے جب اپنے Air Crew کا یونیفارم ڈیزائن کراتے تھے تو ہفتوں اخبارات میں اس کا چرچا رہتا تھا سچ پوچھو تو وہی زمانہ تھا جب ہمارے ملک میں ڈریس ڈیزائننگ کی ابتدا ہوئی خیر اب تو یہ Profession بہت مقبول ہے ماضی میں سات گز کپڑے سے ڈریس ڈیزائین کیا جاتا تھا اب ایک میٹر کپڑے سے دو ماڈلز یا ایک فلمی ہیروئن کا لباس تیار کیا جاتا ہے اسٹیج کی رقاصاؤں کو ڈریس کی نہیں ۔۔۔۔۔صرف ڈیزائننگ کی ضرورت ہوتی ہے ۔۔۔۔یہی سبب ہے کہ ان کے ڈیزائنر سے قریبی تعلقات ہوتے ہیں ۔۔۔ڈریس سے نہیں ۔۔۔۔۔۔۔اس زمانے میں جہاز پر سفر کرنا Status Symbol سمجھا جاتا تھا بہت کم لوگ جہاز میں سفر کرنے کا تجربہ رکھتے تھے ہمارے ساتھیوں میں اگر کوئی جہاز میں سفر کرتا تو کئی روز تک PIA کا گرین ٹکٹ قمیض کی اوپری جیب میں اس طرح رکھتا تھا جس طرح ہری پگڑی والے مسواک رکھتے ہیں یہ اس زمانے کی بات جب عام آدمی کسی قریبی عزیز کے انتقال کی خبر پا کر ہوائی جہاز کا پہلی بار سفر کرتا تھا تا کہ وقت پر تدفین میں شریک ہو سکے مگر اب حالات بدل گئے ہیں ۔۔۔۔۔ہم نے ایئر ہوسٹس پر زیادہ توجہ نہیں دی ۔۔۔۔۔اس لئے کہ ملائیشیا ایئر لائنز کی ایئر ہوسٹس سرتاپا ملبوس تھیں سوانہیں کیا دیکھتے لیکن یورپین ہوائی کمپنیوں میں ایئر ہوسٹس ایسا لباس پہنتی ہیں کہ مسافر انہیں بار بار بلاتے ہیں یا انہیں آتے جاتے دیکھتے رہتے ہیں یوں سفر کٹ جاتا ہے مگر یہاں صورت حال مختلف تھی اکثر مسافر جہاز میں رکھے میگزین میں چھپے ہوئے اشتہارات دیکھ کر سفر کاٹ رہے تھے یا اونگھ رہے تھے یوں تو صورت شکل کے اعتبار سے PIA کی ایئر ہوسٹس کا بھی اب یہی حال ہے ذرا اور احتیاط کر لیں اور عمر رسیدہ ایئر ہوسٹس جنہیں Ground کر دیا گیا ہے انہیں Up grade کر کے دوبارہ فضائی عملے میں شامل کر لیں تو مسافروں کے اخلاق پر مثبت اثرات مرتب ہونگے رہی خسارے کی بات تو ہماری قومی ایئر لائن نے کب منافع کما کر دیا ہے ۔۔۔۔

ہوائی سفر شروع ہوا تو مسافروں کو پہلے مونگ پھلی کے پیکٹ دیئے گئے بڑی مشکل سے پیکٹ کھولا تو گنتی کے چند دانے برآمد ہوئے ۔۔۔۔۔ہم نے بیگم سے کہا دوسرا پیکٹ نہ کھولیں پیکٹ اس قدر دیدہ زیب اور مضبوط ہے کہ گھر جا کر بچوں کو گفٹ کر دیں گے تو وہ خوش ہو جائینگے ۔۔۔

کہنے لگیں بات تو ٹھیک ہے لیکن جب پیکٹ کھولیں گے تو بچوں میں ایک ایک دانہ بھی حصے

میں نہیں آئے گا بہتر ہے اس ''جھگڑے کی جھونپڑی'' کو یہیں ختم کر دیں

ایک گھنٹہ تک کھانا Serve کیا جاتا رہا۔ کھانا بہت لذیز تھا جوس، پڈنگ آئسکریم اور کافی سمیت بہت سے لوازمات شامل تھے۔ مگر ہم نے پانی مانگا تو مسکرا کے چلی گئیں۔ ہم نے ایئر ہوسٹس پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ اس لئے دوسری بار پانی کے لئے زحمت دینا گوارا نہ کیا۔ ممکن ہے نئے مسافروں کے لئے ایئر ہوسٹس اب بھی دلچسپی کی ''چیز'' ہو۔۔۔ جیسی ۳۵ سال پہلے ہمارے لئے ہوا کرتی تھی لیکن اب ایئر ہوسٹس کو بار بار دیکھنے کی خواہش نہیں رہی۔

شام کی پنیری، پر پانی کے کتنے ہی چھینٹیں مارے جائیں ان میں صبح کی سی تازگی اور ناز کی باقی نہیں رہتی۔

کھانا کھا کر اخبارات و میگزین کے صفحات الٹتے رہے۔۔۔۔۔ اور آنکھیں موند کر سونے کی ناکام کوشش کی۔۔۔۔۔ کرسی کی دو ہتھیوں کے بیچ بیٹھ کر جس قدر پہلو بدل سکتے تھے وہ بدلتے رہے۔۔۔ مگر نیند نہ آئی

جہاز پر بیٹھ کر ہم نے گھڑی دو گھنٹے آگے کر لی تھی۔۔۔ وقت کا تو اندازہ نہیں لیکن آدھا سفر گذرنے کے بعد ہم نے کھڑکی کا نقاب اوپر اٹھا کر دیکھا تو جہاز کے پر، پر پیلے تھال کی صورت چاند کھڑا تھا۔ ہمیں وہ اتنا ہی قریب محسوس ہوا جتنا جہاز کا پر۔۔۔ دیر تک ہم چاند میں چرغہ کاتنے والی بوڑھی اماں کو تلاش کرتے رہے مگر نظر نہ آئیں۔۔۔۔ ہمارے بچپن میں وہ بوڑھی تھیں اب تک تو اللہ کو پیاری ہو چکی ہونگی۔۔۔۔ بادل جہاز سے بہت نیچے تھے اور دیکھنے میں لگتا تھا کہ جیسے ہم برف اوڑھے ہوئے پہاڑوں کے اوپر سے گزر رہے ہیں۔۔۔۔ چاند کافی دیر تک جہاز کے پر کی منڈیر پر بیٹھا رہا۔۔۔ شاید گیارہ بارہ تاریخ کا چاند تھا۔۔۔۔ اتنے قریب سے چاند دیکھنے میں بڑا لطف آیا۔۔۔۔ اس چاند میں ہم نے ماضی کے نجانے کتنے چہرے تلاش کئے جن کے نام بھی یاد نہیں رہے اور صورتیں بھی اب دھندلا گئیں ہیں۔۔۔۔

موسم خراب تھا یا کراچی سے کولالمپور کی فضائی سڑک ناہموار ہے جہاز ہچکولے کھاتا رہا۔ کپتان بار بار مسافروں سے درخواست کرتا تھا کہ وہ سیٹ بیلٹ باندھے رہیں۔۔۔۔ اسی کیفیت میں بیٹھے بیٹھے تھک گئے تھے اس لئے Fresh ہونے کے لئے دائیں بائیں نشستوں کے کندھے پکڑے پکڑے ہم Toilet گئے۔ وہاں ملائے زبان میں لکھا تھا TANDAS اسی مقام تنہائی کو ہمارے علاقے میں ''سنڈاس'' کہا جاتا تھا۔ ملائیشیا پہونچے تو معلوم ہوا کہ اردو سے

ملتے جلتے بہت سے الفاظ ملائے زبان میں موجود ہیں اس کا تذکرہ ہم آگے چل کر کریں گے۔

اعلان ہوا کہ جہاز کوالالمپور کے بین الاقوامی ہوائی اڈے پر اترنے والا ہے تھوڑی دیر میں جہاز رن وے پر دوڑنے لگا۔ کپتان نے ہدایت کی کہ مسافر جہاز کے رکنے اور انجن کے بند کئے جانے تک اپنی نشستوں سے نہ اٹھیں مگر یہ اعلان صدا بصحرا ثابت ہوا۔ کالے، گورے، گندمی اور بھوری رنگت کے تمام مسافر ہی اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنا اپنا سامان اتارنے لگے۔۔۔۔ موبائل آن کر لئے گئے۔ اور بعض عجلت پسندوں نے تو اپنے عزیزوں سے فون پر بات کرنا شروع کر دی۔

ہم جہاز سے اتر کر۔۔۔۔۔۔ ٹیوب سے گزرے۔۔۔۔۔ یہاں جہاز سے اتر کر لاؤنج پہنچانے والی ٹیوب یا راہداری کی دیواریں شیشے کی ہیں اس لئے آپ رن وے کو دائیں بائیں اچھی طرح دیکھ سکتے ہیں۔ متعدد جہاز کھڑے تھے۔ ان میں ایک ایروایشیا کا جہاز بھی تھا۔۔۔ ہمیں اپنے دوست یعقوب تابانی یاد آ گئے لیکن غور سے دیکھا تو وہ Air Asia کا جہاز تھا جو ملائیشیا کی ایک مقامی ایئر کمپنی ہے۔۔۔۔ باہر لاؤنج میں آئے۔۔۔۔۔ مسافروں کے ساتھ ہم بھی چلتے رہے۔ دائیں بائیں۔۔۔۔ ایک عجب حیرت کدہ ایک عجب آئینہ خانہ۔۔۔۔ شیشے کی دیواریں۔۔۔۔ دیواروں کے اس پار سرسبز و شاداب درخت۔۔۔۔ درختوں کی دھلی شاخیں۔۔۔۔ شاخوں پر نہائے ہوئے پتے۔۔۔۔ ہرے رنگ کے جس قدر شیڈز ہمارے تصور میں آ سکتے تھے وہ یہاں موجود تھے۔۔۔۔

طویل راستے کے دائیں بائیں شورومز۔۔۔۔ کافی شاپس۔۔۔۔ ایئرپورٹ کتنا پھیلا ہوا ہے۔۔۔۔ کتنا وسیع ہے۔۔۔۔ اس کے کتنے حصے ہیں۔۔۔۔ ہمیں نہیں معلوم۔۔۔ ہم نابیناؤں کی طرح ہاتھی کے ایک حصہ کو محسوس کر رہے تھے۔۔۔۔ حیرت زدہ تھے۔۔ امریکہ یا کسی اور مغربی ملک کے ہوائی اڈے پر اترتے تو شاید اتنا تعجب نہ ہوتا۔۔ مگر ملائیشیا۔۔۔۔۔ جسے ہم نے جغرافیہ۔۔۔۔۔ کی کتاب میں ملایا پڑھا تھا۔ ایک چھوٹا سا ملک۔۔۔۔ ہم سے دس سال بعد یعنی ۳۱ اگست ۱۹۵۷ء کو آزاد ہوا تھا۔ سچ پوچھو تو کوالالمپور کا نام بھی اذلان شاہ ہاکی ٹورنامنٹ کے حوالے سے زیادہ سنا تھا۔۔۔ کوئی دوست کوئی عزیز کوئی واقف کار بھی وہاں نہیں رہتا جن کی وجہ سے ملائیشیا کے بارے میں کچھ معلومات ہوتیں۔ بس ایک بار فرحان الرحمٰن نے ملائیشیا کا ذکر کیا تھا۔

اپنا اٹیچی کیس گھسیٹے گھسیٹے ہم دیگر مسافروں کے ساتھ اجنبی راہداریوں پر چلتے رہے۔ آس پاس کے مناظر دیکھ کر آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ چلتے چلتے ترنگی جگہ پہ پہنچے۔۔۔۔ بہت بڑا شیشے کا

دائرہ ۔۔۔۔کمہار کے چاک پر رکھے ادھ ڈھلے برتن کی طرح ۔۔۔۔۔۔اوپر جا کر کشادہ دائرہ ،تنگ ہوگیا۔۔۔اس کے اندر سینکڑوں درخت۔چھوٹے بڑے ۔۔۔اور تمام کے تمام ۔۔۔۔سرسبز وشاداب ، دھلے دھلائے ۔۔۔ایک پتا بھی بیمار یا پیلا نہیں ۔۔۔۔شاید مصنوعی ہوں،ہم نے خیال کیا۔۔

چاروں طرف ہوٹلیں ۔۔۔۔کافی شاپس ۔۔۔۔Tuck Shops ۔۔۔اس جگہ لوگوں کا اژدھام تھا۔۔۔دائیں بائیں الگ الگ خوبصورت راہداریاں،کہاں جائیں،کس طرف جائیں۔۔۔کس سے پوچھیں ۔۔۔۔کہ اسی دوران ایک پاکستانی خدوخال کا نوجوان نظر آیا۔۔۔اس کے قریب پہونچ کر انگریزی میں بات شروع کی۔۔۔مسکرا کر کہنے لگا۔۔۔میں پاکستانی ہوں۔۔۔اردو میں بات کریں۔۔۔۔۔ہم شرمندہ ہوئے ۔۔۔۔پھر خوش ہوئے ۔۔۔۔چلو پردیس میں اپنا کوئی ملا۔۔۔۔پاسپورٹ اور ٹکٹ آگے کر دیئے اور پوچھا بھائی ہم کیا کریں۔۔۔۔ہمیں ۔۔۔تھوڑی دیر میں لنکاوی کی فلائٹ پکڑنی ہے۔

کہنے لگا آپ میرے ساتھ آئیں ۔۔۔۔ہم نے محسوس کیا کہ وہ کسی VIP فیملی کو Receive کرنے آیا ہے۔۔۔۔نثار نام تھا۔ہم سامان گھسیٹے نثار کے پیچھے پیچھے چلتے رہے وہ جہاں رکے۔ہم بھی ٹھہر گئے ۔۔۔کہنے لگے یہاں سے ٹرین میں بیٹھ کر دوسرے Terminal جانا ہوگا جہاں سے آپ کو لنکاوی جانے کی فلائٹ ملے گی۔

ہمارے سامنے ڈور سلائیڈز کی ایک دیوار تھی۔بہت سے مسافر کھڑے تھے۔۔ٹرین کے تصور سے جو عام پلیٹ فارم ذہن میں آتا ہے یہ اس سے مختلف تھا۔۔۔۔کچھ دیر میں آواز سنائی دی جیسے ٹرین آرہی ہے مگر وہ ہمیں نظر نہیں آئی اچانک ہمارے سامنے کی دیوار میں لگے Slider لفٹ کے دروازوں کی طرح کھلے۔۔اور ہمارے سامنے ٹرین کھڑی تھی ۔۔۔اس ٹرین میں سے ہم دوسرے پلیٹ فارم کے منظر کو بھی دیکھ سکتے تھے کہ اس ٹرین کے دونوں طرف دروازے کھلتے تھے جو Lift کے دروازوں سے کہیں زیادہ بڑے اور کشادہ تھے۔

ہم ٹرین میں بیٹھ گئے ۔۔۔۔ہم اس سے پہلے امریکہ کے ایک ایئرپورٹ پر ایسی ہی ٹرین میں سفر کر چکے تھے بیٹھنے کے لئے نشستیں کم تھیں البتہ سہارے کے لئے ہینگرز لٹکے ہوئے تھے۔۔۔بیگم کو بیٹھنے کے لئے نشست مل گئی ہم ہینگر پکڑ کر کھڑے ہوگئے ۔۔دروازے ایک

نامحسوس آواز کے ساتھ حرکت کرتے ہوئے آپس میں جڑے۔۔۔اور معمولی جھٹکے کے بعد ٹرین چل پڑی۔۔۔زرا دیر بعد ہم کھلی فضاء میں آ گئے۔۔۔باہر کا منظر قابل دید تھا گویہ ایئر پورٹ کا ہی حصہ تھا۔۔۔زمین پر سبزہ اور رن وے کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔۔۔بہت سے جہاز کھڑے تھے۔۔۔تین چار منٹ کے بعد ہم پھر ٹرین میں آ گئے یعنی باہر کا منظر اوجھل ہو گیا۔۔۔رفتار دھیمی ہوئی۔۔۔پھر ٹرین رک گئی۔۔۔دروازے کھل گئے۔۔۔اب ہم دوسرے ٹرمینل میں پہونچ گئے۔۔۔امیگریشن۔۔۔کسٹم اور سیکیورٹی کے مراحل ابھی باقی تھے۔

نثار صاحب نے ہمیں بتایا کہ آپ سامنے سے امیگریشن کرائیں اس کے بعد A-7 گیٹ سے آگے کسی سے پوچھ لیجئے گا تو وہ آپ کو لنکاوی جانے والی فلائٹ کی جگہ بتا دیگا۔۔۔ہم نے نثار میاں کا شکریہ ادا کیا۔۔۔سچ بات یہ ہے کہ انہوں نے ہماری بڑی رہنمائی کی۔۔۔اب ہم Immigration کاؤنٹر پر گئے۔

دو تین مسافروں کے بعد ہماری باری آ گئی ایک انجانا خوف۔۔پاسپورٹ اور ٹکٹ ہاتھ میں۔۔۔سامان ایک طرف رکھا۔۔۔کاؤنٹر پر موجود نوجوان مسکراتی خاتون کے سامنے خود کو پیش کر دیا۔آنکھوں کے سامنے اخبارات کی وہ ساری خبریں تیزی کے ساتھ گردش کرنے لگیں جن میں لکھا ہوتا ہے کہ فلاں ایئر پورٹ سے اتنے پاکستانی۔۔۔جعلی ویزہ رکھنے کی وجہ سے گرفتار کر لئے گئے یا D.port کر دیئے گئے۔۔۔خاتون نے اطمینان سے ہمارے پاسپورٹ اپنے کمپیوٹر میں چیک کئے۔۔۔غور سے ہمیں دیکھا۔۔۔مسکرائیں۔۔۔شاید ہمارا حلیہ دیکھ کر۔۔۔اور Thank you کہہ کر بیگم کی طرف دیکھا۔۔۔ایک منٹ بعد انہوں نے ٹھپے لگا کر کہا۔۔۔Well come to Malayasia۔۔۔حیرت اور خوشی کے ملے جلے جذبات سے سرشار ذرا آگے بڑھے یہاں کسٹم والوں نے مسکرا کر دیکھا اور آگے جانے کا اشارہ کر دیا۔۔۔اب سیکیورٹی کا خوف لاحق تھا۔۔۔اپنے شہر میں تو خود پذیرائی ہوتی تھی۔۔۔یہاں دیکھیں کہ کیا ہوتا ہے۔۔۔کسی مسافر سے اگلی منزل کے بارے میں پوچھا۔۔۔ان کی ہدایت کے مطابق ہم خود کار زینہ سے نیچے اترے۔۔۔ایئر پورٹ کا ایک بارونق حصہ ہم چھوڑ آئے۔۔۔اب ہمارے دائیں بائیں دکانیں تھیں۔۔۔ چاء اور کافی کی شاپس تھیں۔۔۔کہیں کہیں دفاتر تھے۔۔۔ہم سامان گھسیٹے ہوئے ایک طویل راہداری پر

چلتے رہے بالآخر وہ گیٹ آ گیا جہاں سے ہمیں لنکاوی کے لئے جہاز میں بیٹھنا تھا۔۔۔ہم نے اندر داخل ہونے کی کوشش کی تو مسکراتی ہوئی ملائی نے میرا مطلب ہے ملائیشین ایئرپورٹ کی ایک اہل کار نے ہمیں اندر آنے سے منع کیا اور کہا کہ ایک گھنٹے بعد آپ اندر آسکیں گے۔۔۔راہداری کے دونوں جانب آرام دہ نشستیں تھیں۔۔۔چند مسافر اور تھے۔۔۔ہم نے سامان رکھا ۔۔۔ذرا سکون کا سانس لیا تو سگریٹ کی طلب محسوس ہوئی۔ہم نے بیگم کو تجویز دی کہ کچھ پہلے جو ایک ریستوران ہم چھوڑ آئے ہیں وہاں بیٹھ کر کافی پیتے ہیں۔۔۔بلکہ ناشتہ کر لیتے ہیں۔۔۔مقامی وقت کے مطابق شاید صبح کے ساڑھے نو بج رہے تھے۔۔۔۔بیگم نے کہا کہ آرام سے بیٹھیں۔۔۔یہ کہکر اپنے بیگ سے بسکٹ کا ڈبہ نکالا۔۔۔پھر ایک پلاسٹک کی تھیلی سے اپنے ہاتھوں کی پکائی ہوئی ٹکیاں نکالیں اور کہا ناشتہ میں کرا دیتی ہوں۔۔۔کافی آپ پلا دیجئے گا۔۔۔ہم نے بسکٹ اور ٹکیاں کھائیں۔۔۔مزہ آ گیا۔۔۔کافی کا تو بہانہ تھا۔۔۔دراصل ہمیں سگریٹ کی طلب محسوس ہو رہی تھی۔۔۔یا یوں سمجھ لیجئے کہ۔۔۔بے تکلفانہ زبان میں ''نشہ ٹوٹ رہا تھا''۔سات گھنٹے گذر چکے تھے۔۔۔بیگم سے کافی پینے کا کہا تو کہنے لگیں کہ میں نے گزرتے ہوئے ریستوران کی دیوار پر لٹکے ہوئے Rate Card کو پڑھ لیا تھا۔۔۔پانچ رنگٹ۔۔۔یعنی تقریباً سوا سو روپے۔۔۔کسی عمدہ ریستوران میں فرصت سے بیٹھ کر کافی پینے میں کوئی حرج نہیں مگر سارا سامان گھسیٹتے ہوئے جائیں اور کھڑے کھڑے کافی پی کر واپس چلے آئیں یہ مجھے گوارا نہیں۔۔۔

آپ بیٹھیں۔۔میں ذرا چکر لگا کر آتا ہوں۔۔۔یہ کہہ کر میں واپس پلٹا۔۔۔اور کئی لوگوں سے Smoking Room کے بارے میں پوچھا۔۔۔بالآخر ایک ہم مشرب نے بتایا کہ B-11 کے قریب ایک کمرہ ہے۔۔۔وہاں آپ چھپ کر سگریٹ پی سکتے ہیں B-11 تک پہونچنے میں ہمیں کافی وقت لگا۔۔۔اس جگہ سے ہم گذر چکے تھے۔۔راہداری بہت کشادہ۔۔۔بلند و بالا شیشوں کی دیواریں۔۔۔اس کے پار سرسبز و شاداب درخت۔۔۔ان کے دامن میں تراشے ہوئے پودے۔۔۔بے حد خوبصورت جہازی سائز کے گملے۔۔۔آپ اندر سے۔۔۔باہر کا منظر دیکھ سکتے ہیں۔۔۔بالآخر ہم مطلوبہ کمرے تک پہنچ گئے۔شیشے کا دروازہ مگر Tinted آپ کو اندازہ نہیں ہوتا کہ اس کمرہ میں کیا کاروائی ہو رہی ہے۔۔۔اندر گئے تو بڑا سا کمرہ بہت آرام دہ اسٹیل کی خوبصورت ڈیزائن کی ہوئیں کرسیاں۔۔۔ستون سے

ملحق میز نما مضبوط تختے۔۔۔دیوار کے ساتھ ساتھ بڑے بڑے راکھدان۔۔۔اور سامنے پڑی میزوں پر اچھوتے ایش ٹرے۔۔۔کمرے میں دھواں۔۔۔سگریٹ اور کافی کی ملی جلی پسندیدہ خوشبوئیں۔۔۔وہی منظر تھا جو کراچی کے ڈیپارچر لاؤنج میں سگریٹ پینے کیلئے مخصوص کمرہ میں تھا۔۔۔فرق اتنا تھا کہ میرے سوا سب غیر ملکی تھے۔۔۔ان کے برانڈز بھی مختلف تھے۔۔۔خالی پیکٹوں کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ بہت سے برانڈ پاکستان میں استعمال ہوتے ہیں۔۔۔ہم نے ایک خالی نشست پر بیٹھ کر سگریٹ جلائی۔۔۔۔دیوار کے پیچھے شیشے سے باہر مڑ کر دیکھا۔۔۔عجیب جنت نظیر منظر۔۔۔اونچے اونچے شاداب درخت۔۔۔ہم غالباً دوسری منزل پر تھے کہ درختوں کی شاخیں بلند ہو کر بھی ہم سے نیچے تھیں اور ہوا کے دوش پر جھوم رہی تھیں۔۔۔درمیان میں صاف ستھری سڑک۔۔۔جس پر ایئر پورٹ کی اکا دکا گاڑیاں۔۔۔۔۔۔۔چل رہی تھیں۔

ایک سگریٹ پی لی۔۔۔طبیعت سیر نہ ہوئی۔۔۔آدھے سے زیادہ لوگ کافی پی رہے تھے۔۔۔ہم باہر نکلے۔۔۔۔سامنے ایک خوبصورت کیفے۔۔۔بہت سی میزیں اور کرسیاں مگر اکثر خالی پڑی تھیں۔۔۔کاؤنٹر پر گئے Fast food کے علاوہ کافی اور چائے بھی تھی ہم نے 90ء5 رنگٹ میں کافی لی۔۔۔واپس سگریٹ نوشی کے کمرے میں آئے۔۔۔یہاں سگریٹ پینے والوں میں خواتین کے علاوہ ایئر پورٹ کے ملازمین کی تعداد زیادہ تھی کیونکہ ان کے گلے میں ان کے Identity cards لٹکے ہوئے تھے۔

میں بیگم کے پاس آیا۔۔۔دس بجے بورڈنگ شروع ہوئی۔۔۔ہم جہاز پر آئے۔۔۔۔چھوٹا جہاز تھا۔۔۔مگر نشستیں پر تھیں۔۔۔ہم نے ملائیشیا کے اخبارات پر نظر ڈالی۔ پہلے صفحہ پر حکومت اور حزب مخالف کے درمیان اختلافات کی خبریں زیادہ تھیں۔''ائیر کرو'' نے جہاز کی روانگی سے پہلے ''مونگ پھلی کی پڑیا'' پیش کی۔۔۔پھر اورنج جوس۔۔۔بہت سے مسافر ممنوعہ ماکولات سے شغل کر رہے تھے۔۔۔۔۔

Langkawi لنکاوی

تقریباً سوا بارہ بجے دوپہر جہاز سے اتر کر لنکاوی ایئر پورٹ پہنچ گئے۔چھوٹا ایئرپورٹ۔۔۔سامان ہمارے ساتھ تھا اس لئے ہم Luggage لینے کے لئے نہیں رکے۔۔۔چند منٹ تک ایک راہداری پر چلتے رہے۔نہ ہمیں کسی نے روکا۔۔۔اور نہ ہی ہم نے باہر نکلنے کا دروازہ کسی سے پوچھا اب تک ہم میں خاصا اعتماد آچکا تھا۔۔۔گمان تھا کہ شاید اس آخری مرحلے پر سامان کی چیکنگ ہو مگر ہم دیگر مسافروں کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔گیٹ کے ساتھ بہت سے لوگ مسافروں کے ناموں کی تختی لئے کھڑے تھے۔۔۔ہمارا نام بھی ایک کارڈ پر جلی حروف میں لکھا تھا۔اطمینان بھی ہوا اور خوشی بھی۔۔۔خوشی اس لئے کہ اس اجنبی جگہ پر کوئی ہماری پذیرائی کے لئے موجود تھا۔۔۔ہم اپنے میزبان کے قریب گئے۔

تعارفی کلمات کے بعد ڈرائیور نے ہمارا سامان اٹھایا اور اپنے پیچھے آنے کو کہا۔۔۔سڑک پار کر کے چند قدم چلے تھے کہ سامنے ایک کوسٹر کھڑی تھی۔۔۔۔آرام دہ اور ٹھنڈی۔۔۔ہم دونوں گاڑی میں بیٹھے۔گاڑی روانہ ہوئی اور ہم نے ڈائیور سے لنکاوی کے بارے میں معلومات حاصل کرنا شروع کی۔۔

Langkawi کو انگریزی میں لکھیں تو اس میں G۔خاموش ہے۔۔۔بول چال میں لنکاوی کہتے ہیں۔گیارہ کلومیٹر دور ہمارا ہوٹل Holiday Villa ہے۔راستہ بے حد خوبصورت دائیں بائیں ۔۔۔آگے پیچھے ۔۔۔پہاڑ اور سبزہ۔۔۔درخت اور صاف ستھری رواں سڑک۔۔۔سڑک کے دونوں طرف ، وقفہ وقفہ سے تین چار منزلہ چھوٹی چھوٹی عمارتیں۔۔۔چند میل کے بعد ایک بارونق جگہ آئی۔۔۔یہ ایک چوراہا بھی ہے۔۔۔یہاں سیاحوں کی بھیڑ نظر آئی۔۔۔دکانیں۔۔۔چھوٹے اسٹورز۔۔۔منی مارٹ۔۔۔چھوٹی چھوٹی قطار اندر قطار ہوٹلیں۔۔۔سڑک کنارے ۔۔۔فٹ پاتھ کے ساتھ ساتھ میز کرسیاں لگی ہوئیں۔۔۔ہر ہوٹل کی اپنی اپنی حدود۔۔۔ہر ہوٹل کی الگ طرز کی میز کرسیاں۔۔۔تین چار بڑی ہوٹلیں بھی نظر سے گذریں۔۔۔''ہوٹل سائبان'' کی عمارت پسند آئی۔۔۔خاصی بڑی

ہوٹل تھی۔۔۔۔اس سے تقریباً ڈیڑھ کلومیٹر کے بعد ہماری منزل آ گئی۔

گاڑی سے اتر کر اطراف میں نظر ڈالی تو طبیعت خوش ہوگئی۔۔۔۔سبزہ زار۔۔۔۔سامنے سڑک کے کنارے فراز کی طرف بلند ہوتے پہاڑ۔۔۔۔۔پہاڑوں پر ایک دوسرے سے جڑے ہوئے درخت۔۔۔۔درختوں کے تنوں کے ساتھ زمین پر خود رو شاخیں۔۔۔۔۔۔۔۔ پھول۔۔۔۔سبزہ۔۔۔گاڑی جہاں پارک کی وہاں ایک چھوٹا سا تالاب تھا

تالاب میں ایک فٹ سے ذرا چھوٹی بہت سی سرخ رنگ کی چمکدار مچلتی اور تیرتی مچھلیاں ۔۔۔۔۔سامان اتار کر رکھ دیا گیا۔۔۔۔ڈرائیور نے صبح نو بجے سٹی ٹور پر جانے کے لئے تیار رہنے کی ہدایت کی اور چلا گیا۔استقبالیہ کاؤنٹر پر پہونچے۔۔۔۔تین چار خواتین مصروف تھیں۔چند منٹ انتظار کے بعد ہمارا نمبر آیا۔۔۔کاغذات دیکھ کر ایک پلاسٹک کور فائل نکالی۔۔۔ہمارے بارے میں ساری تفصیلات ان کے پاس موجود تھیں۔خاتون نے مسکرا کر استقبال کیا۔۔۔۔ ہمارا خط دیکھا ایک فارم پر کیا۔پاسپورٹ نمبر کے ساتھ ضروری کوائف درج کئے۔اور کمرے کی چابی ہمارے سپرد کر دی۔

اس کے بعد کہا۔۔۔صبح ناشتہ کے لئے یہ دو Vouchers ہیں۔7:30 سے 10:30 بجے تک۔۔۔۔ناشتہ کے لئے۔۔۔آجایئے۔۔۔ہم جانے کے لئے مڑے ہی تھے کہ ایک خاتون مسکراتی ہوئی آئیں اور کہنے لگیں۔۔۔Just a minute۔۔۔۔اس کے بعد مزید آنے والے دو دنوں کے لئے دو۔۔۔دو۔۔۔۔واؤچر زاور دیئے۔۔۔۔شام کی Drinks کے لئے۔پھر انہوں نے فون پر کسی کو بلایا۔۔۔۔ہم رکے رہے۔۔۔۔ذرا دیر بعد ایک Porter آیا اور سامان ٹرالی میں رکھ کر چل دیا، ہم اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے

اوپر نیچے دائیں بائیں۔۔۔دیکھتے ہوئے ایک منٹ میں ہم اپنے کمرہ نمبر۔۔۔۔پر پہونچ گئے۔۔۔Porter نے ہم سے چابیاں لیکر اجازت چاہی اور دروازہ کھولا۔۔۔۔

ہم کمرہ میں داخل ہوئے، صاف ستھرا کشادہ کمرہ، طبیعت خوش ہوگئی۔۔۔۔پہلے صوفے پر بیٹھ گئے بلکہ دھنس گئے۔پوری رات اور آدھ دن سفر میں گذرا۔۔۔۔یقیناً تھک گئے تھے۔۔۔۔جوتے موزے اتارے سامنے میز پر پیر پھیلا دیئے۔

بیگم نے کمرہ کا جائزہ لیا۔ باتھ روم کھول کر دیکھا۔ رائٹنگ ٹیبل کے ساتھ والی میز کھولی۔۔۔۔Mini Fridge رکھا اس میں Cold drinks کے ٹن تھے۔اس کے برابر

دروازہ کھولا Iron Catle موجود تھی۔۔۔بیگم خوش ہوگئیں۔۔۔مسرت بھابی نے اپنے کالم میں صحیح لکھا تھا۔ یہاں کیتلی موجود ہے۔ میں سب سے پہلے چائے بناتی ہوں۔۔۔ہماری بیگم کراچی سے Tea bags اور خشک دودھ لیکر آئیں تھیں۔

تم نے میرے دل کی بات کی چائے کی شدید طلب محسوس ہورہی ہے میں خود ابھی فون کر کے چائے منگوانے والا تھا۔

بیگم چائے بنانے میں مصروف ہوگئیں۔۔۔چاء پی کر بستر پر لیٹ گئے پھر آنکھ لگ گئی ۔۔۔دو گھنٹے بعد بیگم نے اٹھایا۔۔۔۔اور کہا جلدی تیار ہو جائیں مجھے اپنے سیل فون کے لئے SIM خریدنی ہے۔

یار ایسی کیا جلدی ہے آپ نے بیٹے سے بات کرلی۔۔۔وہ سب کو اطلاع کردے گا کہ ہم خیریت سے پہونچ گئے ہیں

کہاں بات ہوئی! وہ تو بس اپنے پہنچنے کی اطلاع دی ہے میں SIM خرید لوں تو اپنا نمبر انہیں دے دونگی تا کہ سب بچے ہم سے بات کرسکیں یہاں تو Call Rates بہت زیادہ ہیں آپ کو پتہ ہے کہ میں نے مشکل سے ایک دو منٹ بات کی ہوگی اور ہوٹل والوں نے تقریباً سوا سو روپے لے لئے۔

میں نے بیگم سے کہا دیکھو بھئی اب تم یہاں آکر ''رنگٹ'' کو پاکستانی روپوں میں منتقل نہ کرو ورنہ سفر کا سارا مزہ کرکرا ہو جائے گا۔

وہ تو ٹھیک ہے لیکن رنگٹ کی صورت میں ہم اپنی ہی کرنسی خرچ کررہے ہیں ناں۔۔۔بہر حال اب آپ اٹھ جائیں۔۔۔۔اسی طرح چلتے ہیں Change کریں گے تو رات ہو جائے گی

ہم نے منہ پر پانی کا چھپا کا مارا صاف دھلے ہوئے تولیے سے چہرہ صاف کیا۔۔۔اور کمرہ کا دروازہ بند کر کے باہر نکل آئے۔ جانے کیوں ہمیں سید احمد یوسف یاد آگئے۔۔۔۔بلا کے سادگی پسند تھے دس بار صوبائی وزیر بنے۔۔۔ہر روز، دفتر سے اٹھتے وقت وہ واش روم جاتے۔۔۔منہ پر پانی کا چھپا کا مارتے اور اکثر قمیض کے دامن سے منہ خشک کرتے اور تقریب میں شرکت کے لئے روانہ ہوجاتے۔۔۔کئی برس ہوئے زمین اوڑھ کر سو گئے۔۔۔اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے

ہوٹل سے باہر نکلے عمارت کے صدر دروازے پر کھڑے ہوکر سامنے کے مناظر پر نگاہ ڈالی ہمارے تینوں طرف اونچی پہاڑیوں پر ایستادہ گھنے اور سبز درختوں کی چوٹیوں سے لے کر ڈھلواں فرش تک سبزہ ہی سبزہ ۔۔۔نہ مٹی نظر آئی اور نہ ہی درختوں کے درمیان خلا نظر آیا عجیب منظر تھا۔۔۔کسی ماہر مصور کی کینوس پر بنائی ہوئی Land Scape کی حسین تصویر۔۔۔فراز سے نشیب تک ہریالی ہی ہریالی۔۔اس کے بعد فٹ پاتھ اور پھر بل کھاتی ہوئی سڑک اتنی صاف کہ جی چاہا کہ ہاتھ پھیر کر دیکھیں کہ اس پر گرد ہے کہ نہیں ۔۔۔۔۔ہمارے یہاں شمالی علاقہ جات اور گلیات میں اونچے اونچے درخت اور درختوں کے درمیان ذرا ذرا فاصلہ بھی ہے۔۔۔ یہاں درخت زیادہ اونچے نہیں ہیں لیکن گھنے بہت ہیں اور ایک دوسرے سے ایسے جڑے ہوئے ہیں کہ جیسے شب عروسی کے وقت دلہا دلہن۔۔۔ ان کے درمیان ہوا کا گزرنا بھی محال ۔۔۔۔سورج کی کرنیں درختوں کی چوٹیوں پر دھیمے دھیمے لہراتی ہوئیں شاخوں۔۔۔۔۔اور ان کے پتوں کو چوم سکتی ہیں لیکن اپنے اجالوں کے ساتھ درختوں کے قدموں کو بوسہ نہیں دے سکتیں ۔۔۔۔۔سبز رنگ کے کتنے Shades دکانِ قدرت میں سجے ہیں اس کا اندازہ بھلا کون لگا سکتا ہے۔

ہوٹل کی عمارت کے مرکزی دروازے سے ہوٹل کے بیرونی دروازے تک خاصا فاصلہ ہے ۔۔دائیں بائیں بہت کشادگی ہے۔۔۔ایک جانب کئی ٹینس کورٹس بنے ہوئے ہیں۔۔۔۔ اور دوسری جانب عمارت ہی کا ایک اور حصہ ہے آنے جانے کے لئے مضبوط اور رواں سڑک ۔۔۔بس وہی سیاہ رنگ کی ہے باقی ہر طرف سبزہ ہی سبزہ ۔۔۔۔ایک خاص ترتیب سے Palm کے درختوں کی بل کھاتی ہوئی قطاریں۔۔۔ سنا ہے ملائیشیا میں ہر طرف Palm Trees پھیلے ہوئے ہیں کبھی تو یہ ملک دنیا میں سب سے زیادہ Palm oil پیدا کرتا تھا ۔۔۔قدرت مہربان ہے لیکن یہاں کی حکومت اور عوام نے کفران نعمت نہیں کیا بلکہ شکران نعمت کو اپنا مقصد حیات بنالیا۔۔۔

شام کے ابتدائی لمحات میں دھوپ ذرا شرمائی شرمائی سی ۔۔۔لطف و سرور پہنچانے والی دھوپ کا آنچل کبھی کبھی ڈھلک جاتا تو سرمئی رنگ کے بادل درختوں کے شانوں پر بکھر جاتے اور محسوس ہوتا جیسے پہاڑوں نے سرمئی بادلوں کی اوڑھنی میں اپنا آپ چھپالیا ہے۔۔۔عام طور پر اس قسم کے ماحول میں موسم ٹھنڈا ہوتا ہے یہاں قدرت کے اس لطف و کرم کی کمی

ہے۔۔۔۔بارہ مہینے ایک سا موسم رہتا ہے تھوڑا تھوڑا ناراض ناراض سا۔۔۔آپ ابتدائی شام میں بھی ہلکی ہلکی گرمی محسوس کریں گے بس ہمارے ساتھ یہی دھوکہ ہوا۔۔

کراچی سے روانگی ۔۔۔۔۔پھر کوالالمپور آمد۔۔۔۔۔ائیر پورٹ پر عارضی قیام ۔۔۔۔۔پھر لنکاوی کے لئے جہاز کا سفر باہر نکلے تو ایئر کنڈیشن گاڑی میں بیٹھ گئے۔۔۔۔ اس سے اترے تو ہوٹل کے یخ بستہ ماحول میں آ گئے محسوس ہو رہا تھا جیسے نومبر کا موسم ہے تین چار گھنٹے ہوٹل کے کمرے میں رہے تو کمبل میں دبکے رہے ہوٹل سے باہر نکلے تو بیگم نے کہا کہ میں تو جرسی لے رہی ہوں آپ بھی سوئیٹر پہن لیں۔۔۔۔بات ہماری سمجھ میں آئی ہم نے قمیض کے اندر پرانا سوئیٹر پہن لیا۔۔۔اس کو پہن کر ڈھیلی جینز ذرا فٹ محسوس ہوئی اور ہم SIM خریدنے کے ارادے سے باہر نکل آئے۔۔۔۔۔ابھی ہم ہوٹل سے ذرا آگے بڑھے تو متوقع موسم کی رنگینی ۔۔۔سنگینی میں بدل گئی۔۔۔۔۔بیگم تو اپنی جرسی واپس جا کر کاؤنٹر پر چھوڑ آئیں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اب ہم کیا کرتے۔۔۔۔۔دوبارہ کمرے میں جا کر لباس تبدیل کرنے کا ارداہ ترک کیا اور آگے بڑھتے رہے سامنے بل کھاتی ہوئی سڑک۔۔۔۔سڑک کے کنارے خوبصورت اور مضبوط فٹ پاتھ، فٹ پاتھ کے ساتھ پہاڑوں سے اترنے والی پکی نالیاں۔۔۔۔اور اس کے بعد سبزہ ہی سبزہ ہم دونوں پیدل چلتے رہے کسی نے بتایا تھا کہ ایک فرلانگ کے بعد ایک Mini Mart ہے وہاں سے موبائل کے لئے نئی SIM مل جائے گی۔

عام زندگی میں تو ہم واک نہیں کرتے لیکن پیدل چلنے کے ہم دونوں شوقین ہیں۔۔۔۔ 1987 میں ہم نے تقریباً سارا پیرس پیدل چل کر دیکھا تھا دریائے سین کے کنارے میلوں پیدل چلے تھے۔۔۔خیر اس وقت مسافر جوان تھے۔۔۔۔بفضل تعالی اب بھی پیدل چلنے میں الجھن نہیں ہوتی آس پاس کا لطف لیتے ہوئے ہم ناک کی سیدھ میں چلتے رہے۔۔۔۔۔سڑک ویران تو نہیں تھی مگر اکا دکا گاڑیاں آ جا رہی تھیں اسکوٹر کی آمد و رفت زیادہ تھی۔۔۔۔۔یہاں خواتین کثرت سے اسکوٹر چلاتی ہیں۔۔۔یہاں ہیلمٹ کا استعمال ضروری ہے ڈرائیور کے ساتھ ساتھ سواری کے لئے بھی۔۔۔پتہ نہیں چلتا کہ دونوں میں طالب و مطلوب یا محبوب و محبّ کون ہے کیونکہ نوجوانوں کا لباس تقریباً ایک جیسا ہی ہوتا ہے۔۔۔۔۔یعنی جینز اور Upper ۔۔۔۔۔مرد ہوں یا خواتین، قوانین پر عملدرآمد سخت ہے کاریں اور اسکوٹر کرائے پر بھی دستیاب ہیں۔۔۔سڑک کے دونوں کنارے ہوٹلوں کی قطاریں۔۔۔چھوٹی چھوٹی ہوٹلیں ان کے سامنے

میز کرسیاں ان میں سے کم کم رہائشی ہوٹلیں تھیں بیشتر ہوٹلوں کے باہر Sea food کے بورڈ لگے ہوئے تھے۔۔۔۔۔درختوں اور پھولوں کی کیاریوں سے سجی تمام عمارتوں کی چھتیں تیر کے نشان کی طرح جھگی کی مانند۔۔۔۔سرخ اینٹوں کی بنی ہوئی تھیں۔۔۔۔چونکہ یہاں بارش بہت ہوتی ہے اس لئے پورے ملک میں یہی طرز تعمیر رائج ہے۔۔۔۔ہمارے یہاں ملکہ کوہسار کی طرح۔۔مگر یہ پرانی بات ہے اب مری کا مال روڈ۔۔۔۔زیب النساء اسٹریٹ یا انارکلی بازار لگتا ہے۔۔۔۔۔ ہم نے ملکہ کوہسار کو اس وقت دیکھا تھا جب وہاں مال روڈ کی ہوٹلوں کی چھتیں اسی طرح سرخ اینٹوں سے بنائی جاتی تھیں شام ہوتے ہی چھتوں کی چمنیوں سے دودھیا دھواں رقص کرتا ہوا بادلوں سے گلے ملتا تھا۔۔۔۔کبھی بادل اپنا آپ بھول جاتے کبھی دھواں بادلوں میں گم ہو کر اپنی شناخت کھو بیٹھتا۔۔۔۔۔۔اب مری کی ہوٹلوں کے کمروں سے آتش دان بھی ہٹا دیئے گئے ان کی جگہ بجلی کے ہیٹر آ گئے تھے اور اب سنا ہے کہ گیس کے ہیٹر استعمال ہوتے ہیں۔۔۔گیس کے ہیٹر سے سہولت میسر آ گئی مگر آتش دان کا رومانس ختم ہو گیا سچ بات تو یہ ہے دل و دماغ میں جو ماضی کے آتش دان روشن ہیں ان کے جلتے انگارے بھی اب راکھ ہو گئے۔۔۔۔انہیں کریدو تو کبھی کبھی یادوں کی سہمی ہوئی چنگاریاں پل بھر کو درشن کرا کے راکھ ہو جاتی ہیں اور یہاں لنکاوی کی عمارتوں کی چھتوں میں نشانی کے طور پر بھی چمنی موجود نہیں کہ دسمبر میں بھی اپریل کا موسم ہوتا ہے۔۔۔

ملکی اور غیر ملکی سیاح ہماری طرح چہل قدمی کرتے ہوئے نظر آئے لوٹتے ہوئے اکثر مسافر شاپنگ بیگز میں کھانے پینے کی چیزیں اور پانی کی بوتلیں لے کر اپنے اپنے ہوٹلوں کی طرف جا رہے تھے۔۔۔۔حیرت کی بات یہ تھی کہ پلاسٹک کی یہ کالی تھیلیاں جو اب ہمارے یہاں قانوناً ممنوع ہیں اور اکثر ''ڈسٹ بن'' میں استعمال کی جاتی ہیں۔۔۔۔لنکاوی میں رائج ہیں۔۔۔۔ہم جس سے Mini Mart کا پتہ پوچھتے وہ اشارہ سے بتاتا کہ بس ذرا آگے ہے۔۔۔۔شاید پتہ بتانے کا پوری دنیا میں یہی رواج ہے ہمارے ملک میں بھی یہی طریقہ ہے۔۔۔۔کسی سے پتہ پوچھو وہ یہی کہے گا سامنے جا کر سیدھے ہاتھ کو مڑ جایئے۔۔۔۔جب ہم خود اپنے گھر کا پتہ بتاتے ہیں تو سب سے یہی کہتے ہیں کہ فلاں گلی سے مڑ کر چلیں گے تو بس میرا مکان ہے کالے رنگ کا گیٹ لگا ہوا ہے۔۔۔۔سندھ کے دیہی علاقوں میں پتہ بتاتے ہوئے ایک خاص مکالمہ استعمال ہوتا ہے۔۔۔آپ کسی جگہ یا مکان کا پتہ معلوم کریں تو وہ بڑے اخلاص

اور سادگی سے کہے گا۔۔۔۔''سائیں صد پنتھ تے آہے'' (جہاں تک آواز جائے) اپنی ابتدائی ملازمت کے دوران سندھ کے دیہاتوں میں ہم نے مذکورہ مکالمے پر میلوں سفر کیا ہے ۔۔۔۔ادھر بھی یہی طریقہ رائج ہے ہم پیدل چل چل کر تھک گئے ۔۔۔۔ پہلے ہی تھکن سے چور تھے لیکن سم خریدنی ضروری تھی۔۔۔۔ چلتے چلتے ہمیں دور ایک موڑ پر کچھ لوگوں کی آمد و رفت نظر آئی ۔۔۔۔ ہمارے سامنے انگریزی کے حرف T کی شکل میں سڑک کے دائیں بائیں ٹریفک رواں تھا بہر حال ہم اس موڑ تک پہونچے ایک ہوٹل والے سے اسٹور کا پوچھا۔۔۔اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔۔۔۔ ہم نے پھر پوچھا موبائل فون کی سم کہاں مل سکتی ہے۔۔۔۔۔ جواب میں گردن ہلا کر معذرت چاہی ۔۔۔۔۔مڑ کر دیکھا تو ہمارے سامنے ایک بہت خوبصورت عمارت موجود تھی۔۔۔۔۔۔ایئر پورٹ سے آتے ہوئے بھی ہم نے اسے دیکھا تھا یہ سائبان ہوٹل تھا ۔۔۔۔۔۔ پہاڑ کے دامن میں بہت پُر وقار اور خاصی بڑی عمارت تھی اس کے قریب ہی ایک بڑی سی دکان پر نظر پڑی لکھا تھا Mini Mart۔۔۔ مارکیٹ کو دیکھ کر بیگم خوش ہوگئیں سڑک پار کر کے ہم وہاں پہونچے ۔۔۔۔کراچی میں اب تو تقریباً ہر علاقہ میں ایسے اسٹور مل جاتے ہیں جہاں روزمرہ کی چیزیں دستیاب ہوتی ہیں۔۔

اسٹور کے اندر جا کر بیگم نے کاؤنٹر پر کھڑے ہوئے سیلز مین سے سم کے بارے میں پوچھا۔۔۔۔اس نے مسکراتے ہوئے ایک چھوٹا سا پیکٹ ہماری طرف بڑھا دیا قیمت اس کی ساڑھے آٹھ رنگٹ بتائی ۔۔۔ہمیں بہت سستا لگا فوراً خرید لی۔۔۔۔۔سیلز مین نے ہم سے پاسپورٹ مانگا ایک رجسٹر پر پاسپورٹ نمبر، ہمارا نام اور پتہ لکھا اور سم ہمیں دے دی بلکہ ہماری درخواست پر اس نے موبائل میں وہ سم لگا دی۔۔۔۔اسٹور سے پانی کی بوتل کی قیمت پوچھی کہا دو رنگٹ۔۔۔۔۔ ہم حیران رہ گئے ۔۔۔ہوٹل میں ہم نے اس کے دس رنگٹ دیئے تھے ۔۔۔۔بیگم نے بارگیننگ کی۔۔۔تو سیلز مین تین بوتلیں پانچ رنگٹ میں دینے پر آمادہ ہوگیا ۔۔۔۔۔ہم نے وہاں سے ڈبل روٹی، مکھن، Milk Pack اور کچھ کھانے کی چیزیں خرید لیں ۔۔۔تھوڑا سا وزن تو اٹھانا پڑا مگر پینے کے پانی کا مسئلہ حل ہوگیا۔۔۔۔اب ہمیں اتنا ہی واپس پیدل چلنا تھا۔۔۔۔موسم جوں کا توں۔۔۔۔ پیدل چلنے کی وجہ سے بنیان پسینے سے بھیگ گیا تھا اور بنیان کے اوپر پہنے ہوئے سوئیٹر سے الگ الجھن ہو رہی تھی:۔۔۔۔لیکن سم خرید کر ساری تھکن دور ہوگئی اور ہم میں ایک نئی توانائی لوٹ آئی۔۔۔۔اجنبی راستے ۔۔۔۔ان دیکھی

عمارتیں۔۔۔۔۔۔بھانت بھانت کے لوگ۔۔۔۔۔اور ان کے طرح طرح کے رنگ وروپ۔۔۔۔۔دائیں بائیں ہریالی۔۔۔۔نیچے سے اوپر تک سبزہ ہی سبزہ۔۔۔۔بہت اچھا لگ رہا تھا۔۔۔۔۔ہم چلتے رہے چلتے رہے قمیض کے اندر پہنا ہوا سوئیٹر بہت گراں گزر رہا تھا اب اور الجھن ہونے لگی تھی۔۔۔۔۔بیگم بھی تھک چکی تھیں۔۔۔۔ہم ایک خوبصورت ہوٹل کے قریب پہونچے۔۔۔۔سڑک کے کنارے ہوٹل کی انتظامیہ نے ایک چھوٹی سی Rockery بنائی ہوئی تھی اور ایک بڑے پتھر پر جلی حروف میں ہوٹل کا نام لکھا تھا Frangipki Hotel ۔۔۔۔۔۔روکری کے ساتھ گول دائرے میں ایک منڈیر بنی ہوئی تھی اس کے اندر پانی تھا اور پانی کی سطح پر بڑے بڑے پتے ہلکورے لے رہے تھے۔۔۔۔۔چھوٹے چھوٹے پتھروں کے بیچ خوبصورت پودے لگے ہوئے تھے اور ان میں سے پانی کی دھار جیسی چھوٹی چھوٹی آبشاریں گر رہی تھیں۔۔۔۔ہم دونوں اس منڈیر پر بیٹھ گئے۔۔۔۔میں نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔۔۔۔قمیض اتاری۔۔۔۔سوئیٹر اتارا۔۔۔۔بنیان بھی اتارنا چاہتا تھا۔۔۔۔تو بیگم نے فوراً ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا کہ یہ کیا کر رہے ہیں۔۔۔۔۔قمیض پہنے۔۔۔۔ہم نے جلدی سے قمیض پہن لی اور بیگم نے سوئیٹر طے کر کے اپنے بیگ میں رکھ لیا۔۔۔۔۔

آپ ٹھیک کہتے ہیں موسم ذرا گرم ہے مگر اتنا بھی نہیں جتنا ہم محسوس کر رہے ہیں کیونکہ ایک تو ہم بہت تھکے ہوئے ہیں دوسرے دو تین کلومیٹر پیدل چل چکے ہیں اور تیسرے ہم نے موٹے کپڑے پہن رکھے ہیں۔۔۔

اب ہم نے یہاں بیٹھ کر ہلکی شام کا لطف لیا۔۔۔۔۔سرسبزہ و شاداب پہاڑیاں۔۔۔۔۔صاف ستھرا ماحول۔۔۔۔۔ہوا میں سکون پہنچانے والی مہک۔۔۔۔۔اچانک فضاء میں ہم نے ایک آدمی کو رنگین چھتری کے سہارے اڑتے دیکھا اسے۔۔۔۔Para Sailing کہتے ہیں۔۔۔۔پیراشوٹ سے ملتی جلتی ہے۔۔۔اس چھتری کے ذریعہ ایک ساتھ دو افراد بھی اڑ سکتے ہیں۔۔۔۔۔۔کچھ دیر تک اسے ہم فضاء میں پیر لٹکائے جھولتے دیکھتے رہے پھر وہ درختوں کی اوٹ میں چلا گیا۔۔۔۔۔اور ہماری نظروں سے وہ اوجھل ہو گیا۔۔۔Para Sailing کے مناظر ہم نے فلم اور T.V اسکرین پر تو بارہا دیکھے تھے لیکن Para Sailing کا یہ پہلا براہ راست مشاہدہ تھا۔۔۔۔۔شام کے سرمئی سائے پھیلتے جا رہے تھے۔۔۔۔۔ہم تازہ دم ہو کر ایک بار پھر اٹھ کھڑے ہوئے۔۔۔۔۔ ہوا بند۔۔۔ماحول پر سکون۔۔۔۔درخت

ساکت۔۔۔شاخوں کی نازک پتیاں گم سم۔۔۔محسوس ہوتا تھا کہ تمام درخت حالت عبادت میں اپنے رب کے حضور مودب کھڑے ہیں۔۔

شاید بارش ہو جائے۔۔۔بیگم نے سکوت توڑا۔۔۔

اللہ کرے۔۔۔۔سنا ہے یہاں تقریباً روز ہی بارش ہوتی ہے۔۔۔تھکے ہارے ہم ہوٹل تک پہونچ گئے۔۔۔ہوٹل کی چہار دیواری میں پیدل داخل ہوئے تو پہلی بار Holiday Hotel & Resort SPA کو پوری طرح دیکھا۔۔۔سرخ اینٹوں کی جھونپڑی نما چھت ۔۔۔ہوٹل کے چاروں اور ہرے بھرے درخت اور سرسبز و شاداب درختوں سے ڈھکی ہوئی جھاڑیاں ۔۔۔۔۔ ۔۔۔سیدھے ہاتھ کو ہوٹل کی مختلف عمارتیں ۔۔۔صاف ستھری راہداریاں۔۔۔

ہم ہوٹل کی صدر دروازے تک پہونچے تو کار پورچ کے قریب چھوٹا سا تالاب اس کے اوپر جہازی سائز کی سیمنٹ سے بنی ہوئی دو صراحیاں آدھی جھکی ہوئیں۔۔۔اور ان کے کھلے ہوئے منہ سے پانی کی موٹی موٹی دھاریں۔۔۔۔تالاب میں بڑی بڑی رنگ برنگی تیرتی مچلتی بہت سی مچھلیاں۔۔۔۔آتے وقت ہم نے اچٹتی اور اجنبی نگاہوں سے یہ منظر دیکھا تھا لیکن اب زیادہ توجہ سے ہم رنگ برنگی مچھلیوں کو دیکھتے رہے۔۔۔۔ہوٹل کے داخلی حصے کے دائیں بائیں بیٹھنے کے لئے ''سنگی نشستیں'' یہاں پر Check in اور Check out ہونے والے مسافر اپنے سامان کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔۔۔۔ہم جب ہوٹل میں آئے تھے تو ہم نے بھی یہیں بیٹھ کر اپنی باری کا انتظار کیا تھا۔۔۔۔چند قدم آگے بڑھے تو ترچھے اسٹینڈ پر ہمارے یہاں کے سردے جیسے ادھ کٹے ہوئے پھل کی تصویر کسی پینٹر نے ڈیزائن کی تھی۔۔۔۔اس پھل کی تصویر کے نیچے لکھا تھا۔۔۔No Durian Please

Among the locals It is a Crown, Seasonally Favourit

ہمیں یاد آیا کہ ہمارے دوست یونس شیخ نے کراچی سے چلتے ہوئے اس پھل کے بارے میں بتایا تھا کہ ڈورین ضرور کھانا مگر لانے کی غلطی نہ کرنا۔۔۔ہم نے دل میں سوچا کہ ڈورین مقامی پھلوں کا بادشاہ ہے تو اسے ہوٹل میں لانا کیوں منع ہے۔۔۔دو تین دن کے بعد ہم نے ایک صاحب سے ڈورین کے بارے میں معلومات حاصل کی۔۔۔تو انہوں نے کہا کہ Its

taste like Heaven,but smell like Hell یعنی اس کا ذائقہ جنت کے پھل جیسا ہے لیکن بو۔۔دوزخ کی طرح ہے۔۔۔۔۔بات سمجھ میں نہیں آئی۔۔۔۔۔چونکہ اگر اس کی بو اتنی خراب ہے تو کھاتے کس طرح ہونگے۔۔۔ ہوسکتا ہے کہ اس کی بو ختم ہو جاتی ہو۔۔۔۔تب ہی تو پھلوں کا بادشاہ کہلاتا ہے۔۔۔۔بعد میں ہم نے پھلوں کی کئی دکانوں پر ڈورین تلاش کیا مگر دستیاب نہ ہوسکا۔۔۔بیگم نے کہا کہ کمرے میں چلیں مغرب کی نماز کا وقت ہونے والا ہے سارا دن ہم نے کوئی نماز نہیں پڑھی۔۔۔بات درست تھی اس لئے ہم اپنے کمرے میں آگئے۔۔۔

بیگم وضو کرنے چلی گئیں۔۔۔ہم نے کمرے کا پردہ ہٹایا۔۔تو سامنے خوبصورت منظر ۔۔۔۔یہ کھڑکی نہیں۔۔۔۔۔ بلکہ شیشے کی دیوار تھی۔۔۔اپنے کمرے میں ہوتے ہوئے بھی ہم خود کو باہر محسوس کر رہے تھے۔۔۔ہوٹل کے عقبی حصے میں سوئمنگ پول کے ساتھ پام کے درختوں کی قطاریں تھیں ان سے ذرا ہٹ کر درختوں کا ہجوم تھا۔۔۔ان درختوں کی شاخوں پر ڈوبتا ہوا سورج لٹکا ہوا پر بکھری ہوئی اپنی ملگجی کرنیں سمیٹ رہا تھا۔۔۔اب یہ سورج مغرب میں جائے گا۔۔۔مگر سحر خیزی کے عادی لوگوں کی بات کیا ہم جیسے دیر سے بیدار ہونے والے بھی اسے نہیں دیکھ سکیں گے۔۔۔کیونکہ وہاں سرد موسم کی وجہ سورج بھی بادلوں کا لحاف نہیں کمبل اوڑھے رہتا ہے ۔۔۔ہاں اگر کبھی بادل چھٹ جائیں تو لوگ دیوانہ وار ساحلوں کی طرف دوڑتے ہیں۔۔۔کہ سمندر کی نرم اور دھلی ریت پر لیٹ کر Sun Bath لے سکیں۔

سورج نظروں سے اوجھل ہوگیا۔۔۔اذان کی آواز سنائی نہیں دی۔۔۔چھت پر نگاہ پڑی تو قبلہ کا رخ بتانے کے لئے ایک اسٹیکر چپکا ہوا تھا بیگم نے الماری اور میز کی درازیں کھول کر دیکھیں مگر جاءنماز نہ مل سکی۔۔۔میں نے استقبالیہ کاؤنٹر میں فون کیا۔۔۔اور جائے نماز طلب کی تو نسوانی آواز نے جواب دیا We dont have provide any piece of cloth for pray۔۔۔حیرت ہوئی۔۔۔۔پھر یہ سوچ کر کہ تفریحی مقام پر ہوٹل واقع ہے۔۔۔جانے اس کے مالکان مسلمان ہے یا نہیں۔۔۔بیگم کا شال بچھا کر نمازیں ادا کی گئیں۔۔۔ Check in ہوتے وقت چابیوں کے ساتھ ہوٹل مینیجر نے دو تین لفافے بھی ہمیں دیئے تھے مصروفیت کی وجہ سے ہم انہیں پڑھ نہیں سکے تھے ان میں سے ایک خط تو Asian overland service, کے مینیجر کا تھا.....اس میں درج تھا کہ صبح ساڑھے نو بجے ہوٹل لوبی

میں آجائیں City Tour کے لئے آپ کو گاڑی لینے آئے گی۔۔۔۔اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ فون کر کے بتادیں۔۔۔۔کہ آپ کا پروگرام تبدیل تو نہیں ہوا۔۔۔۔دوسرے خط میں ہوٹل والوں نے ہمیں خوش آمدید کہا تھا اور پھلوں کی ایک باسکٹ تحفے میں بھیجی تھی (ہمیں ٹوکری یا چھبڑی لکھتے ہوئے اچھا نہیں لگا)۔۔۔خوبصورت پنی میں لپٹی ہوئی ایک باسکٹ میز پر رکھی تھی..... مگر ہم نے اس خیال سے اس پر توجہ نہ دی کہ پھلوں کو استعمال کریں تو قیمت ادا کرنی پڑے گی۔۔۔۔اس دوران بیگم نے اپنا موبائل فون چارج کر لیا تھا لیکن پاکستان میں کسی کا بھی نمبر نہیں مل رہا تھا۔۔۔۔اصل بات یہ بھی ہے کہ پردیس میں رہتے ہوئے اپنے ملک میں موبائل فون سے بات کرنے کا ہمارا یہ پہلا موقع تھا

اس دوران ہم نے گرم پانی سے شاور لیا تازہ دم ہو گئے ہم نے بیگم سے کہا۔۔۔۔لابی میں چلتے ہیں۔۔۔۔یوں بھی ہمیں انہیں اطلاع دینی ہے کہ ہمارا پروگرام تبدیل نہیں ہوا ہے۔۔۔۔ہوٹل سے نکل کر ہم استقبالیہ کاؤنٹر پر آئے۔۔۔۔اور اپنے پروگرام کے بارے میں بتانا چاہا۔۔۔۔تو خاتون نے ہاتھ کا اشارہ کر کے بتایا کہ Asian services کا دفتر برابر میں ہے میں اور بیگم AOST کے دفتر کا دروازہ کھول کر اندر پہونچے تو ایک پکی عمر کی سیاہ فام خاتون نے مسکرا کر ہمارا استقبال کیا۔۔۔۔ابھی ہم بات شروع کرنے کے لئے انگریزی کے جملے سوچ رہے تھے۔۔۔۔کہ خاتون نے ایک فائل اٹھا کر اپنے سامنے رکھی۔۔۔۔اور کہا رضوان۔۔۔۔

ہم حیران ہوئے۔۔۔۔اور ثبات میں جواب دیا۔

پوچھا پروگرام میں کوئی تبدیلی چاہتے ہیں۔۔۔۔۔۔؟

ہم نے کہا نہیں!

اب بیگم نے اپنا مسئلہ بیان کیا لیکن درمیان میں بات کاٹ کر ہم نے ان کا نام پوچھا کہنے لگیں۔۔۔۔۔ماریہ

ہم نے ماریہ کو بتایا کہ بیگم اپنے بچوں سے بات کرنے کے لئے بہت پریشان ہیں لیکن ان کا کسی سے فون پر رابطہ نہیں ہو رہا!

مسکرائیں۔۔۔۔۔۔سیاہ چہرے پر اجالے اتر آئے۔۔۔۔مجھے یاد آیا کبھی کبھی امی، باروچی خانے سے آواز لگا کر کہتیں تھیں۔۔۔۔بچو! ۔۔۔۔دیکھو توا ہنس رہا

ہے۔۔۔۔ہمیں کچھ سمجھ تو نہیں آتی تھی بس تو اچھا لگنے لگتا تھا۔۔۔۔۔۔ماریہ مسکرائی تو ایسا ہی لگا اس کے چہرے پر حسن اتر آیا مسکراتے ہوئے بڑی اپنائیت اور شفقت سے بیگم سے کہا

کچھ فکر نہ کرو ۔۔۔۔۔یہاں گھومنے پھرنے اور تفریح کرنے کے لئے آئی

ہو۔۔۔۔۔بھول جاؤ۔۔۔۔۔سب کچھ بھول اجاؤ۔۔۔۔اب آپ لوگ یہاں محفوظ ہاتھوں میں ہیں۔۔۔۔بس اپنے بچوں کو فون کر کے اپنی خیریت بتا دو۔۔۔پھر گھر کے بارے میں کوئی فکر نہ کرنا۔۔۔۔۔وہ پھر مسکرائی۔۔۔۔۔اور کہا۔۔۔۔Go and Enjoy

بیگم نے ماریہ سے کہا کہ میں اپنی خیریت بتا کر اپنا نیا Cell Number بچوں کو دینا چاہتی ہوں مگر ان سے contact نہیں ہو رہا ہے یہ کہہ کر بیگم نے اپنا موبائل نکالا اور مون کا نمبر ماریہ کی طرف بڑھا دیا

موبائل فون لے کر ماریہ نے پوچھا ۔۔۔۔۔۔پاکستان کا ۔۔۔۔۔۔ Calling Code number بتائیے

ہم دونوں ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے!

پاکستان کا کوڈ نمبر!۔۔۔۔۔۔اصل میں ہم پہلی بار کسی اور ملک سے پاکستان فون کر رہے تھے اس لئے کوڈ نمبر کی کبھی ضرورت نہیں پڑی۔۔۔

اپنے ملک کا کوڈ نمبر معلوم نہیں ہے۔۔۔۔۔۔ماریہ کے چہرے پر پہلے حیرت او پھر

مسکراہٹ عود کر آئی۔۔۔۔

ہم خجالت۔۔۔۔۔ندامت۔۔۔اور شرمندگی سے پانی پانی ہو گئے۔۔۔۔۔۔اکبرالہ آبادی کو بھی شاید ایسی ہی صورتحال کا سامنا ہو گا تبھی انہوں نے کہا تھا

''اکبر وہیں پہ غیرتِ قومی سے گڑ گیا''

ہم نے دھیمے لہجے میں کہا ماریہ۔۔۔آپ کو تو معلوم ہو گا کہ آپ یہاں سے پاکستان میں موجود اپنے Clients سے بات کرتی ہونگی

جواب میں ماریہ نے کہا میں انڈیا سے Deal کرتی ہوں وہاں کا نمبر مجھے معلوم ہے 91۔۔۔۔۔۔اس کے بعد اس نے اپنا موبائل فون اٹھایا اور کسی نمبر پر ڈائل کرنے لگیں۔۔۔۔۔اور بولیں میں انڈیا میں اپنے دفتر سے پوچھتی ہوں۔۔۔۔۔۔شاید انہیں پاکستان کا کوڈ نمبر۔۔۔۔۔۔۔

میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا پلیز آپ انڈیا فون نہ کریں۔۔۔۔۔

ok۔۔۔۔۔۔Ok۔۔۔۔میں کچھ کرتی ہوں۔۔۔۔ماریہ نے موبائل رکھ کر میز کی دراز کھولی کچھ کاغذات نکالے ان میں سے ایک کاغذ پر مختلف ممالک کے Code Numbers لکھے تھے۔۔۔۔چند لمحوں بعد ماریہ نے بتایا کہ پاکستان کا ڈائلنگ کوڈ نمبر 92 ہے

بہت بہت شکریہ۔۔۔۔۔بیگم کھل اٹھیں۔۔۔انہوں نے فوراً سنی کو فون کیا اور اپنا نیا فون نمبر لکھوا دیا

ہم شکریہ ادا کر کے اٹھنے لگے تو ماریہ نے پوچھا کہ آپ نے Tour.A لیا ہے۔۔۔ٹھیک ساڑھے نو بجے گاڑی آجائے گی۔آپ تیار رہیئے گا۔

جی ہمیں معلوم ہے۔۔۔۔

ماریہ نے پھر کہا آپ لوگ ٹوربی پر جانا پسند نہیں کرو گے

بیگم نے پوچھا وہ کیا ہے۔۔۔۔

ماریہ نے بتایا کہ کشتی کے ذریعہ مختلف جزیروں پر آپ کو لے کر جائیں گے بہت دلچسپ اور حیرت انگیز چیزیں دیکھنے کو ملیں گی۔eagle Square ۔۔۔۔۔۔۔Pregnant lady Hill ۔۔۔۔۔۔۔اور بہت کچھ۔۔۔۔بیگم کشتی کے سفر کا سن کر ڈر گئیں پانی سے انہیں خوف آتا ہے۔۔۔۔حلانکہ ہم نے روانگی سے پہلے بیگم کو کشتی کے سفر کے لئے تیار کرنے کی بہت

کوشش کی تھی ۔۔۔۔۔۔فیری کے لئے تو وہ آمادہ ہوگئیں تھیں کہ ایک بار لندن سے پیرس تک فیری میں سفر کیا تھا۔۔۔۔مگر عام کشتی کے سفر کا سن کر ہی وہ گھبرا جاتی ہیں ۔۔۔۔۔مجھے عقابوں کا نشیمن دیکھنے کا شوق تھا کہ اس کے بارے میں فرہاد زیدی نے مجھے بتایا تھا۔۔۔۔اور مسرت بھابی نے تفصیل سے اس کا ذکر اپنے کالم میں بھی کیا تھا۔۔۔

ماریہ نے پیشہ ورانہ انداز میں ایک بار پھر ہمیں ترغیب دی۔۔۔۔۔

بیگم نے جواب دیا کہ ہم پرسوں Penang جا رہے ہیں۔۔۔۔

ماریہ کہنے لگیں کوئی بات نہیں ۔۔۔۔۔آپ کل دوپہر تین بجے کے بعد یہ Tour لے سکتے ہیں کیونکہ پہلے Tour سے آپ ڈیڑھ بجے واپس آجائیں گی لنچ کریں اور ہوٹل لابی میں آجائیں۔۔۔۔آپ کو ہماری گاڑی Pick کرلے گی۔۔۔۔

کیا اس کے لئے ہمیں علیحدہ رقم دینی ہوگی۔۔۔میں نے پوچھا

Off course۔۔۔۔۔۔کیونکہ Tour B آپ کے پروگرام میں شامل نہیں ہے

کتنے پیسے دینے ہونگے۔۔۔۔؟

دونوں کے 90 رنگٹ۔۔۔ماریہ نے بتایا۔۔۔۔۔!!

ہمیں 90 رنگٹ کا تو اندازہ نہیں ہوا مگر نائن زیرو کا ہندسہ پسند آیا اور ہم نے بیگم کی طرف دیکھا

ٹھیک ہے ہم مشورہ کر کے آپ کو بتاتے ہیں۔۔۔۔بیگم نے جواب دیا

جلدی کیجئے گا مجھے انتظام بھی کرنا ہوگا۔۔۔۔اور ہاں ۔۔۔۔نو بجے دفتر بند ہو جاتا ہے

ٹھیک ہے۔۔۔۔ہم شکریہ ادا کر کے اٹھ کھڑے ہوئے۔۔۔۔

ماریہ نے کھڑے ہو کر بیگم سے ہاتھ ملایا۔۔۔۔مسکرائی۔۔۔۔ایک بار پھر احساس ہوا کہ تو ہنس رہا ہے۔۔۔۔اور ماریہ کے چہرے پر حسن اتر آیا۔۔۔۔

کمرے میں آکر ہم نے بیگم کو رضا مند کر لیا۔۔۔۔اور میں نے ماریہ کے دفتر جا کر Tour B کے لئے اپنی بکنگ کرالی۔

☆☆☆☆

صبح ساڑھے سات بجے بیگم نے ہم کو جگا دیا۔۔۔۔بستر سے اٹھ کر میں نے دیوار پر

پڑے پردوں کو ہٹایا۔۔۔سامنے صبح کا منظر تھا۔۔۔سورج بادلوں کے اوپر طلوع ہوا ہوگا مگر اس کے دھندلے دھندلے اجالے فضاء میں پھیلے ہوئے تھے۔۔۔۔سوئمنگ پول پر نظر پڑی۔۔۔اب اسے غور سے دیکھا اتنا بڑا Poll ہم نے اس سے پہلے نہیں دیکھا۔۔۔اس وقت سبز مائل پانی ساکت تھا۔۔۔۔پانی کو سبز مائل ہم اس لئے کہہ رہے ہیں کہ پول سبز رنگ کے ٹائلز سے بنایا گیا تھا۔۔۔Poll کے چاروں طرف گول دائرے میں ایک ہی قد وقامت کے درجن بھر Palm کے درخت ایستادہ تھے۔۔۔ان کے درمیان۔۔۔اتنی ہی تعداد میں بڑی بڑی چھتریاں بنی ہوئی تھیں۔۔۔چھتریاں دیکھ کر تھر پارکر کے علاقے کی گول چھتوں والی جھونپڑیاں ذہن میں تازہ ہوگئیں۔۔۔۔ہوبہو۔۔۔بالکل انہی کی طرح۔۔۔۔ایک لوہے کے پائپ پر بہت بڑی چھتری بنائی گئی تھی اس پر غالباً مٹی کا گارا لیپا گیا ہو گا۔۔۔۔اور اس کے اوپر خشک گھاس پھونس اس طرح سے لگایا گیا تھا کہ وہ بالکل تھر کی جھگی کا منظر پیش کر رہی تھیں۔۔۔۔فرق صرف اتنا تھا کہ تھر کی جھگی میں چھت کے نیچے کچی مٹی کی دیوار پر گھاس پھونس ہی کی مدد سے ایک دائرے میں دیواریں بنا دی جاتی ہیں اور آنے جانے کے لئے اس میں لکڑی کا ایک دروازہ لگا ہوتا ہے۔۔۔۔۔یہاں دیواریں نہیں۔۔۔اس لئے وہ چھتری ہی کہی جاسکتی ہے۔۔۔''سوئمنگ پول'' کے کنارے کنارے۔۔۔لیٹنے کے لئے لمبی کرسیاں جابجا بچھی ہوئی تھیں۔۔۔ان کے آس پاس طرح طرح کے پھولوں کے پودوں کے تختے بنائے گئے تھے۔۔۔ہوٹل کے جن کمروں کی دیواریں (شیشے کی دیواریں) Pool کی سمت تھیں ان کے درمیان دیوار پر خوشنما بیلیں چڑھی ہوئی تھیں ہمارے کمرے کی دیوار کے ساتھ جو بیل جڑ سے اونچائی کی طرف جارہی تھیں۔۔۔اس میں چھوٹے چھوٹے نازک پتے جڑے ہوئے تھے۔۔۔۔ہرے ہرے پتوں کے ساتھ چند پیلے پتے بھی زندگی کی آخری سانسیں لے رہے تھے۔۔۔میں جب غور سے بیل کو دیکھ رہا تھا۔۔۔تو ایک پیلا پتا بغیر ہوا کے جھونکے سے شاخ سے ٹوٹا اور فضا میں تیرتا ہوا نیچے زمین میں گر گیا۔۔۔یہ ایک پتہ تھا۔۔۔۔پیلا اور خشک پتہ۔۔۔۔یعنی سوکھا ہوا اور غیر ضروری۔۔۔۔یہی قانون قدرت ہے۔۔۔۔جو گر گیا وہ مر گیا۔۔۔۔جو شاخ سے علیحدہ ہوا وہ فنا ہوگیا۔۔۔۔بیج کی صفت مختلف ہے۔۔۔۔وہ زمین میں بویا جاتا ہے تو ایک مقررہ مدت کے بعد زمین سے سر ابھارتا ہے۔۔۔پہلے پنیری۔۔۔پھر کونپل۔۔۔پھر پودا۔۔۔اور ازاں بعد۔۔۔بڑھتے بڑھتے پیڑ بن جاتا

ہے۔۔۔۔ویسا پیڑ جیسا قدرت بنانا چاہتی ہے لیکن یہ درخت اپنے وجود سے۔۔۔۔پھر بیج پیدا کرتا ہے اور بیج ایک دائرے میں سفر کرتا ہوا پھر زمین کی گود میں بو دیا جاتا ہے۔۔۔۔اور پھر اسی بیج سے ایک نئے درخت کی شاخ پھوٹتی ہے۔۔۔۔

کیا سوچ رہے ہیں آپ۔۔۔۔جلدی کریں۔۔۔۔ہمیں ابھی ناشتہ بھی کرنا ہے۔۔۔۔۔پتا ہے یہ لوگ وقت کے بڑے پابند ہوتے ہیں

میں بیگم کی آواز پہ چونکا۔۔۔۔اور جلدی جلدی تیاری کرنے لگا۔

دروازہ بند کرنے سے پہلے میں نے بیگم سے پوچھا آپ نے ناشتہ کے Vouchers لے لئے

جی! بس اب دروزاہ بند کریں اور چلیں۔۔۔۔

کمرے سے نکل کر ہم راہداری سے گزرتے ہوئے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ہوٹل میں آئے بہت سے مسافر ناشتہ میں مصروف تھے۔۔۔۔کاؤنٹر پر ہم نے اپنے Vouchers دکھائے اور اندر چلے گئے ایک میز منتخب کی۔۔۔۔۔اس کے بعد مختلف میزوں پر سجی ہوئیں Dishes کا جائزہ لیا۔۔۔۔دنیا بھر کی قوموں کے لئے ناشتہ میں جو کچھ ہونا چاہیے تھا اس سے کہیں زیادہ چیزیں تھیں۔۔۔۔۔مقامی Dishes کے علاوہ غیر ملکی ناشتے کی چیزیں بھی تھیں ان سب پر نام بھی لکھے ہوئے تھے۔۔۔۔۔بہت سے پھل۔۔۔۔کئی طرح کے Juices۔۔۔۔۔۔ڈبل روٹی کے سکے ہوئے۔۔۔۔۔تلے ہوئے۔۔۔۔اور بھنے ہوئے سلائسز۔۔۔۔۔۔ روٹی۔۔۔۔پراٹھا۔۔۔۔سبزی۔۔۔۔۔چاول۔۔۔۔ساگ۔۔۔۔اور کئی قسم کے cereals لیکن۔۔۔۔لسی۔۔۔۔۔پائے۔۔۔۔۔مغز۔۔۔۔اور نہاری نہیں تھی۔۔۔۔۔

ناشتہ میں ہم نے تربوز شوق سے کھایا۔۔۔۔زندگی میں اتنا لذیز تربوز پہلے نہیں کھایا تھا۔۔۔۔جانے کس طرح سے ایک ہی سائز میں اس کے خوبصورت سلائز تیار کئے گئے تھے۔۔۔۔۔ہر ٹکڑا بغیر بیج کے۔۔۔۔بیج نکالنے کے نشانات بھی نہیں تھے۔۔۔۔اسی طرح۔۔۔۔اسی انداز میں۔۔۔۔۔خربوزہ اور پپیتا بھی موجود تھا۔۔۔۔۔۔مگر اس میں وہ زائقہ نہیں تھا۔۔۔۔۔جو ہمارے یہاں پیڑ کے پکے ہوئے پپیتے میں ہوتا ہے

ناشتہ سے فارغ ہو کے ہم ہوٹل کے داخلی دروازے کے اندر لاؤنج میں رکھی ہوئی سنگی

نشستوں پر بیٹھ گئے ۔۔۔۔ایک صاحب قریب آئے ۔۔۔۔ہمارا نام پوچھا۔۔۔۔اور اس کے بعد کہنے لگے ۔۔۔تشریف لائیے ۔۔۔گاڑی تیار ہے ۔۔۔۔اس کوسٹر میں ہمارے ساتھ ایک پاکستانی نوبیاہتا جوڑا بھی ہم سفر تھا ۔۔۔۔۔خوش مزاج ۔۔۔۔شائستہ ۔۔۔۔۔اور پراعتماد ۔۔۔۔۔سلام دعا کے بعد ہم ایئر کنڈیشن کوسٹر میں سوار ہوگئے ۔۔۔میں نے ڈرائیور گائیڈ سے ان کا نام پوچھا ۔۔۔۔میرا نام واسو ہے ۔۔۔۔Tour Guide نے بتایا ۔۔۔۔سفر شروع ہوا۔۔۔سواری اسی راستے پر روانہ ہوئی جہاں کل شام ہم بہت پیدل چلے تھے

''یہ تو وہی جگہ ہے گزرے تھے ہم جہاں سے''

جانے کیوں پاکستانی فلم کے پرانے گانے کا ایک بول ہمیں یاد آیا۔۔۔۔سفر جاری رہا ۔۔۔ہم دائیں بائیں دیکھتے رہے ۔۔۔۔نرم نرم سورج ۔۔۔شرمایا شرمایا سا۔۔۔۔درختوں کی شاخوں سے جھانک رہا تھا۔۔۔۔فضاء بالکل ساکت تھی ۔۔۔۔درخت چپ چاپ اور خاموش۔۔۔۔۔باہر کی فضاء خوشگوار تھی ۔۔۔۔ہم منی مارٹ سے سیدھے ہاتھ کی طرف مڑ گئے ۔۔۔۔اسی طرف سائبان ہوٹل تھا۔۔۔۔۔سائبان ہوٹل سے گزرے، سڑک کے دوسری جانب خاصی دور تک کھلا میدان تھا مگر اس میں ایک ہاتھ سے اونچی خودرو گھاس جو اپنی نازکی کی وجہ سے تن کر کھڑے ہونے کی بجائے ہوا کے رخ پر جھکی ہوئی تھی ۔۔۔۔

لنکاوی ایک چھوٹا سا قصبہ ہے ۔۔۔۔آبادی بھی کم ہے ۔۔۔۔اصل میں یہ ایک تفریحی مقام ہے ۔۔۔۔یہاں ہر طرف سڑک کے کنارے کنارے ہوٹلیں ہی ہوٹلیں ہیں ۔۔۔۔۔مقامی آبادی سے کہیں زیادہ سیاح ہوتے ہیں ۔۔۔۔بیشتر عمارتیں نوتعمیر شدہ ہیں ۔۔۔۔۔تھوڑے تھوڑے فاصلے پر نئی عمارتیں تعمیر کی جارہی ہیں ۔۔۔۔

☆☆☆

بَرڈ پارک

ہماری پہلی منزل Bird Park تھی ایک چھوٹی سی عمارت کے سامنے کوسٹر رک گئی۔Tour Guide نے بتایا کہ یہاں ۔۔۔آدھا گھنٹہ آپ نے ٹھہرنا ہے۔۔۔۔اندر جا کر آپ کاؤنٹر سے ٹکٹ خرید لیں۔۔۔یہ کہہ کر وہ ہم سے پہلے آگے چل دیا۔۔۔ Bird park میں داخلے کا ٹکٹ 18 رنگٹ تھا۔۔۔۔اندر داخل ہوئے تو کشادہ لاؤنج کے ایک طرف سوینیرز کی دکان تھی۔۔۔دکان کیا اچھا بھلا اسٹور تھا۔۔۔اس کا ذکر ہم بعد میں کریں گے۔Reception کاؤنٹر سے ہم نے ٹکٹ خریدے۔۔۔کاؤنٹر پر موجود خاتون نے ہاتھ کے اشارے اندر جانے کے لئے راستہ بتایا۔۔۔۔اندر پہونچے۔۔۔۔بل کھاتی راہداریاں۔۔۔دائیں بائیں پنجرے یا کمرے۔۔۔ہر موڑ پر ایسی طرز تعمیر۔۔۔یا تزئین و آرائش۔۔۔۔کہ جی چاہے ہر موڑ اور مقام پر کھڑے ہو کر فوٹو کھنچوایا جائے ۔۔۔مقصود اپنا فوٹو نہیں۔۔۔پس منظر کا۔۔۔کہ یادوں کو دہرانے اور گھر آئے سیدھے سادھے مہمانوں کو تصویریں دکھا کر رعب جمانے کا موقع مل جاتا ہے۔۔۔

Bird park کو ہم لغوی اعتبار سے چڑیا گھر کہہ سکتے ہیں لیکن جن معنوں میں Zoo کا ترجمہ اردو میں رائج ہے اس طرح کا یہ چڑیا گھر نہیں تھا۔۔۔یہاں صرف پرندے تھے ۔۔۔جانور۔۔۔درندے۔۔۔۔یا دیگر چوپائے نہیں تھے۔۔۔اندرونی منظر نہایت خوبصورتی سے ڈیزائن کیا گیا تھا۔۔۔۔بعض پرندے اپنے اپنے جنگلوں یا کمروں میں تھے اور بہت سے پرندے آزاد۔۔۔۔آزاد ان معنوں میں کہ وہ محدود کھلی فضاء میں اڑ سکتے تھے ۔۔۔۔پارک میں کافی اونچائی پر۔۔۔نامحسوس طریقے سے نظر آنے والی جالی کا سائبان تنا ہوا تھا۔۔۔۔راہداریاں اس طرح بنائی گئی تھیں کہ سیاح تیر کے نشان کے مطابق چلتا رہے اور آخر میں EXit تک پہونچ جائے یہاں باہر نکلنے کے لئے Exit کے ساتھ ساتھ Kalunor لکھا ہوتا ہے۔۔۔مقامی زبان میں باہر نکلنے کے لئے یہی لفظ استعمال ہوتا ہے

سب سے پہلے ہم نے ایک کمرے میں لومڑی نما جانور دیکھا لکھا تھا Short Onix

---عام طور پر اس کی لمبائی 2.65 میٹر ہوتی ہے اور وزن چھ سے بارہ پونڈ تک ------آگے بڑھے طوطے ------طوطوں کا تصور کر کے ہمارے ذہن میں ہرا رنگ ابھرتا ہے لیکن یہاں رنگ برنگے طوطے ----چھوٹے ----درمیانے -----اور بڑی قدو قامت کے ------ان میں بالکل دودھ ایسے سفید جھاگ رنگ کے طوطے ----ہمیں بہت پسند آئے ---غور سے دیکھا، سب کی آنکھیں طوطا چشم ----باتیں کرتے کسی کو نہیں دیکھا ---ان سب سے خوبصورت اور بڑا طوطا تو ہمارے دوست یوسف شیخ کے گھر میں ہے -----داخل ہوں تو سلام کرتا ہے رخصت ہوتے وقت خدا حافظ کہتا ہے ----شاید مسلمان ہے-----یا یوسف شیخ نے خریدنے کے بعد اسے کلمہ سکھا دیا تھا، پہلے عیسائی ہوگا---یوسف شیخ مہینوں سے اس کے لئے ''طوطی'' کی تلاش میں ہیں -------مگر ملتی نہیں، یوں بھی کراچی ایسے نقار خانے میں کون طوطی کی آواز سنتا ہے اسی لئے کمیاب ہے---- یوں بھی یوسف شیخ دھان پان سے آدمی ہیں، بہت سے لوگوں سے ''طوطی'' خریدنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے مگر نہ طوطی ملی اور نہ کسی نے اس نقار خانے میں طوطی کی آواز سنی۔

طوطا ان معدود چند پرندوں میں شمار ہوتا ہے جس کی Mrs نہیں ہوتی ----یعنی مادہ نہیں ہوتی ----ہوتی ہوگی جسے صرف طوطا ہی پہچان سکتا ہے-----ہماری بصارت اور بصیرت آج تک طوطوں کے درمیان کسی مادہ کی تمیز نہیں کر سکیں-----طوطی کا لفظ تو ہم نے لکھ دیا ورنہ عام طور پر نر اور مادہ سب کو طوطا ہی کہا جاتا ہے----طوطا، واحد پرندہ ہے جو پرندوں میں بد معاش یا فلرٹ مشہور ہے----اردو قصوں اور کہانیوں میں یہ طوطی سے نہیں مینا سے پیار کرتا ہے---ہر قصہ میں اس کی ہیروئن مینا ہوتی ہے'' طوطا چشمی'' کا الزام بھی طوطے پر پہلے پہل ''طوطیوں'' ہی نے لگایا ہوگا---ہمارا اپنا مشاہدہ بھی یہی ہے کہ ہم نے کبھی طوطے کو اپنی مادہ سے اس قدر اظہار محبت کرتے نہیں دیکھا جتنا کبوتر اور مرغے کو اپنی مادہ پر لٹو ہوتے دیکھا ہے ----یوں بھی طوطے کی وفاداری مشکوک ہوتی ہے---کبوتر تو میلوں اڑان بھر کر اپنے مالک کے پاس لوٹ آتا ہے---لیکن طوطے کو اڑان کا موقع مل جائے تو لوٹ کر نہیں آتا اسی لئے گھروں میں طوطے کو پنجرہ میں بند رکھا جاتا ہے----آپ تجربہ کر لیں----کتنا ہی پالتو طوطا ہو----اس کے پر، پر پرواز کے لائق ہوں تو موقعہ ملتے ہی اڑ جائے گا----گویا آنکھوں ہی میں نہیں اس کے کردار میں بھی ہرجائی پن ہے---آپ اگر قسمت بتانے والے طوطوں کی

وفاداری کی مثال دیں تو حضور۔۔۔اول تو ان کے پر ''قینچ'' کٹے ہوتے ہیں، دوئم ہر لفافہ اٹھانے کا محنتانہ ایک دانہ کی صورت اپنے مالک سے فوراً وصول کرتا ہے اور سوئم لفافہ پکڑنے میں بھی بے ایمانی کرتا ہے۔۔۔آپ خود بتائیں طوطے نے کسی کی قسمت کا حال صحیح بتایا ہے۔۔۔؟ خیر چھوڑیئے طوطے کو۔۔۔۔آگے چلے ایک حصے میں ایک بڑا پرندہ تھا تیتر سے ملتا جلتا ۔۔۔۔۔پلیٹ پر لکھا تھا Lady Amherst Theasant۔۔۔۔ہم نے غور سے دیکھا ۔۔۔۔Lady ہونے کا کہیں سے گمان بھی نہیں گزرتا تھا۔۔۔جانے کیوں اس پرندے کے ساتھ اتنا Romantic سابقہ لگا دیا ۔۔۔۔۔مقصود رومان پیدا کرنا بھی نہیں ہو سکتا۔۔۔۔۔بہر حال ہمیں یہ پرندہ نہیں بھایا۔۔۔شاید نام کی وجہ سے۔۔۔لیکن سچی بات ہے کہ اس کے Lady ہونے پر شک تھا مگر پرندہ ہونے پر کوئی شبہ نہیں۔۔۔۔۔آگے بڑھے ایک کھلے ہوئے چھوٹے سے تالاب میں ایک کاہل ۔۔۔۔۔ست ۔۔۔۔۔نکما ۔۔۔۔ایدی۔۔۔۔اور کم کس۔۔۔۔مگر مچھ پڑا اونگ رہا تھا۔۔۔۔مگر مچھ کو یوں بے حس و حرکت دیکھ کر خیال آیا کہ قدرت نے مگر مچھ کو کیوں پیدا کیا۔۔۔۔۔اس کا گوشت اور کھال انسان کے لئے منفعت بخش ہیں تو اس کام کے لئے سینکڑوں قسم کے جانور پیدا کئے گئے ہیں ۔۔۔مگر مچھ نہ دیکھنے لائق۔۔۔نہ پالنے کے قابل۔۔۔۔حتیٰ کہ عید الضحیٰ کے موقع پر اس کی قربانی بھی ممنوع ۔۔۔۔سواری کے کام بھی نہیں آتا ۔۔۔۔انسان دوست بھی نہیں ہے۔۔۔پھر دل میں خوف پیدا ہوا کہ بغیر حکمت کے اللہ تعالیٰ نے کوئی چیز پیدا نہیں کی یقیناً اس کا بھی کوئی فائدہ ہے۔۔۔۔بہت سوچا۔۔۔اچانک ایک بات ذہن میں آئی کہ۔۔۔مگر مچھ کی تخلیق ۔۔۔ناکارہ۔۔۔اور کاہل قوموں کی علامت ہے۔۔۔۔یا ان کے لئے درس عبرت ہے۔۔۔۔ہمیں ایک پاکستانی کی حیثیت سے اپنا خیال آیا اور شرمندہ ہو کر جلدی سے آگے بڑھ گئے

اچانک بیگم نے پکارا۔۔۔۔الو!۔۔۔۔۔۔یہ دیکھیں سامنے۔۔۔میں ایک دم چونکا۔۔۔۔اور سوچا۔۔۔۔کہ بیگم کا سوئے تخاطب کس طرف ہے کہیں ہمیں تو نہیں کہا ۔۔۔ہم نے بیگم کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا تو وہ شرما گئیں اور کہنے لگیں۔۔۔۔وہ سامنے ۔۔۔کونے کی طرف ایک مصنوعی درخت کی ٹھنڈ پر الو بیٹھا ہے۔۔۔

نگاہوں نے اسے تلاش کر لیا۔۔۔دل میں چور تھا اس لئے پوچھ لیا کیا خاص بات ہے

اس میں ۔۔۔کیا پہلی بار دیکھا ہے؟

دیکھیں تو کتنا بڑا ہے۔۔۔۔۔بیگم نے بات ٹالتے ہوئے کہا

کیا ہم سے بھی بڑا ہے۔۔۔۔

مسکرائیں۔۔۔۔۔کہنے لگیں میری یہ منشا نہیں ہے

کیا اس کی طرف اشارہ کر کے مجھے الو بنا رہی ہو۔۔

بولیں۔۔۔میں اس لائق کہاں۔۔۔یہ تو اللہ کے کام ہیں

ٹھیک ہے منو!!۔۔۔دل کی بات کہنے کے لئے جگہ کا انتخاب تم نے خوب کیا

مسکرا کر کہنے لگیں۔۔۔۔الو کو مغرب میں دانش کی علامت سمجھا جاتا ہے۔۔۔ہاں جگہ کا انتخاب میں نے غلط کیا ہے۔۔۔۔لندن میں جب ہم Zoo دیکھنے گئے تھے تو وہاں الو کے جنگلے کے پاس کھڑے ہو کر یہ بات کہنا چاہیئے تھی۔۔۔خیر چھوڑیں آپ نے لفظ پکڑ لیا حالانکہ یہ تو مذاق تھا۔۔ہمیں اب چلنا چاہیئے۔۔۔وہ جوڑا ہم سے آگے نکل گیا

انہیں آگے ہی نکلنا ہے نو بیاہتا جوڑا ہے اس وقت وہ ہم سے دور رہنا چاہتے ہیں کہ ہم لوگوں کے علاوہ کوئی اور سیاح اس چڑیا گھر میں نہیں ہے۔۔۔اور یہ پرندے معصوم اور بے ضرر ہوتے ہیں۔۔۔جو دیکھتے ہیں وہ کسی سے کہتے نہیں۔۔۔صرف طوطوں سے دھڑکا لگا رہتا ہے یہی وجہ ہے کہ نو بیاہتا جوڑا طوطوں کے جنگلے کے سامنے رکا نہیں۔۔۔

آگے بڑھے تو ایک ''جیولری شاپ'' آ گئی۔سونے چاندی کے زیورات کے علاوہ پتھروں سے بنائے ہوئے دیدہ زیب، پرکشش اور خوبصورت زیورات۔۔۔ان کے علاوہ پتھر سے بنائے ہوئے متعدد Decoration Pieces۔۔۔۔چھوٹے بڑے ہر قسم کے۔۔۔بیٹھنے کے لئے طرح طرح کی نشستیں۔۔۔ہمارے ہاں کہیں کہیں تناور درخت کاٹ کر اس کے تنے کے حصے کو ''کوچ'' بنا لیا جاتا ہے، بالکل اسی طرح سے اور اسی سائز میں پتھر تراش کر نشست کے لئے کوچ بنائے گئے تھے۔جی چاہا بیٹھ جائیں۔۔۔پھر خیال آیا۔۔۔اس سہولت کی بھی قیمت طلب نہ کر لیں کہ یہ Commercial Society ہے۔۔۔پانی تک قیمتاً لینا پڑتا ہے۔۔۔اس اسٹور سے نکلے تو ہم پھر اسی ماحول میں آ گئے۔۔لیکن۔یہ جگہ زیادہ کشادہ تھی بالکل جنگل کا منظر۔۔۔اونچے اونچے بے ترتیب درخت۔۔۔خود رو جھاڑیاں۔۔۔طرح طرح کے پودے۔۔۔نظر اٹھا کر اوپر دیکھا تو بہت اونچائی پر جالی کی چھت بنائی

ہوئی تھی ۔۔۔۔ پرندے آزاد تھے ۔۔۔ مصنوعی آبشار ۔۔۔۔ پانی کے گرنے کی مدھر آواز ۔۔۔ کچھ اس طرح بنایا تھا کہ ہم اس ماحول میں مبہوت ہو کر رہ گئے ۔ یہاں تالاب میں ایک عجیب منظر دیکھا ۔۔۔۔ بڑی بڑی مچھلیاں پچاسوں کی تعداد میں ۔۔۔۔۔۔ ایک ساتھ ایک دائرہ بنائے چکر کاٹ رہی تھیں ۔۔۔ جیسے گرداب میں پھنس گئی ہوں ۔۔۔ ایک ترتیب سے مسلسل طواف کئے جا رہی تھیں ۔۔۔ بہت دلچسپ منظر تھا ۔۔۔ ہمارے اتنے قریب کہ ہاتھ بڑھا کر مچھلی پکڑ لیں ۔۔۔ ہم نے ایسا نہیں کیا ۔۔۔ اچھا کیا ۔۔۔ ورنہ انتظامیہ ہمارا ہاتھ پکڑ لیتی ۔ مچھلی تو پھسل کر نکل جاتی ۔۔۔ ہم دھر لئے جاتے ۔۔۔ یوں بھی یہاں کے قوانین بڑے سخت ہیں اس لئے چلتے چلتے ہم نے جو سگریٹ پی تھی ۔۔۔ وہ بہت چوکنا ہو کر پی تھی ۔۔۔ پھر دیر تک ادھ بجھے سگریٹ کے ٹکڑے کو انگلی میں دبائے رہے اور جب ایک ڈسٹ بن نظر آیا تو اس میں ہم نے وہ ٹکڑا اچھی طرح مسل کر پھینکا ۔۔۔ کیونکہ یہاں گولڈ لیف دستیاب نہیں ہے ۔۔۔ ڈسٹ بن سے سگریٹ کا ٹکڑا مل جاتا تو فوراً اندازہ کر لیتے کہ یہ پاکستانی سگریٹ ہے ۔۔۔ اور آج اس وقت صرف ہم پاکستانی سیاح اس چڑیا گھر میں آئے ہوئے ہیں ہم نے خود بہت سی فلموں میں سگریٹ کے ادھ جلے ٹکڑے کی وجہ سے مجرم کو گرفتار ہوتے دیکھا ہے ۔۔۔

آگے گئے تو مور پر نظر پڑی ۔۔۔۔ بہت سارے تھے ۔۔۔۔ ان میں اتنی ہی تعداد میں ''مورنیاں'' بھی تھیں ۔۔۔ وہاں ہمارے ہمسفر ہمیں مل گئے وہ ایک مور کے ساتھ اپنی بیگم کو کھڑا کر کے تصویر بنا رہے تھے ۔۔۔ جانے انہوں نے بیگم کے لئے مورنی کے بجائے مور کا کیوں انتخاب کیا ممکن ہے انہوں نے ایک ساتھ دو مورنیوں کی تصویریں بنانا مناسب نہ سمجھا ہو ۔۔۔۔۔ ہو سکتا ہے وہ خود اپنی تصویر مورنی کے ساتھ اتروانا چاہتے ہوں ۔۔۔۔۔'' یہاں بہت سے مور تھے خوبصورت ۔۔۔۔ دلکش ۔۔۔۔ حسین ۔۔۔۔ ہمارے آس پاس کھلے پھرتے تھے ۔ ان میں سفید مور ہمیں پسند آیا ۔۔۔ یونہی خیال آیا کہ عرصہ ہو گیا ہم نے مور کو ناچتے نہیں دیکھا ۔۔۔۔ یہاں تو آنگن بھی ٹیڑھا نہ تھا ۔۔۔۔ بالکل قدرتی ماحول تھا ۔۔۔ یقیناً وہ لمحہ ۔۔۔۔ قبولیت کا تھا ۔۔۔۔ کہ اچانک سفید مور نے پنکھ پھیلائے اور چکر لگانے لگا ۔۔۔۔ بہت اچھا لگا ۔۔۔۔ قدرت کا حسن ۔۔۔۔۔ ناقابل بیان ۔۔۔۔ راہداری کے دائیں بائیں تین فٹ دیوار ۔۔۔۔ اس کے اوپر لوہے کی گرل اور ان کے اندر ۔۔۔۔ پرندے ۔۔۔۔ آپ چاہیں تو اندر جا سکتے ہیں ۔۔۔۔ ذرا آگے بڑھے تو ۔۔۔۔ شتر مرغ ۔۔۔۔ اونٹ اور پرندے کا

سنگم۔۔۔ہمارے قد سے بڑا۔۔۔۔اونٹ سے چھوٹا۔۔۔ہمارے قریب لمبی اونچی گردن جھکائے کچھ طلب کر رہا تھا۔۔۔۔افسوس ہوا کہ ہم پرندوں کو کھلانے کے لئے کچھ لیکر نہیں آئے۔۔۔قریب کھڑے اس کے سر پر دست شفقت پھیرتے رہے۔۔۔۔اور آگے بڑھے تو ایک دروازہ پر پلاسٹک کی خوبصورت زنجیریں لٹکی ہوئیں تھیں اوپر کی چوکھٹ سے نیچے فرش تک۔۔۔چلمن کہنا زیادہ مناسب ہے۔۔۔۔چلمن ہٹائی تو خوبصورت شہزادی ہماری منتظر نہیں تھی بلکہ یہ پارک کا ایک اور حصہ تھا۔۔۔سب سے پہلے ہماری نظر ایک گائے یا بیل کے ڈھانچے پر پڑی۔۔۔۔ہفتوں پرانا بیل رگائے۔۔۔۔۔جس کے گوشت کو گدھوں اور بھیڑیوں نے بھنبھوڑ۔۔۔۔بھنبھوڑ کر۔۔۔نوچ نوچ کر۔۔۔۔کھالیا تھا۔۔۔۔اب صرف پسلیاں باقی رہ گئیں تھیں۔۔۔۔کُھر سمیت ٹانگوں کی ہڈیاں اور جبڑا پڑا تھا۔۔۔۔حیرت ہوئی۔۔۔گائے۔۔۔بیل کے پنجرے کی یہاں کیا ضرورت تھی۔۔۔؟؟ غور سے دیکھا تو کسی ماہر سنگ تراش نے پسلیوں کی ہڈیاں، جبڑا اور ٹانگیں سنگ مرمر سے اور کُھر سنگ سیاہ کی مدد سے اس قدر عمدگی اور نفاست سے تراشے تھے کہ حقیقت کا گمان ہوتا تھا۔

باہر نکلے تو ہم سونیر شاپ میں داخل ہو گئے۔جس کا ذکر ہم نے ابتدا میں کیا تھا۔یہ سونیر کی دکان کیا خاصا بڑا اسٹور تھا۔۔۔مقامی اشیاء کے علاوہ غیر ملکی مصنوعات۔۔۔گارمنٹس ،سگریٹس،شراب۔۔۔خواتین کے استعمال کی چھوٹی چھوٹی چیزیں۔۔۔اشیاء کی قیمتیں پڑھ کر بیگم جلدی باہر نکل آئیں۔اب دھوپ تیز ہوگئی تھی اور گرمی تھی۔۔۔ہم اپنی کوسٹر میں آکر بیٹھ گئے۔

☆☆☆

کالی ریت کا ساحل

کچھ دیر ہم صاف ستھری رواں سڑک پر چلتے رہے آس پاس اور دائیں بائیں وہی ماحول ۔۔۔۔۔پہاڑ ۔۔۔۔سبزہ۔۔۔۔کہیں کہیں ہوٹلیں ۔۔۔۔۔اور خالی پلاٹوں پر تعمیراتی سرگرمیاں۔۔۔۔پندرہ منٹ بعد ہم ایک عمارت کے سامنے رک گئے یہ جگہ Black Sand Beach کہلاتی ہے عام سی چھوٹی سی عمارت۔۔۔۔۔سیڑھیاں چڑھ کر ذرا اوپر گئے تو Souvenir Shop نظر آئی۔۔۔۔

یہاں داخلے کے لئے ٹکٹ نہیں تھا۔۔۔۔ہم بے دھڑک اندر چلے گئے۔۔۔۔چند قدموں کے بعد نظر اٹھائی تو سامنے تاحد نگاہ سمندر پھیلا ہوا تھا۔۔۔۔پتھروں کی ناہموار سیڑھیاں اتر کر ہم نیچے ساحل پر پہنچ گئے۔۔۔۔دائیں بائیں آس پاس کچھ بھی قابل دید نہ تھا۔۔۔۔ساحل پر پہنچ کر غور سے دیکھا تو ساحل کی نرم اور باریک ریت بالکل سیاہ تھی۔۔۔۔۔ حیرت ہوئی ہم نے دنیا کے مختلف شہروں میں بہت سے Beaches دیکھے ہیں۔۔۔۔لیکن اتنی سیاہ ریت دیکھ کر حیرت ہوئی ۔۔۔۔۔کارخانہء قدرت میں کیسی کیسی عجیب وغریب چیزیں ہیں۔۔۔۔یہ ساحل کا چھوٹا سا حصہ تھا۔۔۔۔اور ہمیں یہاں اس لئے لایا گیا تھا کہ ہم ساحل کی کالی ریت بھی دیکھ لیں Black Sand Island میں سیاحوں کی تعداد بہت زیادہ نہ تھی۔۔۔بیشتر سیاح ہماری طرح سیڑھیوں پر کھڑے۔۔۔سمندر کی پرسکون لہروں کو آتے جاتے دیکھ رہے تھے ۔۔۔۔۔۔ہم نے دائیں بائیں غور سے دیکھا ذرا دور سنہری بالوں والی دو گوریاں کالی ریت پر بے حس وحرکت اوندھے منہ لیٹی ہوئی Sun Bath لے رہی تھیں۔۔۔۔۔۔جانے کیوں مجھے سنہری بالوں والے ہلکے ہلکے سبز رنگوں کے پتوں میں ملبوس مکئی کے سٹے یاد آ گئے اور اس کے ساتھ ہی جمن چاچا کے ٹھیلے کی سگھڑی پر رکھی ہوئی کڑھائی میں گرم اور سیاہ بالو ریت میں ننگے مکئی کے دبے ہوئے سٹے بھی یاد آ گئے۔۔۔۔جمن چاچا بڑی مہارت اور پولے پولے ہاتھوں سے مکئی کے سٹوں کے سر پر اگے شانوں تک بکھرے سنہری بالوں کو الگ کرتے پھر پتوں کا ایک ایک پرت کھولتے اور اس کے اندر دودھیا دانے والے سٹوں کو باہر نکالتے اور بڑے قرینے سے کڑھائی میں رکھی گرم

ریت میں دبا دیتے۔۔۔۔۔جیسے Black Sand Island میں سنہری بالوں والی دو گوریاں کالی ریت پر دبی ہوئیں تھیں ۔۔۔۔بیگم دکانوں میں چھوٹی موٹی چیزیں خرید رہی تھیں ۔۔۔۔میں ٹہلتا ہوا ان گوریوں کے قریب پہونچا۔۔۔۔مجھے یوں لگا کہ ابھی جمن چاچا کڑھائی میں گرم بالو ریت سے مکئی کے بھنے ہوئے سٹوں کو نکالیں گے اور پتوں کی پرت میں ملبوس کر کے میری طرف بڑھاتے ہوئے کہیں گے۔۔۔۔کہ لو۔۔۔۔منے میاں۔۔۔۔سب سے پہلے تم لے لو۔۔۔۔۔تمہارے ہاتھ سے بونی ہوتی ہے تو میرے دھندے میں برکت ہو جاوے ہے۔۔۔۔جمن چاچا نے مکئی کا ننگا سٹہ مجھے کبھی نہیں دیا۔۔۔۔پھر اچانک مجھے خیال آیا کہ اگر جمن چاچا ہوتے تو ان میں ایک گوری کو کڑھائی میں بھری گرم گرم ریت سے نکال کر سٹے کے پتوں میں لپیٹ کر مجھے ضرور دیدیتے مگر ان ''سٹوں'' کو ملبوس کرنے یا ڈھانپنے کے لئے لمبے لمبے ہرے پتے اس سیاہ ریت پہ کہاں ڈھونڈتے۔۔۔۔بچپن سے کچھ ایسی عادت پڑی کہ غیر ملبوس چیزیں دل کو کبھی نہیں بھائیں۔۔۔۔میں جس طرح دبے دبے قدموں سے ان غسلِ آفتابی میں مشغول گوریوں کے قریب گیا تھا ویسے ہی لوٹ آیا۔۔۔۔۔خالی ہاتھ۔۔۔۔چونکہ مجھے غیر ملبوس چیزیں پسند نہیں۔۔۔۔میں نے آخری بار ساحل پر الوادعی نگاہ ڈالی۔۔۔چولہے کی راکھ یا سیمنٹ بلکہ اس سے بھی زیادہ کالی ریت۔۔۔۔بس یہی کچھ ہمیں دکھانے کے لئے لایا گیا تھا ۔۔۔۔۔۔۔البتہ یہاں چند دکانیں تھیں۔۔۔۔جن میں سے کسی ایک دکان پر ہماری بیگم چھوٹی موٹی چیزیں خرید رہی ہونگی۔۔۔۔میں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آیا Sales girls ابھی دکانیں کھول کر اپنا سامان سجا رہی تھیں۔۔۔بیگم یہاں ایک دکان پر خریداری کر رہی تھیں۔۔۔۔۔ہم موقعہ سے فائدہ اٹھا کر سگریٹ پینے لگے۔جبکہ ہمارے ہم سفر کافی شاپ سے کولڈ ڈرنک خرید رہے تھے۔

☆☆☆

مگر مچھ کا تماشا

ہماری گاڑی تھوڑی سی مسافت طے کر کے ایک بہت خوبصورت سی عمارت کے سامنے رک گئی۔۔کار پورچ پر ہمیں گاڑی سے اتارا اور بتایا کہ سامنے کاؤنٹر سے ٹکٹ خریدیں اور اندر چلے جائیں۔۔۔گرمی ٹھیک ٹھاک تھی۔۔۔میں ایک نوٹس بورڈ کے سامنے رک گیا۔یہاں اس فارم کی تفصیل درج تھی۔کوئی صاحب تھے ملائیشین انہوں نے برسوں پہلے مگر مچھ کی کھال Export کرنا شروع کی تھی اس کے بعد انہوں نے مگر مچھ کی افزائش شروع کی۔ان کے فارم میں اس وقت ایک ہزار سے زیادہ مگر مچھ پرورش پا رہے ہیں۔

ہم نے ٹکٹ خریدے۔۔۔بیگم اپنا کیمرہ چیک کرنے لگیں۔۔۔میں نے انہیں آواز دے کر کہا۔۔۔دیکھو۔۔۔یہاں کیا ہو رہا ہے۔

وہ تو ٹھیک ہے مگر کیمرہ کام نہیں کر رہا۔شاید اس کے Cell کمزور ہو گئے۔۔۔اسے چھوڑو۔۔۔کیونکہ یہ منظر ہم پھر کبھی نہیں دیکھ سکیں گے۔

ہمارے سامنے تقریباً چند فٹ نیچے ایک بہت بڑا احاطہ تھا۔اس کے دائیں بائیں ۔۔۔گول دائرہ میں پانی کے دو تالاب تھے دونوں تالابوں میں پانی زیادہ گہرا نہ تھا۔۔۔اور تالاب پیالہ کی طرح نہیں بلکہ Rice plate کی طرح تھے۔۔۔ہمارے سامنے دو تین میوزیشنز ایک محفوظ جگہ پر کھڑے تھے۔۔۔اور بینڈز بجا رہے تھے۔۔۔۔

دو آدمی مگر مچھوں سے ذرا دور کھڑے تھے۔ایک آدمی کے ہاتھ میں ایک لمبا بانس تھا۔۔۔۔جو لمبائی میں بہت طویل مگر۔۔۔وزن میں زیادہ نہیں ہوگا۔۔۔ہم سے پہلے بڑی تعداد میں سیاح ریلنگ کے سہارے۔۔۔ اپنے اپنے کیمرے سنبھالے کھڑے تھے۔۔۔گم صم اور خاموش۔۔۔۔ہم بھی ان میں شامل ہو گئے۔۔۔۔اب ہم نے دیکھا کہ جس آدمی کے ہاتھ میں چھڑی یا بانس تھا اس نے دور کھڑے ہو کر۔۔۔مگر مچھ کے پیٹ میں چھڑی گھوپنے کی کوشش کی۔۔۔دس فٹ لمبا اور گدھے سے زیادہ موٹا مگر مچھ جو بے حس و حرکت، چپ چاپ پڑا تھا ایکدم اچھل پڑا اسکی دم اتنی برق رفتاری سے لہرائی کہ پانی بلیوں اچھل

پڑا۔۔۔مگر مچھ کے منہ سے ایک خوفناک دھاڑ نکلی۔۔۔۔دیکھنے والے سیاح بھی پل بھر کو سہم گئے۔۔۔۔پانی کی لہریں اچھل کر تماشائیوں تک آئیں۔۔۔۔کچھ توقف کے بعد اس آدمی نے یہی عمل دہرایا۔۔۔اس بار مگر مچھ پھر اچھلا تیزی سے دم لہرائی اور پانی کی چھینٹیں تالاب کے چاروں طرف بکھر گئیں۔۔۔۔لیکن اب اس نے دھیمے دھیمے حرکت شروع کی۔۔۔۔اور رینگنے لگا۔

اتنے بڑے مگر مچھ کو نہ تو کبھی ہم نے T.V اسکرین پر دیکھا تھا اور نہ ہی اس کا فوٹو کبھی نظر سے گذرا تھا۔۔۔۔اب ہم نے اندازہ لگایا کہ یہ کوئی Show ہو رہا ہے۔۔۔۔ماسٹر نے ایک بار پھر ہلکے سے اس کی کمر میں چھڑی ماری۔۔۔۔اب کی بار وہ اچھلا نہیں بس منہ پھاڑ کر ہلکی آواز میں دھاڑا۔۔۔۔اور مزید پھسلواں تالاب سے نکل کر خشکی کی طرف رینگنے لگا۔۔۔۔ایک خاص ردھم پر بینڈ بجتا رہا یوں محسوس ہوا جیسے مگر مچھ موسیقی کی دھن میں آگے بڑھ رہا ہے۔

مگر مچھ رینگتا ہوا خشکی پر آ گیا۔ماسٹر نے اب اس کے جبڑے پر چھوٹی چھڑی سے ہلکی ہلکی تھپکی دی۔۔۔اس سے وہ بے حس و حرکت ہو گیا۔۔۔۔بینڈ کی دھن بجتی رہی۔۔۔۔مگر مچھ کا جبڑا اب تک کھلا ہوا تھا اور اس کے نوکیلے دانت اور لمبی زبان حلق تک نظر آ رہی تھی۔۔۔۔۔"

ماسٹر نے چھڑی رکھ دی اور ایک خاص آسن سے مگر مچھ کے کھلے منہ کے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔۔۔۔بینڈ کی دھن بجتی رہی۔اب ماسٹر ذرا آگے بڑھا۔۔۔اس نے ڈرتے ڈرتے اپنا ایک بازو آگے کیا۔۔۔۔تمام تماشائی سانس روکے کھڑے تھے۔۔۔فضاء میں ایک سہما ہوا سناٹا طاری تھا۔۔۔۔ماسٹر نے اپنے اٹھے ہوئے بازو کو اچانک مگر مچھ کے کھلے ہوئے جبڑے کے اوپر کے حصہ پر رکھا۔۔۔۔لمحہ بھر کو مگر مچھ میں حرکت پیدا ہوئی مگر وہ پھر ساکت ہو گیا۔۔۔اب ماسٹر نے اپنی ہتھیلی سے اس کے کھلے جبڑے پر تھپکی دی۔۔۔۔اور پھر دھیمے دھیمے اپنی ہتھیلی سے اس کے اوپری جبڑے پر دباؤ ڈالنا شروع کیا۔۔۔۔بینڈ کی آواز میں تیزی آ گئی اور چند لمحوں بعد مگر مچھ نے اپنے دونوں جبڑے بند کر لئے مگر اس کا منہ زمین سے اٹھا رہا۔۔۔۔ماسٹر نے کمال مہارت سے اپنی ہتھیلی کا دباؤ برقرار رکھا اور مگر مچھ نے اپنا منہ زمین پر ڈال دیا۔۔۔۔

تماشائیوں نے اطمینان کا سانس لیا۔۔۔۔اور بے اختیار تالیاں بجائیں اب اس کا دوسرا ساتھی مگر مچھ کے پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا۔۔۔اس کے بعد وہ آگے بڑھا اور اس کے پچھلے پیروں کو جو آگے کی طرف پھیلنے ہوئے تھے اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر پیچھے موڑ دیئے۔۔۔مگر مچھ خاموش رہا۔۔۔اس کے بعد وہ اور آگے بڑھا اپنی ٹانگیں پھیلا کر وہ مگر مچھ کے اوپر اس طرح کھڑا ہو گیا کہ مگر مچھ کو پتہ نہ چلے۔۔۔۔۔پھر وہ جھکا اور اس نے مگر مچھ کے آگے کے پیروں کو جو سامنے کی طرف لیٹے ہوئے تھے اٹھا کر۔۔۔موڑ کر پیچھے کر دیئے۔۔۔۔۔پھر وہ اچھل کر ایک طرف ہو گیا اس کے بعد وہ مگر مچھ کے پیچھے کی طرف یعنی دم کے قریب آیا۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی ہر مخلوق پر برتری اور قدرت عطا کی ہے اسی لئے انسان کے سامنے مگر مچھ ایسا طاقتور اور خطرناک جانور مردے کی طرح پڑا تھا۔اب ماسٹر نمبر ۲ بینڈ کی آواز پر اپنا توازن برقرار رکھتے ہوئے مگر مچھ کی پشت پر آیا اور سیدھا کھڑا ہو گیا دو تین گہرے گہرے سانس لئے اور اچانک اس کی دم پر کھڑا ہو گیا۔۔۔۔

اس کی دم پر پیر رکھ دیئے میں نے گھبرا کر بیگم سے کہا۔۔۔یہ کیا کر رہا ہے۔۔۔دم پر پیر رکھ دیا۔۔۔بیگم نے جواب میں کہا تو کیا ہوا۔۔۔۔؟ میں نے جواب میں سرگوشی سے کہا ارے کمزور سے کمزور آدمی کی دم پر کوئی پیر رکھ دے تو وہ بھی لڑنے مرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔۔۔یہ تو مگر مچھ ہے۔۔۔اگر یہ مگر مچھ اپنی دم کو ذرا حرکت دے تو ماسٹر پچھاڑ کھا کر اچھلتا ہوا یہاں کھڑی کسی عورت کی گود میں جا پڑے گا بھلا گود بھرائی کی رسم ایسے ماحول میں کیسے ممکن ہو سکتی ہے۔۔۔۔

آپ بھی عجیب بات سوچتے ہیں۔۔۔یہاں گود بھرائی کی کیا تک ہے۔

ٹھیک کہتی ہو ہر عورت۔۔۔۔انجیلنا جولی۔۔۔تو نہیں ہوتی۔۔۔جو بچوں کو علم سمجھ کر جہاں ملے اور، جس سے ملے۔۔۔اور جتنی ملے۔۔۔گود لے لے۔۔۔خیر صاحب عجب تھڑ دلا اور بے نیاز سا مگر مچھ تھا۔۔۔دم ہلانا تو کجا اس نے حرکت کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی۔۔۔اب ماسٹر نمبر دو کی ہمت بڑھی وہ۔۔۔ذرا جھکا۔۔۔پھر۔۔۔حالت رکوع میں گیا اور خود کو بالٹی کے ہینڈل کی شکل میں ڈھالا۔۔۔لمحہ بھر کو رکا اور پھر اپنے دونوں ہاتھ اس کی پیٹھ پر رکھ دیئے۔۔۔اس کے بعد کہنیوں کے بل جھک کر ہاتھ مزید

آگے بڑھائے اور مگرمچھ کی پیٹھ پر لیٹ گیا۔۔۔تماشائیوں کے سانس رکے ہوئے تھے ہر طرف خاموشی تھی صرف بینڈ کی آواز فضاء میں گونج رہی تھی۔۔۔کچھ دیر لیٹے رہنے کے بعد وہ کہنیوں کے بل اٹھا۔۔۔اور مگرمچھ کی پیٹھ کے قریب آیا۔۔۔اور ایک بار پھر لیٹ گیا اور لیٹے لیٹے اس نے اپنی کہنی مگرمچھ کی پیٹھ پر رکھ کے ہتھیلی پھیلائی اور اپنا کتابی چہرہ اس پر رکھ دیا مجھے یوں لگا جیسے ماسٹر نے علامہ اقبال کی مشہور زمانہ تصویر دیکھ لی ہے اور یہ انہی کی نقل کر رہا ہے۔۔۔۔۔ سیاحوں نے تصویریں اتاری۔۔۔۔اب وہ اٹھ کر مگرمچھ کی پیٹھ پر کھڑا ہو گیا۔۔۔۔یہ مظاہرہ کرنے کے بعد اس نے تماشائیوں کے سامنے جھک کر سلام کیا۔۔۔۔جیسے تماشہ ختم ہونے کے بعد فنکار حاضرین کے سامنے کورنش بجا لاتے ہیں۔۔تماشائیوں نے تالیاں بجا کر ماسٹر کو داد دی۔۔۔

اب ماسٹر نمبر ایک اٹھا۔۔مگرمچھ کے سامنے آیا۔۔۔۔۔چند لمحے سانسیں روکے کھڑا رہا۔۔۔۔پھر بینڈ کی دھن پر وہ آگے بڑھا مگرمچھ کے منہ کے بالکل قریب آیا اور ایک خاص آسن سے بیٹھ گیا۔۔۔۔پھر اس نے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں سے اس کے جبڑوں کو تھپکی دی۔۔۔مگرمچھ نے جبڑے کھولنے شروع کئے اور پھر اتنا منہ پھاڑا کہ بکری کا بچہ نہیں خود بکری آرام سے اس کے کھلے جبڑوں میں چلی جائے۔

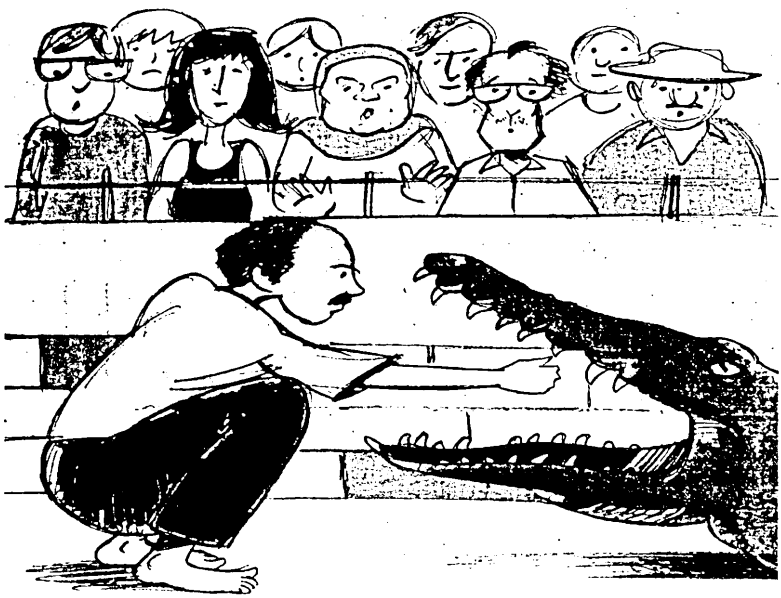

چند لمحے ماسٹر یونہی بیٹھا رہا۔۔۔جیسے یوگا کی ورزش کر رہا ہو یا مراقبہ میں بیٹھا ہو
اس کے بعد اس نے اپنا بازو ہوا میں لہرایا ۔۔۔شمشیر زن کی طرح اپنی کلائی تولی۔۔۔۔اور پھر دھیرے دھیرے۔۔۔۔ماسٹر نے اپنی ہتھیلی۔۔۔۔پھر اپنی کلائی اور اس کے بعد پورا بازو اس کے کھلے جبڑے کے اندر کر دیا۔۔۔۔۔۔ہماری سانسیں رک گئیں۔۔۔۔اس نے اپنا بازو اوپر نیچے ذرا ہلایا جیسے شمشیر زن تلوار بازی کرتا ہے۔۔۔اس کے بعد اپنا بازو مگر مچھ کے کھلے جبڑے سے باہر نکال کر فاتحانہ انداز سے اٹھ کھڑا ہوا۔۔۔۔۔ تماشائیوں کے سامنے جھکا اور ہاتھ ہلا ہلا کر کورنش بجالایا۔۔۔تماشائیوں نے بے اختیار تالیاں بجائیں۔۔۔ازاں بعد ماسٹر نے چھڑی سے اس کے جبڑے پر تھپکی دی اور مگر مچھ اپنے پیروں کو سیدھا کر کے چیونٹی کی رفتار سے رینگتا ہوا دوسرے تالاب کی طرف بڑھ گیا۔۔۔مائک سے اعلان ہوا کہ 45 منٹ کے بعد یہ شو دوبارہ شروع کیا جائیگا۔
تماشا ختم ہوا سیاح ادھر ادھر بکھر گئے اب ہم نے فارم کے بقیہ حصے دیکھے۔۔۔۔۔آٹھ آٹھ اور دس دس فٹ لمبے مگر مچھ مختلف تالابوں میں اونگ رہے تھے۔۔۔ہم آگے بڑھے یہاں پانچ پانچ چھ چھ فٹ کے مگر مچھ۔۔۔۔اس سے اور آگے آئے تو ایک تالاب میں بہت سے چھوٹے چھوٹے مگر مچھ اور اس سے آگے کے تالاب میں گرگٹ اور گلہری کے برابر۔۔۔۔یہ مگر مچھ کے چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔۔۔۔اسی فارم میں کئی دکانیں بھی تھیں۔۔۔ایک بڑا اسٹور بھی تھا خیال رہے کہ اس وقت ملائیشیا دنیا کا تیسرا بڑا ملک ہے جہاں سے دنیا کے مختلف شہروں میں مگر مچھ کی کھال اس کا گوشت اور ہڈیاں برآمد کی جاتی ہیں۔

☆☆☆

تتّا پانی

Corcodile Farm سے نکلے اب ہماری گاڑی ایک ایسی سڑک سے گزر رہی تھی جہاں سامنے ساحل سمندر تھا۔۔۔۔خیال رہے کہ لنکاوی میں درجنوں Beaches ہیں ہمارے سامنے جو Beach تھا اس کے کنارے بہت سی کشتیاں کھڑی تھیں۔۔۔اس سے ملحق ایک بڑی سی عمارت۔۔۔۔گمان غالب ہے کہ یہ لنکاوی کا ''Boat Club'' تھا۔۔۔متعدد گاڑیاں عمارت کی پارکنگ پر کھڑی تھیں۔۔۔۔گاڑیوں کے قریب ایک مینار سا بنا ہوا تھا۔۔۔۔زیادہ اونچا تھا۔۔۔۔چوکور سی ایک اونچی عمارت یقیناً یہ ''Light House'' کے طور پر استعمال ہوتی ہوگی ۔۔۔۔۔۔گاڑی آگے بڑھ گئی منظر پیچھے رہ گیا۔۔۔۔واسو۔۔۔۔اب تک ہمارے لئے ڈرائیور ہی ثابت ہوا۔۔۔۔کہ اس نے ایک تجربے کار گائیڈ کے طور پر نہ تو آس پاس کے بارے میں کچھ معلومات فراہم کی اور نہ ہی بہت سی اچھی اچھی عمارتوں کے بارے میں کچھ بتایا۔۔۔۔اب ہم ایک ایسی سڑک سے گزر رہے تھے۔۔۔کہ ہمارے ایک طرف وسیع اور کھلا سمندر اور دوسری جانب بلند پہاڑیاں۔۔۔۔۔اب سڑک بلند ہونے لگی۔۔۔۔۔اسلام آباد سے مری جاتے ہوئے راستے کی طرح ہمارے دائیں بائیں درختوں کی قطاریں۔۔۔۔۔ان میں ربڑ، لونگ، جائفل اور جاوتری کے درخت بھی ہونگے کہ یہاں مذکورہ اشیاء کثرت سے پیدا ہوتی ہیں۔۔۔

زمانہء طالبعلمی میں جغرافیہ کے مضمون میں ملایا کے بارے میں پڑھا تھا۔۔۔کہ ملایا میں ربڑ بہت پیدا ہوتا ہے۔۔۔۔خیال رہے کہ ربڑ کے درخت ایک زمانے میں صرف برازیل میں پائے جاتے تھے لیکن جانے کس طرح ملایا کا کوئی آدمی ربڑ کے درخت کے بیج یا بچے لے آیا۔۔۔۔اس نے ملایا میں ان کی آبیاری کی۔۔۔۔اور ایک وقت ایسا آیا کہ ملایا میں دنیا کا 35 فیصد ربڑ پیدا ہونے لگا۔۔۔۔ربڑ کا درخت جب چھ۔۔۔سات سال کا ہو جاتا ہے تو دودھ دینے لگتا ہے۔۔۔درخت کے تنے میں سوراخ کیا جاتا ہے اور اس کے بعد مٹی کا ایک برتن اس کی دھار کے نیچے رکھ دیا جاتا ہے اور قطرہ قطرہ دودھ اس میں ٹپکتا رہتا ہے ربر کا درخت تقریباً 30 سال بعد دودھ دینا بند کر دیتا ہے یعنی بانجھ ہو جاتا ہے۔۔۔۔اس کے بعد درخت کو کاٹ کر اس

کی لکڑی سے عمدہ فرنیچر تیار کیا جاتا ہے۔

گاڑی چلتی رہی کچھ دیر بعد ایک پرانی سی عمارت کے باہر واسو نے گاڑی روک دی اور کہا یہ Hot Water ہے۔۔۔۔۔دس منٹ میں واپس آجایئے۔۔۔۔۔میں باہر آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔۔۔۔ہم لوگ کوسٹر سے اترے۔۔۔۔یہاں بھی سوونیئرز کی چھوٹی چھوٹی کئی دکانیں تھیں مگر ہم ان پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔۔

گرم پانی کا چشمہ۔۔۔۔۔دنیا کے بہت سے شہروں میں سیاحوں کی توجہ کا مرکز ہوتا ہے۔۔۔۔مقامی لوگ بھی اس سے مستفید ہوتے ہیں۔۔۔۔ہر علاقے اور مذہب کے لوگ گرم پانی کے چشمے کے بارے میں مختلف عقائد رکھتے ہیں۔۔۔۔کراچی میں منگھو پیر مزار کے قریب گرم پانی کا چشمہ ہے میں نے 20، 25 سال پہلے دیکھا تھا۔۔۔۔گرم پانی کا چشمہ کیا۔۔۔۔ایک گندا سا تالاب ہے اس میں ایک چشمے سے گرم پانی نکلتا رہتا ہے۔۔۔۔۔تالاب بھر جاتا ہے تو پانی ادھر ادھر پھیل جاتا ہے روزانہ بہت سے عقیدت مند یہاں آتے ہیں اور اس گرم پانی سے نہاتے ہیں۔۔۔۔ان کا عقیدہ ہے کہ تالاب میں نہانے سے پھوڑے پھنسی اور جلد کی بہت سی بیماریاں ختم ہو جاتی ہیں۔۔۔۔منگھو پیر کے چشمے کے بارے میں اور بہت سی روایات مشہور ہیں۔

گلگت اور چیلاس کے درمیان ایک مقام ہے ''تتا پانی''۔۔۔۔۔یہ 20 سال پرانی بات ہے ان دنوں میں وزیر اعظم محمد خان جونیجو کا ''Speech Writer'' تھا اس وقت کے وفاقی وزیر برائے پیٹرولیم حاجی حنیف طیب کی ہدایت پر مجھے ایک تقریب میں تقریر کرنے کے لئے گلگت جانا پڑا۔۔۔۔۔واپسی پر سڑک کے کنارے ایک لکڑی کی بلی پر ایک تختہ لگا ہوا تھا جس پر لکھا تھا ''تتا پانی'' ہم نے گاڑی روکی۔۔۔۔مشکور قادری، چوہدری محمد اسلم اور عطاالمصطفیٰ نوری شاید میرے ساتھ تھے۔۔۔۔۔گلگت سے روانہ ہوئے کافی وقت ہو چکا تھا چائے کی طلب شدت سے محسوس ہو رہی تھی لیکن راستے میں ہمیں کوئی ہوٹل نظر نہیں آیا۔۔۔۔ایک دو جھگی نما ہوٹلوں پر نظر پڑی۔۔۔۔مگر وہاں پر پلنگ کھڑے ہوئے تھے اور بینچیں الٹی پڑی تھیں۔۔۔۔ہم نے اندازہ لگایا کہ یہاں رمضان کا چاند نظر آ گیا اس لئے یہ ہوٹلیں بند ہیں۔۔۔۔حالانکہ صبح سویرے روانگی سے پہلے ہم نے اس تصدیق کے بعد ناشتہ کیا تھا کہ رمضان کا چاند نظر نہیں آیا۔۔۔۔۔تتا پانی کا بورڈ دیکھ کر ہم رک گئے۔۔۔۔گاڑی سے اترے۔۔۔سڑک کے کنارے ایک پہاڑی ٹیلے سے پانی آبشار کی صورت گر رہا تھا۔۔۔سر اٹھا کر اوپر دیکھا تو پہاڑ کی اونچی سطح پر دودھیا دھواں اٹھ رہا

تھا۔۔۔۔شاید اس جگہ گندھک کا ذخیرہ ہے اور پانی وہیں سے نیچے گر رہا تھا۔۔۔۔زمین پر گرتا ہوا پانی اپنا راستہ بناتا ہوا سڑک اور پہاڑ کے درمیان ایک نالی میں دور تک بہہ رہا تھا ۔۔۔۔ہم اس کے قریب پہنچے تو ہمیں تپش کا احساس ہوا۔۔۔۔میں نے یونہی بے خیالی میں پانی کی دھار کے نیچے ہاتھ بڑھایا۔۔۔۔۔اونٹتا ہوا پانی۔۔۔۔جلدی سے میں نے ہاتھ کھینچ لیا۔۔۔شاہراہ ریشم کے کنارے Hot Water یعنی تتا پانی کے بارے میں کسی سیاح کو کچھ معلوم نہیں کیونکہ محکمہ سیاحت نے کبھی اس طرف توجہ ہی نہیں دی۔۔۔مجھے یاد آیا 1990 میں ہم Sandiago سے Los Angeles واپس آرہے تھے کہ راستے میں Hot water کا مقام آیا ہم نے وہاں ٹھہر کر اس کے قریب ایک ریستوران میں کافی پی تھی۔۔۔۔۔۔۔وہاں بھی سیاح رکتے ہیں لنکاوی میں ہمیں Hot water دکھانے کے لئے لایا گیا تھا۔۔۔۔۔ یہاں پر ایک کشادہ رقبہ پر پرانی اینٹوں کا ایک احاطہ سا بنا تھا اس میں چند درخت ایستادہ تھے۔۔۔۔درختوں کے درمیان ایک چھوٹی سی ''ہودی'' بنی ہوئی تھی یعنی عام سائز کے ایک کمرے کے برابر ایک فٹ کی دیوار اٹھائی گئی تھی۔۔۔اس پر سیمنٹ کا پلاسٹر کیا ہوا تھا۔۔۔۔ اسی ہودی ٹنکی یا حوض میں۔۔۔۔ہوا کی ہلکی ہلکی تھپکی سے شفاف پانی ہلکورے لے رہا تھا ۔۔۔۔تالاب لبالب بھرا پڑا تھا اور دیوار کے ایک نچلے حصے سے بہتا ہوا پانی ایک پکی نالی سے گزر کر نامعلوم مقام کی طرف رواں تھا۔۔۔پانی کی سطح پر بلبلے سے اٹھ رہے تھے۔۔۔۔اور نظر آرہا تھا کہ چشمے سے پانی پھوٹ رہا تھا۔۔۔ہم نے آگے بڑھ کر پانی میں انگلی ڈبوئی اور فوراً نکال لی ۔۔۔گو اتنا گرم نہیں تھا ۔۔۔۔جتنا شاہراہ ریشم کے کنارے تتا پانی کے مقام پر۔۔۔۔مجھے اب تک یاد ہے وہاں تو کھولتا ہوا پانی تھا۔۔۔۔۔۔۔دیر تک انگلی میں سوزش ہوتی رہی۔۔۔۔چشمے کے گرم پانی کے آس پاس درجن بھر پلاسٹک کی بالٹیاں اور ڈول بے ترتیبی سے پڑے ہوئے تھے۔۔۔۔بالٹیوں کے ساتھ پلاسٹک کے ڈونگے بھی تھے۔۔۔۔بالکل ہمارے یہاں باتھ روم میں استعمال ہونے والی بالٹی اور ڈونگے کی طرح۔۔۔۔معلوم ہوا کہ یہاں سیاح اور مقامی لوگ آتے ہیں اور بالٹی میں پانی بھر کر ڈول کی مدد سے نہاتے ہیں ان کا عقیدہ ہے کہ اس پانی کے استعمال سے جسم میں Energy بڑھتی ہے۔

میری انگلی میں اب بھی ہلکی ہلکی سوزش ہو رہی تھی۔۔۔مجھے یوں ہی خیال آیا کہ انگلی اٹھانا ۔انگشت نمائی کرنا، انگلی ڈالنا اور انگلی ۔۔۔۔۔۔۔۔ہمارا قومی مزاج ہے۔۔۔۔۔۔ٹیڑھی انگلی

سے گھی نکالنا محاورہ ضرور ہے مگر اس کا بھی ہم جا بے جا استعمال کرتے رہتے ہیں۔۔۔۔ہم نے کبھی سوچا ہی نہیں علیحدہ علیحدہ انگلیوں سے مذکورہ فضول حرکتیں ہماری ناکامیوں کی وجوہات میں سے ایک وجہ ہے۔۔۔حیرت ہے ہمیں یہ خیال کیوں نہیں آتا کہ ہاتھ کی یہ پانچ انگلیاں ہمارے پانچ قبیلوں اور پانچ زبانوں کی علامت ہیں۔۔۔۔ہماری تاریخ میں ان انگلیوں کو جوڑ کر صرف لیاقت علی خان نے مکا بنایا تھا اس کے بعد سے ہم نے انگلیوں کو ملا کر مکا بنانے کی روش کو ترک کر دیا۔۔۔ہم دوسروں کے خلاف الزام تراشی، اشتعال دلانے اور کسی کی بے توقیری کے لئے انگشت نمائی کرتے رہتے ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ علیحدہ علیحدہ انگلیوں کا یہ استعمال ہم اپنے لئے تو جائز سمجھتے ہیں اور دوسرے کے اسی عمل کی مذمت کرتے رہتے ہیں۔۔۔ہمیں صرف کرکٹ میچ میں مخالف ٹیم کے خلاف ایمپائر کی اٹھی ہوئی انگلی پسند ہے۔۔۔۔کاش ہم ایک ایک انگلی سے الگ الگ منفی کام لینے کے بجائے انہیں ملا کر۔۔۔۔جوڑ کر۔۔۔۔مٹھی بند کر لیں اور مکا بنا لیں تو دنیا کی کوئی قوم ہم پر انگلی اٹھانے کی جرات نہیں کر سکتی۔۔۔ہم قبیلوں سے قوم بنے ہی نہیں۔۔۔۔نتیجے کے طور پر امریکہ تو خیر بڑی قوت ہے افغانستان جیسا بے یارو مددگار اور انتہائی محدود وسائل رکھنے والا ملک بھی ہم پر غرانے لگا ہے یعنی انگلی اُٹھانے لگا ہے۔۔۔انگشت نمائی کرنے لگا ہے۔۔۔کیونکہ ہمیں تو ایک دوسرے پر انگلی اٹھانے۔۔۔۔انگشت نمائی کرنے سے ہی فرصت نہیں۔۔۔۔ہم جانے کب انگلیوں کو جوڑ کر ایک مضبوط مکا بنائیں گے اور اندرونی اور بیرونی دشمنوں کے دانت کھٹے کریں گے۔۔۔۔کب۔۔۔۔؟؟؟

میری انگلی میں سوزش اب کم ہو گئی تھی اور یہ سوچ کر مجھ میں ایک نئی توانائی محسوس ہو رہی تھی کہ ہم جلد یا بدیر مکا بن جائیں گے۔۔۔اب جانیں یہ انرجی گرم پانی میں انگلی بھیگونے سے پیدا ہوئی یا میرے یقین سے۔۔۔۔۔۔

واپسی پر فراز میاں ہم سے الگ تھلگ اپنی نو بیاہتا بیگم کے ساتھ سرگوشیوں میں مصروف تھے۔۔۔۔کچھ دیر بعد ہم سے باتیں کرنے لگے۔۔۔۔پوچھنے لگے رضوان صاحب فلاں فلاں جگہ دیکھی ہیں۔

جواب دیا!!۔۔۔بھائی ہم کل ہی لنکاوی پہونچے ہیں اور جہاں جہاں آپ کے ساتھ گھومے وہی کچھ دیکھا ہے

کہنے لگے!!انکل آپ اسکوٹر لے لیں کرایہ پر مل جاتے ہیں ہوٹل کے سامنے ہی

Rent A Car کا شوروم ہے۔۔۔۔۔

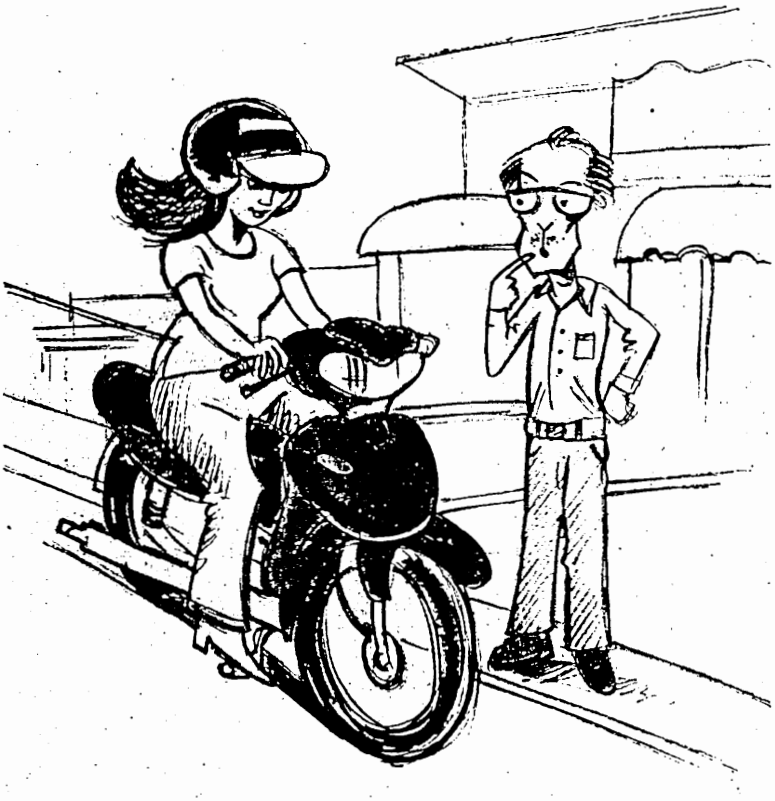

فراز میاں موٹر سائیکل چلائے ایک عرصہ ہو گیا اب عادت نہیں رہی اور سچ پوچھو تو عمر بھی نہیں رہی۔۔۔

فراز نے جواب دیا انکل!۔۔۔۔۔۔ یہاں ہیلمٹ پہننا ضروری ہے ڈرائیور اور سواری دونوں کے لئے۔۔۔۔۔۔۔۔ آپ لوگ تو ماشاء اللہ اسمارٹ ہیں۔۔۔۔۔ ہیلمٹ پہن کر عمر کا پتہ تھوڑی چلے گا۔۔۔۔۔ فراز میاں رضوان صاحب سے انکل پر اتر آئے۔۔۔

اصل میں اسکوٹر چلانے کا Risk نہیں لینا چاہتے تھے۔۔۔۔۔ یوں بھی بیگم کی جان ہم خطرے میں نہیں ڈال سکتے اور وہ بھی پردیس میں۔۔۔۔۔ اسلئے ہم نے اس تجویز کو رد کر دیا

انکل آپ گاڑی تو چلاتے ہیں ناں

ہم نے اثبات میں جواب دیا۔۔۔

بولے کہ کار Hire کرلیں زیادہ مہنگی بھی نہیں یہاں صاف ستھری سڑکیں ہیں ۔۔۔چند گھنٹوں میں پورا لنکاوی دیکھ لیں گے۔۔۔ہم نے بھی کل یہی کیا تھا

تجویز تو بری نہیں۔۔۔ہم نے سوچتے ہوئے کہا

آپ کی نظریں ٹھیک نہیں ہیں۔۔اجنبی راستوں میں آپ کو مشکل ہوگی۔۔بیگم نے کہا

اب ہم نے شکایتی نظروں سے بیگم کی طرف دیکھا اور سوچا کہ 43 سال کی شریک مشکلات وشریک خوشگوار لمحات کو بھی ہماری نگاہوں پر شبہ ہے۔۔۔

بیگم بولیں میرا مطلب ہے کہ آپ کی Eyeside کمزور ہے اگر خدانہ کرے کچھ ہوگیا تو علاج شاید سرکاری اسپتال میں ہوجائے مگر گاڑی کو جو نقصان ہوگا اس کے تو پیسے دینے پڑیں گے اور وہ بھی ٹھیک ٹھاک۔۔۔۔آپ نے پہلے ہی پاکٹ منی کم دی ہے ابھی تو بچوں کے لئے بھی میں نے کچھ نہیں خریدا۔۔

ہم نے بیگم کی بات نظر انداز کرتے ہوئے فراز میاں سے پوچھا عقابوں کا نشیمن اور Pregnant Lady دیکھی ہے۔۔۔

بولے نہیں۔۔۔۔۔

ہم نے کہا۔۔۔تو پھر ہمارے ساتھ چلیں۔۔۔ہم نے تین بجے والا Tour بھی لیا ہے۔

فراز میاں کی بیگم پہلی بار بولیں۔۔۔۔۔اور کیا کیا ہے اس Tour میں

میں نے کہا کشتی کا سفر ہے۔۔۔۔یہ لوگ مختلف جزیروں میں لے جائیں گے

سچ !!!!۔۔۔۔۔فراز پروگرام بنالیں۔۔۔مجھے کشتی میں سفر کرنے کا بڑا شوق ہے۔۔۔فراز کی بیگم خوش ہوگئیں

آپ لوگ کیسے جائیں گے۔۔۔فراز نے پوچھا

اسی گاڑی سے AOS کے ذریعہ۔۔۔

اگر ارادہ ہے تو ہوٹل پہنچ کر بات کرلیں استقبالیہ کے قریب ہی AOS کا دفتر ہے یہاں ماریہ ہوتی ہیں۔۔۔انہوں نے ہی ہمارے Tour کا بندوبست کیا ہے۔۔۔چلو بھئی ہمارا آپ کا ساتھ رہے گا اور تمہاری بیگم بھی خوش ہوجائیں گی۔۔،

یہ سن کر بیگم نے خشمگی نگاہوں سے ہمیں دیکھا اور کہنے لگیں ۔۔۔۔اب شاید ممکن نہ ہو۔۔۔کیونکہ ماریہ نے ہمارے لئے بھی بڑی مشکل سے دو سیٹوں کا بندوبست کیا تھا۔۔۔۔

فراز! پلیز چلیں۔۔۔بات کر کے دیکھیں۔۔۔ان کی بیگم نے اصرار کیا۔۔۔

ہاں ہاں!!! کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔

بیگم نے ہماری پسلی میں کہنی ماری ۔۔۔۔اور منہ پھیر کر شیشے کی کھڑکی سے گزرتے مناظر دیکھتیں رہیں ۔۔۔اب جس راستے سے ہم گزر رہے تھے وہ بالکل مری کے راستے جیسا تھا۔۔۔بل کھاتی سڑک ۔۔۔دونوں طرف درختوں کا ہجوم ۔۔۔۔اور اتنا ہجوم کہ فرش پر مٹی نظر نہ آئے ۔۔۔۔سبزہ ہی سبزہ ۔۔۔۔یہاں ایسے درخت بھی دیکھے جن کے تنوں پر گھاس یا بیلیں لپٹی ہوئی تھیں ۔۔۔۔کہیں کہیں سڑک کے آس پاس ہم نے بندروں کو اچھلتے کودتے دیکھا

ہم اب ہوٹل کی طرف جا رہے تھے ڈرائیور نے واپسی کے لئے مختلف راستہ اختیار کیا تھا۔۔۔کافی دیر ہم بلندی کی طرف چڑھتے رہے ۔۔۔پھر نشیب کی طرف گاڑی اترنے لگی ۔۔۔کچھ دیر بعد مری کے راستے کا تصور ختم ہو گیا۔۔۔اب سڑک ایک میدان کے درمیان سے گزر رہی تھی ۔۔۔۔۔پہاڑ اور ان پر لگے ہوئے درختوں کے جھنڈ ہم سے کئی کلومیٹر دور چلے گئے ۔۔۔۔راستے میں کہیں کہیں عمارتوں کا تعمیراتی کام جاری تھا۔۔۔

سفر ختم ہوا گاڑی ہوٹل کے پورچ پر رک گئی۔۔۔چاروں مسافر اترے۔۔۔سب نے واسو کا شکریہ ادا کیا۔۔۔ہم نے فراز اور ان کی بیگم کو خدا حافظ کہا ۔۔۔۔کمرے میں آئے ۔۔۔۔اور صوفے پر دھنس گئے۔

کھانے کا کیا کریں۔۔۔بیگم نے پوچھا

بالکل بھوک نہیں ہے ۔۔۔ہم نے ناشتہ ٹھیک ٹھاک کیا تھا۔۔۔تفریحی مقامات میں آنے والے سیاح عام طور پر ہوٹل میں ناشتہ خوب ڈٹ کر کرتے ہیں کہ ناشتہ ہوٹل کے کرائے میں شامل ہوتا ہے اور بہت وافر مقدار میں ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ اکثر سیاح دوپہر کا کھانا گول کر جاتے ہیں یا پھر ہلکی پھلکی چیزوں پر گزارا کرتے ہیں۔

بیگم کو کچھ یاد آیا اور بے اختیار کہے لگیں کل ہم Mini mart سے ڈبل روٹی اور مکھن لائے تھے آپ کی پسند کی ٹکیاں بھی ہیں اور بسکٹس بھی ہیں ۔۔۔کیوں نہ ہم مکھن لگا کر دو دو سلائس کھالیں۔۔۔آپ یوں کریں چائے کا پانی رکھیں میں باقی چیزیں نکالتی ہوں۔۔

مکھن لگانے کا ہنر آپ کو خوب آتا ہے لیکن ساری عمر اس کام کے لئے ڈبل روٹی کے

سلائس کو آپ نے ہم پر ترجیح دی۔۔۔۔حالانکہ ہم کو یاد ہے کہ کئی مواقع ایسے آئے کہ اس کام کے لئے آپ کو ہمارا انتخاب کرنا چاہیئے تھا۔۔۔۔خیر اب وقت گزر گیا

یوں تو نہ کہیئے۔۔۔۔کوئی بات ہو جاتی ہے تو میں ہی آپ کو مناتی ہوں۔۔۔بیگم نے سلائس پر مکھن لگاتے ہوئے کہا۔

جانے دو اس بات کو بیگم۔۔۔۔۔میاں بیوی کے درمیان تعلقات بین الاقوامی موضوع ہے۔۔۔اس پر بحث کرنے سے حاصل کچھ نہیں ہوگا۔۔

اچھا جناب یہ سلائس لیں ٹکیاں پلیٹ میں رکھی ہیں۔۔۔آپ سے کہا تھا کہ چائے کا پانی رکھ دیں مگر آپ کسی کام میں میرا ہاتھ نہیں بٹاتے۔۔

بحث کا وقت نہیں ہے۔۔۔ہمیں آدھے گھنٹے بعد لوبی میں پہونچنا ہے۔۔۔بہتر یہی ہے کہ ہم ظہر کی نماز ادا کرلیں۔۔۔میں نے ٹکیاں کھاتے ہوئے کہا۔۔۔۔

بالکل صحیح کہہ رہے ہیں آپ۔۔۔۔میں وضو کرنے جاتی ہوں آپ میرے لئے بھی چائے بنادیں۔

☆☆☆

سمندر میں میٹھا پانی

وقت مقررہ پر گاڑی آ گئی ۔۔۔۔۔۔۔۔ڈرائیور نے جانے اپنا نام کیا بتایا، بہرحال ہم دونوں گاڑی میں بیٹھ کر نئے سفر پر روانہ ہو گئے۔

ایک ساحل کے کنارے گاڑی نے ہمیں اتار دیا۔ڈرائیور نے ایک اور صاحب کے سپرد کر دیا۔۔۔۔وہ ہمیں لیکر ایک پلیٹ فارم تک آیا۔۔۔۔ہمارے سامنے کھلا سمندر تھا اور پلیٹ فارم کے ساتھ کئی کشتیاں کھڑی تھیں۔۔۔۔ہمیں مایوسی ہوئی۔۔۔۔یہ ایسی کشتیاں نہیں تھیں جن کے بارے میں ہم سوچ رہے تھے۔۔۔۔انہیں Boats کہا جاتا ہے۔۔۔تمام کشتیاں ایک ہی سائز کی تھیں۔۔۔۔کشتی کے دائیں بائیں لکڑی کے تختوں پر فوم کی نشستیں بنائی ہوئی تھیں۔۔۔۔تین۔۔۔لمبی نشستیں اور تھیں اور آگے ڈرائیورنگ سیٹ۔۔۔جس پر ناخدا یا مانجھی کو بیٹھنا تھا۔۔۔۔ہمارے علاوہ چار فیملیز ۔۔۔۔تین کے ہمراہ مختلف عمر کے بچے تھے ۔۔۔۔ایک ''نوجوان جاپانی جوڑا'' تھا۔۔۔۔جائز یا ناجائز یہ ہمیں اندازہ نہیں ہوا۔۔۔۔ایک لیبیا کی فیملی تھی۔۔۔۔بچوں کی ماں نے حجاب پہنا ہوا تھا۔۔۔ایک اور فیملی بھی کسی مسلم ملک کی تھی دوپٹہ سے سر اور سینہ ڈھکا ہوا تھا۔۔۔۔ایک مغربی ملک کی فیملی تھی۔۔۔مسافروں نے ایک دوسرے کو مسکرا کر دیکھا۔۔۔۔اور اپنی اپنی پسند کی نشستوں پر بیٹھ گئے۔

کشتی پر مسافروں کو سوار کرانے کے لئے کشتی کو پلیٹ فارم کے بالکل قریب لایا گیا تھا ۔۔۔ہچکولے کھاتی ہوئی کشتی پر ہم ایک دوسرے کا سہارا لیکر چڑھے تھے۔۔۔۔بچے اور تمام خواتین ڈری ڈری سہمی سہمی ہوئی تھیں، سوائے اس جاپانی نوعمر لڑکی کے جس کے ساتھ ایک لانبے قد کا دبلا پتلا نوجوان تھا۔۔۔۔اپنے قد وقامت کے اعتبار سے تو وہ جاپانی نہیں لگتا تھا۔۔۔مگر شکل وصورت، مچی مچی آنکھیں اور رنگ وروپ سے وہ جاپانی معلوم ہوتا تھا۔۔۔ہوسکتا ہے کہ وہ جاپان کا عالم چنہ ہو۔۔

ہمیں ڈرائیور نے جس شخص کے سپرد کیا تھا۔۔۔۔وہی دراصل کشتی کا ناخدا تھا۔۔۔بیگم کو ہم نے کشتی کے درمیان جو لمبی نشست تھی اس پر بٹھایا اور ہم کشتی کے ایک طرف اس طرح بیٹھے کہ

سمندر میں ہاتھ ڈال کر پانی کو چھو لیں۔۔۔بچوں کو ماؤں نے اپنے قریب کر لیا۔۔۔انجن اسٹارٹ ہوا۔اور دھیرے دھیرے کشتی نے اپنا سفر شروع کیا۔۔۔تھوڑی سی دیر میں کشتی نے تیز رفتاری کے ساتھ دوڑنا شروع کر دیا۔۔۔۔ کے دونوں طرف لوہے کے اونچے پائپ لگے ہوئے تھے اور ان پر پینا فلیکس کا پردہ چھت کے طور پر کسا ہوا تھا۔

کشتی کی رفتار تیز ہوئی۔۔۔دل دھڑکنے لگا۔۔۔۔۔۔کشتی کی تیز رفتاری کی وجہ سے ہوا بھی آندھی محسوس ہو رہی تھی۔۔۔ہمارے بال تو ہلکی ہوا کے ایک جھونکے لائق بھی نہ تھے لیکن جن کے بال گھنے اور لمبے تھے۔۔۔ان کے بھی بال سر پر چپک کر رہ گئے تھے۔خواتین نے دوپٹہ یا مفلر سر پر اچھی طرح لپیٹ لیا۔۔۔اپنی عینک کی زیادہ فکر تھی۔۔۔چند منٹ بعد مسافروں کے چہروں سے خوف کے آثار ختم ہو گئے اور اب ان کی نگاہوں میں تجسس اور حیرتوں کی کیفیت نمایاں تھی۔۔۔کشتی کی اسپیڈ کیا تھی اس کا اندازہ تو نہیں لیکن ہر 30 سیکنڈ کے بعد یوں لگتا تھا کہ ہم اچانک کسی اسپیڈ بریکر سے گذر رہے ہیں۔۔۔کشتی کے نیچے سے آوازیں بھی ایسی آ رہی تھیں جن سے خوف محسوس ہوتا تھا۔۔۔سمندر پر سکون تھا۔۔۔کشتی پانی چیرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی اور دائیں بائیں پانی کی لہریں اچھل رہی تھیں کبھی کبھی کوئی چھینٹا مسافروں پر آن گرتا تھا۔۔۔

اب ہم نے آس پاس کا جائزہ لیا تو محسوس کیا کہ یہ کوئی کھلا سمندر نہیں ہے بلکہ ہمارے چاروں طرف اونچے اونچے پہاڑ ہیں۔۔۔۔۔چھوٹے بھی اور بڑے بھی۔۔۔۔یہ دراصل غیر آباد جزیرے تھے۔۔۔۔کشتی کو دائیں بائیں ہو کر ان جزیروں کے پاس سے گذرنا پڑتا تھا۔۔۔دو بار محسوس ہوا کہ کشتی سامنے کی چٹان یا جزیرے سے ٹکرانے والی ہے لیکن ناخدا نے کمال مہارت سے کشتی کا رخ موڑ دیا۔۔۔ایک دو جزیروں کے ہم بالکل قریب سے گذرے ۔۔۔ہمیں یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ یہ جزیرے، ٹیلے یا۔سنگلاخ چٹانیں ہیں۔۔۔سمندر کے پانی نے ان چٹانوں کو آبی سطح پر اس طرح کاٹ دیا تھا کہ بنیاد تنگ ہو گئی تھی۔۔۔حیرت کی بات یہ تھی کہ ٹھوس چٹانوں پر مشتمل یہ جزیرے درختوں سے اٹے ہوئے تھے۔۔۔وہ درخت تھے کہ خود رو جھاڑیاں مگر۔۔۔دور سے دیکھنے میں مکمل سرسبز نظر آتے تھے۔۔۔مٹی۔۔۔پتھر۔۔۔یا خشک جگہ نام کو نہیں تھی۔۔۔ٹھوس چٹانیں بھی ہم اس لئے کہہ رہے ہیں کہ پانی کی سطح پر جو حصہ کٹ رہا تھا اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ سنگلاخ چٹانیں ہیں ورنہ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ تھا۔۔۔اور

کناروں پر گہری کائی جمی ہوئی تھی ۔۔۔۔اب ہمارے سامنے ذرا دور ایک Beach کا منظر تھا۔۔۔جہاں چند کشتیاں کھڑی تھیں۔۔۔دو چار چھوٹی چھوٹی Huts۔۔۔بہت سے لوگ ساحل پر نظر آرہے تھے ہم سمجھے یہ ہماری منزل ہے لیکن ہماری کشتی راستہ بدل کر آگے بڑھ گئی۔۔۔عجب نظارہ تھا۔۔۔پر لطف تجربہ تھا۔۔۔سمندر اور جزیرے۔۔۔جزیرے اور سمندر۔۔۔20,25 منٹ کے بعد کشتی کی رفتار کم ہوگئی۔۔۔اسپیڈ بریکرز کی وجہ سے جو جھٹکے لگ رہے تھے وہ بھی ختم ہوگئے تھے۔۔۔پھر کشتی دھیرے دھیرے ساحل کے قریب رک گئی۔۔۔یہاں ایک پلیٹ فارم بنا ہوا تھا۔۔۔اس کے ساتھ سیڑھیاں تھیں جو ایک Pedestrian Bridge تک جارہی تھیں۔۔۔ہم کشتی سے رسے کا سہارا لیکر اترے 30-40 فٹ کا پل (بڑے شہروں میں پیدل چلنے والوں کے لئے جس طرح کا پل بنایا جاتا ہے) ۔۔۔اس کے بعد پھر اترنے کے لئے سیڑھیاں کشتی میں جو ''لائف جیکٹ'' بہت محفوظ اور آرام دہ محسوس ہو رہی تھی۔۔۔وہ اب گراں گزرنے لگی۔۔۔تمام مسافر ساحل سے اترے۔۔۔یہاں کوئی اور سیاح نہیں تھا۔۔۔لیکن چار پانچ Boats قطار میں کھڑی ہوئی تھیں ۔۔۔ذرا آگے بڑھے تو ہمیں Shades نظر آئے ۔۔۔ایک چھوٹی سی دکان تھی۔۔۔کولڈ ڈرنکس اور کھانے پینے کی چند چیزیں وہاں موجود تھیں برابر میں Washroom بھی تھا ۔۔۔دکان کے سامنے دو بڑے بڑے لکڑی کی مدد سے بنائے گئے کمرے تھے۔۔۔وہاں لکڑی کی مضبوط بینچیں پڑی تھیں۔۔۔مسافروں نے پہلے اپنے جیکٹ کھولے ان کا خاصا وزن ہوتا ہے۔۔۔ساتھ لیکر چلنا بھی دشوار۔۔۔کولڈ ڈرنکس کی دکان پر ایک نوعمر ملایے لڑکی۔۔۔پورا لباس پہنے ہوئے۔۔۔بیگم نے اس سے کہا کہ جیکٹ ہم یہاں رکھ دیں ۔۔۔اس نے خوش دلی سے مسکرا کر جیکٹ بیگم سے لے لی باقی مسافروں نے بھی یہی کیا۔۔۔وہ مسکراتی ہوئی جیکٹس سنبھالتی رہی۔۔۔یہاں پر لکڑی کے تنوں کو کاٹ کر بیٹھنے کے لئے نشستیں بنائی گئی تھیں ہمیں Fresh water lake دیکھنے جانا تھا جو سامنے پہاڑ کے اس پار ہے یہاں پہلے تو ہم ستانے بیٹھ گئے۔کوئی زیادہ سفر نہیں کیا تھا لیکن کشتی کے سفر نے بقول کسی کے انجر پنجر ڈھیلے کر دیئے تھے۔۔۔ہم نے اپنے اطراف کا جائزہ لیا تو ایک گھنا جنگل تھا۔۔۔سامنے بلندی کی طرف جانے کے لئے ایک راستہ تھا۔۔۔سیڑھیاں کیا بڑے بڑے بے ترتیب Steps تھے۔ہو کا عالم۔۔۔بہت اوپر تک پہاڑوں پر درختوں کے جھنڈ

۔۔۔سمندر پر دھوپ تھی مگر ہم جہاں بیٹھے تھے وہاں درختوں کی چھت سی بن گئی تھی ایک کرن کا گذر بھی ممکن نہ تھا۔۔۔اچھا خاصا اندھیرا تھا۔۔۔بیگم نے نکیاں اوبسکٹ نکالے۔۔۔ہم نے بوتل سے پانی پیا اور بلندی پر چڑھنا شروع کر دیا۔۔۔پیچدار راستہ۔۔۔ہم اوپر چڑھتے رہے۔۔۔پھر ہمیں ایک بندر نظر آیا۔۔۔دوسرا۔۔۔تیسرا۔۔۔نظر اٹھا کر درختوں پر دیکھا تو ان گنت بندر۔۔۔اس شاخ سے اس شاخ پر کچھ ہمارے ساتھ ساتھ۔۔۔شروع میں تو ڈر لگا۔۔۔لیکن ملائیشیا کے لوگوں اور موسم کی طرح بندر بھی Friendly تھے۔۔۔یہاں نوٹس بورڈ پر درج تھا کہ ''بندروں کو کچھ کھانے کو نہ دیں''۔۔۔ہمارا جی چاہا کہ نوٹس پر درج ہدایت کو نظر انداز کر کے ان بندروں کو پاکستانی بسکٹ پیش کریں۔۔۔ڈارون کے بقول یہ ہمارے جدِ اعلیٰ ہیں۔۔۔اب بھی انکی رنگت کی مغربی گوریاں ہمارے یہاں ''بندریاں'' ہی کہلاتی ہیں، بندر بہت سے کام بالکل انسانوں کی طرح کرتے ہیں۔۔خاص کر بالوں سے جوں نکالنے کا طریقہ جو آج بھی ہمارے دیہی علاقوں میں رائج ہے۔۔۔فرق صرف اتنا ہے کہ بندر جوں نکال کر کھا جاتا ہے، ہماری بڑی بوڑھیاں، جوں پکڑ کر اپنے انگوٹھے کے ناخن پر رکھتی ہیں اور دوسرے ہاتھ کے انگوٹھے سے کچل دیتی ہیں۔جبکہ اول الذکر کا دوسرا مصرف اہم دستاویزات اور شناختی کارڈ پر انگوٹھا لگانا ہے غیر تعلیم یافتہ خواتین کو تو یہ بھی پتہ نہیں ہوتا کہ ان کے مرد کس کاغذ پر انگوٹھے کا نشان لے رہے ہیں ایک انگوٹھے کا دکھانا بھی ہوتا ہے۔۔۔ٹھینگا۔۔۔مگر یہ چڑانے یا اشتعال دلانے کے لئے استعمال ہوتا ہے جبکہ مسکرا کر انگوٹھا دکھانا خوشی یا کامیابی کے اظہار کی علامت سمجھا جاتا ہے۔۔۔ہاں یاد آیا انگوٹھے زور آزمائی کے لیے بھی استعمال کئے جاتے ہیں۔۔۔مگر بندر انگوٹھا نہیں صرف انگوٹھے کے ناخن کو جوں مارنے کے لئے استعمال کرتا ہے۔۔۔اب آپ کہیں گے جناب جوں نکالنے کے طریقے کی مشابہت پر بندر کو اپنا جدِ اعلیٰ کیوں سمجھیں۔۔۔تو بھائی مونگ پھلی سے لیکر سنگترے تک ہر پھل وہ آپ سے زیادہ سلیقہ اور قرینہ سے کھاتا ہے شاید آپ کو یہ اعتراض ہو کہ انسان بندر کی طرح درختوں پر نہیں چڑھ سکتا۔۔۔اصل میں یہ اعتراض بھی آپ کی کم علمی پر دلالت کرتا ہے۔۔۔سری لنکا۔۔۔بنگلا دیش۔اور یہاں یعنی ملائیشیا میں دیکھئے کہ انسان کس طرح، پام اور ناریل کے درختوں پر اچھل اچھل کر چڑھتا ہے۔۔۔یہ کمال اور مہارت بھی بندر نے ہی تو آپ کو سکھائی ہے۔۔۔خیر ہم نے بندروں کی کوئی خدمت نہیں کی۔۔۔بسکٹ کھلانے اور نکیاں پیش کرنے کا خیال دل ہی میں رہ گیا یہاں کے قوانین بہت

سخت ہیں۔۔۔۔۔۔بندر تو نکیاں اور بسکٹ لیکر چلے جاتے لیکن اگر ہم ہدایت کی خلاف ورزی کرتے پکڑے جاتے تو اس پردیس میں کوئی ضمانتی بھی نہیں ملتا۔

سیمنٹ کی پرانی اور ادھڑے ہوئے پلاسٹر کی لمبی لمبی سیڑھیوں پر ہم چڑھتے رہے۔۔۔۔سیڑھیوں کے دائیں بائیں خشک لکڑیاں۔۔۔۔پتے۔۔۔سوکھے ہوئے جنگلی پھل اور گھاس پھونس بکھری پڑی تھی۔۔۔۔پلاسٹک کی تھیلی۔۔۔۔کولڈ ڈرنک کاٹن شاپنگ بیگ یا سگریٹ کی ڈبیا ہمیں یہاں نظر نہیں آئیں۔

بہت تھک گئے تھے۔۔۔۔کمر، ٹانگوں سے علیحدہ محسوس ہو رہی تھی مگر ہم بندروں کی اچھل کود کو دیکھتے ہوئے چڑھتے رہے۔۔۔۔دائیں بائیں ایسے درخت بھی دیکھے جنکی جڑیں، پلنگ کی پائنتی کی رسی کی طرح تھیں اور پچاس پچاس فٹ لمبی یہ جڑیں درختوں کی موٹی موٹی شاخوں میں لپٹ کر لمبے اژدھوں کی طرح لٹک رہی تھیں۔۔۔۔چڑھتے چڑھتے ہم ایک ہموار زمین تک پہنچے۔۔۔۔یہاں سے نیچے نظر ڈالی تو حیران رہ گئے۔۔۔۔پہاڑوں کے نیچے ساحل پر ایک میلا لگا ہوا تھا۔۔۔۔سیاحوں کی بڑی تعداد موجود تھی۔۔۔۔سمندر میں چھوٹی چھوٹی کشتیاں جنہیں Jet Ski کہا جاتا ہے وہ دوڑتی پھر رہی تھیں۔ایک کشتی کے پیچھے اسی سے بندھی ہوئی Banana boat جس پر چھ سات افراد بیٹھے سمندر کی سطح پر دوڑ رہے تھے۔۔۔۔پہلی بار دیکھا تھا یہ منظر بہت اچھا لگا، ہمت بڑھی۔۔۔نشیب کی طرف نگاہ ڈالی تو ذرا گھبرائے۔۔۔سینکڑوں فٹ نیچے اترنا تو مشکل نہیں لیکن۔۔۔۔واپس آنے کے لئے اتنا ہی دوبارہ اوپر چڑھنا ہوگا۔۔۔۔سچ بات ہے شوق کا کوئی مول نہیں۔۔۔۔اوکھلی میں سر دیا تو موصل سے کیا ڈر۔۔۔۔ہم سیڑھیوں کے ساتھ لگی ہوئی ریلنگ کا سہارا لیتے ہوئے نشیب کی طرف اترنے لگے۔۔۔۔بے ترتیب اور اونچی نیچی سیڑھیاں تھیں۔اترتے وقت بھی احتیاط ضروری تھی۔۔۔۔ہم نیچے جا رہے تھے اور بہت سے سیاح اوپر کی طرف چڑھ رہے تھے۔۔۔۔غالباً یہ وہ لوگ ہیں جن کی کشتیاں سمندر کے کنارے Park تھیں۔۔''

خاصی دیر لگی ہمیں نیچے اترنے میں۔۔۔لیکن ہمیں ساحل کی مٹی پر نہیں چلنا پڑا کہ مضبوط لکڑیوں کے تختوں سے پلیٹ فارم تک جانے کے لئے چھوٹا سا راستہ بنایا ہوا تھا۔پلیٹ فارم بھی لکڑیوں کا تھا اور نہایت صاف ستھرا۔۔۔خاصا کشادہ پلیٹ فارم تھا اس کے درمیان ایک حصہ خالی چھوڑ دیا تھا جہاں پانی تھا۔۔۔اور ایک حصہ کی طرف اسکوٹر کی سائز کی Solar Boats اور

Pedal boats کھڑی تھیں انہی میں کی بہت سی چھوٹی چھوٹی کشتیاں سمندر کی سطح پر چکر کاٹ رہی تھیں ۔۔۔۔۔پلیٹ فارم کے ایک طرف سونیر شاپ بھی تھی جس میں ہلکی پھلکی کھانے پینے کی چیزیں موجود تھیں ۔۔اور مقامی دستکاری کی اشیاء بھی موجود تھیں ۔۔ پہلے میں نے اپنے اور بیگم کے لئے کولڈ ڈرنک کے دو ٹن لئے ۔۔۔۔ہم آلتی پالتی مار کر لکڑی کے پلیٹ فارم پر بیٹھ گئے ۔۔۔۔ایک بار پھر جگالی کے لئے بیگم نے پاکستانی بسکٹ اور '' ہوم میڈ '' ٹکیاں نکالیں ۔۔۔۔اب غور سے آس پاس کا جائزہ لیا ۔۔۔۔سیڑھیوں پر ہمیں چینی سیاحوں کا ایک گروپ ملا تھا ۔۔۔۔بال بھیگے ہوئے ۔۔۔۔کندھوں پر تولیہ ۔۔۔۔بعض کے ہاتھوں میں پلاسٹک کے تھیلے اور لڑکیوں کے کندھوں پر Begs لٹک رہ تھے ان لوگوں کے ساتھ ننھے ننھے پیارے بچے بھی تھے ۔۔۔۔چار پانچ سال کے بچے ۔۔۔۔۔۔میں سوچنے لگا کہ یہ اوپر تک کیسے جائیں گے ۔۔۔۔لیکن ان کے چہروں پر تھکن کے آثار یا کرتوت کی پھٹکار کی بجائے خوشیوں کی بہار ۔۔۔۔لہجوں میں پیار اور ہونٹوں پر قہقہوں کی جھنکار تھی ۔۔۔۔اور ان کی باتوں سے اپنائیت کی خوشگوار مہکار پھوٹ رہی تھی اور چال میں تھکن کے آثار نہیں اعتماد کا اظہار ہوتا تھا ۔۔ٹک شاپ کے قریب ساحل کی ریت پر جاپانی لڑکے ،لڑکیوں کی ایک ٹولی فٹ بال سے کھیل رہی تھی ۔ان میں بعض فٹ بال پکڑنے کے لئے پانی میں بھی چلے جاتے تھے ۔

ہم جہاں بیٹھے تھے اس کے تین طرف دیوار کی طرح بلند و بالا پہاڑ تھے اگر فضاء سے تصویریں لی جائے تو یہ حصہ ایک اسٹیڈیم کی مانند تھا ایک گول دائرہ کی طرح جیسے کرکٹ کا گراؤنڈ ہوتا ہے سمندر کا یہ حصہ اسٹیڈیم سے ذرا چھوٹا تھا ۔۔۔۔بس ایک طرف پہاڑوں کے درمیان سے سمندر آگے کی طرف جا رہا تھا ۔۔۔۔جب ہم پہاڑوں کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے ہماری مراد درختوں سے اٹے ہوئے پہاڑ ۔۔۔۔لیکن مکمل سبزہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ گھنے جنگل کا حصہ معلوم ہوتا تھا ۔

دنیا بھر کے سیاح صرف نشیب میں سمندر کے تین طرف سے بند حصہ کو دیکھنے نہیں آئے بلکہ یہ دیکھنے آتے ہیں کہ یہاں سمندر کا پانی میٹھا ہوتا ہے ۔حیرت کی بات ہے ۔۔دنیا کے کسی بھی حصہ میں سمندر کا پانی میٹھا نہیں ہوتا ۔۔۔۔لیکن یہاں ہے ۔بیگم نے پلیٹ فارم پر بیٹھے بیٹھے ذرا جھک کر چلو بھر پانی لیکر چکھا ۔۔۔بالکل تازہ ،صاف اور میٹھا پانی ۔۔۔پانی پیا نہیں کہ نگاہوں کے سامنے اس میں لوگ نہا رہے تھے ۔۔۔۔

ہم نے سوچا کہ یہ سمندر کا حصہ ہے۔۔۔ ہمارے سیدھے ہاتھ کی طرف سمندر ہی سے یہ پانی یہاں آکر جمع ہوا ہے اور رواں دواں ہے۔۔۔ سمندر کے نمکین پانی کو شکر ملا کر میٹھا بھی نہیں کیا جا سکتا۔۔۔ پھر یہ کیونکر میٹھا ہے، پھر دل نے کہا کہ یہ انسان کا کام نہیں۔۔۔ اللہ تعالیٰ کا کام ہے جو ہر شے پر قادر ہے۔

شام ڈھلتی جا رہی تھی۔۔۔ درختوں کی شاخوں پر بندر، پھلوں کی طرح لٹک رہے تھے، کولڈ ڈرنک ختم کی اور ہم اٹھ گئے۔۔۔ بیگم نے ٹک شاپ پر موجود ایک لڑکے سے پوچھا کیا تم یہیں رہتے ہو۔۔۔ ان نے انکار میں سر ہلایا۔۔۔ اور جواب دیا کہ۔۔۔ شام کو ہم سیاحوں کے آخری گروپ کے ساتھ دکان بند کر کے چلے جاتے ہیں اور صبح نیا سامان لیکر پہلی کشتی سے واپس آجاتے ہیں ایک ایک کر کے سارے لوگ ہی واپسی کی تیاری کر رہے تھے۔۔۔ ٹک شاپ کے ساتھ ہی ایک نوٹس بورڈ لگا ہوا تھا۔۔۔ اس میں Solar Boat کا کرایہ 30 رنگٹ اور Pedal Boat کا کرایہ بھی شاید اتنا ہی تھا۔۔۔ Banana Boat کو قریب سے دیکھا۔۔۔ یہ کیلے کی شکل کا تقریباً دس بارہ فٹ پلاسٹک یا ربر کی کشتی تھی جس میں ہوا بھری جاتی تھی۔۔۔ لوگ ٹانگیں پھیلا کر گھوڑ سواروں کی طرح ایک دوسرے کے پیچھے بیٹھ جاتے ہیں۔۔۔ پیر رکھنے کے لئے نچلا حصہ ذرا چوڑا تھا۔۔۔ Banana Boat کو رسی کی مدد سے Solar Boat کے ساتھ باندھ دیا جاتا ہے۔۔۔ چھوٹی کشتی چلتی ہے تو Banana Boat اس کے پیچھے دوڑتی ہے۔ سواریاں، خوش ہوتی ہیں، چیختی چلاتی ہیں۔۔۔ اور دس منٹ بعد ہنستی، مسکراتی، چہلیں کرتی اتر آتی ہیں۔

ہمارے سامنے پہاڑوں کے درمیان ایک تنگ سے راستے میں آگے جا کر ایک اور حیرت انگیز چیز ہے۔۔۔ اور وہ ہے دنیا کا ایک عجوبہ۔۔۔ ہم نے قریب سے نہیں دیکھا اگر کشتی پر بیٹھ کر جاتے تو دیکھتے کہ ایک مقام پر آمنے سامنے کے پہاڑوں سے دو چٹانیں اس طرح آگے نکلی ہوئی ہیں کہ ایک عام آدمی بھی دوڑ کر ایک پہاڑ سے دوسرے پہاڑ پر جا سکتا ہے۔۔۔ یہ عام آدمی یقیناً ہماری آپ کی طرح نہیں۔۔۔ بلکہ۔۔۔ بلکہ بہت بہادر۔۔۔ خطرہ مول لینے والا اور زندگی ہارنے کا جذبہ رکھنے والا ہوتا ہے۔۔۔ اس لئے ہم اسے دیکھنے نہیں گئے کہ وہاں تک جائیں اور پہاڑ کے ایک طرف کھڑے ہو کر دوسرے پہاڑ پر چھلانگ نہ لگا سکیں تو کیا فائدہ۔۔۔۔۔!

یہاں شام کے سائے گہرے ہوگئے تھے حالانکہ ابھی شام ہونے میں کافی دیر باقی تھی۔۔۔۔۔۔ بیشتر لوگ واپس جا رہے تھے ہم بھی واپسی کے لئے سیڑھیوں پر چڑھنے لگے۔۔۔سیاحوں کے قدموں اور سانس پھولنے کی آواز کے علاوہ کوئی آواز نہیں تھی۔۔۔۔مکمل خاموشی۔۔۔۔مہیب سناٹا۔۔۔چاروں اور جنگل کی مہکار۔۔۔درختوں اور جنگلی پھولوں کی ملی جلی خوشبو ۔۔۔۔عجیب سماں تھا۔۔۔۔حیرت انگیز پر سکون فضاء ۔۔۔۔ہلکے ہلکے خوف کا ماحول۔۔۔۔مگر بہت اچھا لگ رہا تھا۔۔۔بیگم نے گہرے گہرے سانس لیکر سکوت توڑا۔۔۔ رات یہاں کوئی انسان تنہا تو نہیں رہ سکتا۔۔۔

تنہا کیا مطلب۔۔۔دو چار مل کر بھی نہیں رہ سکتے۔۔۔۔آس پاس کہیں بیٹھنے تک کی جگہ نہیں ہے۔۔۔ان سیڑھیوں کے دائیں بائیں جھاڑ جھنکار کے علاوہ اور ہے کیا میں نے جواب دیا۔

ہوسکتا ہے بندروں کے علاوہ یہاں اور بھی خطرناک جانور ہوں۔بیگم نے پوچھا!

مشکل ہے۔۔۔۔اگر یہاں خطرناک جانور ہوتے تو حکومت عام سیاحوں کو یہاں آنے کی اجازت نہ دیتی۔۔۔

آپ ٹھیک کہتے ہیں۔یہ لوگ سیاحوں کو سہولتیں مہیا کرنے کے لئے جس قدر اہتمام کرتے ہیں اور احتیاط برتتے ہیں وہ قابل تعریف ہے۔۔۔

ہم چڑھتے رہے۔۔۔چڑھتے رہے۔۔۔۔بندروں کی رفاقت میں ہانپتے کانپتے فراز کے آخری حصہ تک جا پہنچے۔۔۔اب ہمیں یہاں سے سمندر نظر آرہا تھا۔لیکن ابھی ہمیں یہاں سے ایک بار پھر سیڑھیوں کی مدد سے نیچے اترنا تھا۔۔۔

ایک ایک کر کے ہماری کشتی کے سارے مسافر نیچے Shed میں جمع ہوگئے۔نک شاپ کی Sales girl سے ہم نے اپنی جیکٹس واپس مانگی۔۔۔وہ بھی ہماری منتظر تھیں کیونکہ اس نے اپنی دکان کے دروازے بند کر کے تالے لگا دیئے تھے۔۔۔۔بیگم نے کہا کہ اس لڑکی کو کچھ رنگٹ دے دیں۔۔۔جیب میں ہاتھ ڈالا۔۔۔۔دس رنگٹ کا نوٹ انگلیوں کی گرفت میں تھا۔۔۔۔پھر خیال آیا کہ یہ ملایئے لڑکی اس بات کو پسند نہیں کرے گی۔۔۔۔بس ایک جھجک سی محسوس ہوئی۔۔۔۔دیں یا نا دیں۔۔۔۔اس بات کا ہم فیصلہ نہیں کر سکے۔۔۔۔انگلیوں کی گرفت سے دس رنگٹ کا نوٹ آزاد ہو گیا۔۔۔۔ہاتھ باہر نکل آیا۔۔۔۔لڑکی نے بائی کیا اور روانہ

ہوگئی۔۔۔ہم نے خالی ہاتھ ہلا کر اسے خدا کے سپرد کیا۔۔۔ہماری کشتی کے مسافر جمع ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے۔۔۔نرم ساحلی ریت پر ربر کے جوتوں سے ہم نے تھوڑا سا فاصلہ طے کیا۔۔۔اور پل کی طرف جانے والی سیڑھیوں پر باقی ساتھیوں کے انتظار میں بیٹھ گئے۔

ہمارے قریب ایک بورڈ پر لکھا تھا Jeo Forest Park۔۔۔یہاں ایک پگوڈا بنا ہوا ہے۔۔۔جو بند تھا۔۔۔ہم جن سیڑھیوں پر بیٹھے تھے وہاں ہماری نظروں کے بالکل سامنے۔۔۔پہاڑ سے موٹی موٹی دھار کی صورت پانی کی لڑیاں گر رہی تھیں، یہاں پہاڑوں پر برف نہیں ہوتی۔۔۔یہ پانی کسی چشمہ سے ابل کر آ رہا ہے یا بارش کا جمع پانی اپنا راستہ بناتا ہوا چھوٹے چھوٹے آبشار کی صورت نیچے گر رہا تھا۔۔۔ایسا ہی منظر تھا جیسے ہمارے شمالی علاقہ جات اور سرحد کے پہاڑی علاقہ جات میں ہوتا ہے۔۔۔تمام مسافر جمع ہو گئے۔۔ہم نے سیڑھیوں پر بیٹھے بیٹھے لائف جیکٹس پہن لی تھیں۔۔۔ایک ایک کر کے تمام ساتھی مسافر Pedestrian Bridge پار کر کے سیڑھیوں سے نیچے اترے اور ہلتی، کانپتی اور ڈولتی کشتی پر سوار ہو گئے۔۔کھلا سمندر دائیں بائیں آگے پیچھے پہاڑی ٹیلے۔یا پہاڑیاں۔۔۔کشتی نے اپنی رفتار تیز کی اور ہم ایک اور انجانی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔۔۔تیز رفتار کشتی سے پھر وہی خوفناک آوازیں نکلنے لگیں جیسے وہ ٹوٹی پھوٹی آبی سڑک سے گذر رہی ہے۔۔دس پندرہ منٹ کے سفر کے بعد کھلے سمندر میں کشتی کی رفتار سست ہو گئی۔۔۔یوں محسوس ہوا جیسے ویران راستے میں گاڑی خراب

ہوگئی۔۔اور واقعی یہ ہوا کہ کشتی روک دی گئی۔۔۔مسافروں نے مڑ مڑ کر ناخدا کی جانب تشویش بھری نظروں سے دیکھا۔ ناخدا اپنی ڈرائیونگ سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا۔۔۔۔دیکھئے! اپنے دائیں طرف اس نے ہاتھ کے اشارے سے مسافروں کی توجہ مبذول کرائی۔۔۔یہ Pregnant lady hill ہے۔۔دنیا کا ایک عجوبہ۔۔۔۔قدرت کا نادر شاہکار۔۔۔۔

تمام مسافروں نے اُنگلی کے اٹھے ہوئے ہاتھ کی جانب ایک پہاڑی کی طرف دیکھا۔۔۔۔غور کیا۔۔۔سوچا۔۔۔۔اور حیرت زدہ رہ گئے۔۔۔۔ہزاروں فیٹ لمبی پہاڑی پر ایک حاملہ عورت لیٹی ہوئی تھی۔۔۔۔خاموش، چپ چاپ۔۔۔۔بے حس و حرکت۔۔۔آپ یقین جانئے کہ پہاڑی کی ہیت ایسی تھی کہ وہ بالکل ایک حاملہ عورت کی طرح دکھائی دیتی تھی۔

عورت کا چہرہ۔۔۔۔نافرمان اولاد کو دکھی ماں پریشان ہو کر کہتی ہے اپنا دودھ نہیں بخشونگی۔اسی نا بخشنے والی چیز کا ''نعمت کدہ'' اس کے بعد اوپر اٹھا ہوا شکم مادر۔۔۔۔پھر لمبی لمبی سیدھی پھیلی ہوئی دو ٹانگیں اور اس کے بعد آسمان کی طرف اٹھے ہوئے دونوں پیر۔۔۔۔ہر زاویئے سے دیکھا ہزاروں فیٹ لمبی، آرام اور سکون سے لیٹی ہوئی بچے کو جنم دینے والی ماں مسافروں کو حیرت زدہ کئے ہوئے تھی۔۔۔۔درختوں سے ڈھکی ہوئی چٹان۔۔۔۔بالکل حاملہ عورت کی طرح۔۔۔۔اونٹ کے کوہان سے ملتے جلتے تو اکثر پہاڑ ہوتے ہیں۔۔۔۔ان کے نشیب و فراز مختلف قسم کی شکلیں بناتے ہیں۔۔۔۔لیکن یہ واقعی Pregnant Lady Hill تھی۔۔۔۔سیاحوں نے اپنے کیمروں میں یہ منظر محفوظ کیا۔۔۔ہمارا کیمرہ خراب ہو گیا تھا لیکن ماریہ نے اپنی البم سے ہمیں جو تصویر دکھائی تھی۔۔۔۔یہ بالکل اسکی اصل تھی۔۔۔پانچ منٹ بعد کشتی کا انجن پھر اسٹارٹ ہوا کشتی نے رخ موڑا اور اب ہم اگلی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

سفید ریت کا ساحل

سمندر میں کشتی ہچکولے کھاتی ہوئی تیز رفتاری سے چلتی رہی۔۔۔سمندر کے آس پاس چھوٹے چھوٹے جزیرے گذرتے رہے۔۔۔پھر دور سے ہم نے سمندر کے کنارے کچھ کشتیاں کھڑی دیکھیں۔۔۔۔ذرا قریب گئے تو۔۔۔۔لوگوں کا ہجوم نظر آیا۔۔۔اس کے بعد ویسا ہی ایک پلیٹ فارم اور اس کے ساتھ پیدل چلنے والوں کے لئے راہداری۔۔۔کشتی کی رفتار سست ہوگئی۔۔۔انجن بند ہوا اور کشتی پلیٹ فارم کے قریب پہنچ گئی۔۔۔ناخدا۔۔۔اپنی ڈرائیونگ سیٹ کی پچھلی سمت آیا اور کشتی میں بندھی رسی لیکر ساحل میں کود پڑا۔۔۔رسی کھینچ کر اس نے ایک ستون سے باندھی۔۔۔اور مسافروں نے اترنا شروع کیا۔۔۔پانی میں ڈگمگاتی کشتی۔۔۔سنبھل سنبھل کر تمام مسافر کشتی سے اتر گئے۔۔۔

آدھے گھنٹے بعد آپ لوگ واپس آجایئے۔۔۔ناخدا نے ہدایت کی اور کشتی کو لیکر ذرا فاصلے پر چلا گیا جہاں بہت سی کشتیاں کھڑی تھیں دو تین منٹ کے بعد ہم پل سے گذر کر سیڑھیوں سے نیچے اترے۔۔۔یہاں سیاحوں کی ایک بڑی تعداد پہلے سے موجود تھی۔۔۔دو تین ''ڈرائیور ہوٹلیں'' جیسے ہمارے ہاں نیشنل ہائی وے پر ہوتی ہیں۔۔۔

چینی لڑکے لڑکیوں کا ایک گروپ یہاں موجود تھا۔۔۔سب نے مختصر سا لباس پہن رکھا تھا مگر Swimming Dress میں کوئی نہ تھا۔۔۔یہ لوگ یہاں بھی فٹ بال اچھال رہے تھے۔۔۔ساحل دور تک پھیلا ہوا تھا۔۔۔موسم قدرے بہتر تھا۔۔۔اگر خنکی نہیں تو گرمی بھی نہیں تھی۔۔۔۔آس پاس غور کیا تو ہمارے چاروں طرف سینکڑوں بندر تھے۔۔۔یہاں قریب ہی ایک بورڈ پر لکھا تھا کہ اپنے سامان کا خیال رکھیں خاص کر خواتین اپنے بیگز کی حفاظت کریں۔

ہم خود کو بندروں کے بیچ محسوس کر کے غیر محفوظ سمجھ رہے تھے اور آس پاس کا جائزہ لے رہے تھے۔۔۔ہوٹل کے باہر ٹوٹی پھوٹی کرسیاں پڑی تھیں۔۔۔سالخوردہ لکڑیوں کے تختوں کے دو چار تخت بھی بچھے ہوئے تھے ہم دونوں نے ایک تخت پر بیٹھ کر گہرے گہرے سانس

لئے ۔۔۔بیگم کندھے سے اپنا پرس اتارنے لگی تھیں کہ ایک بندر آیا اور جھپٹ کر پرس کھینچ لیا۔۔۔۔خوش قسمتی سے پرس کی بیلٹ بیگم کے کندھوں میں اٹکی ہوئی تھی۔۔۔۔بندر نے کھینچنے کی کوشش کی مگر پرس کی بیلٹ بیگم کے ہاتھ میں آ گئی اس لئے وہ اچکا بندر پرس کو چھیننے میں کامیاب نہیں ہوا۔۔۔۔میں نے بے اختیار آواز نکالی تو وہ منہ چڑاتا ہوا درخت کی ٹہنی پر جا بیٹھا ۔۔۔۔بیگم خوفزدہ ہوگئیں۔۔۔۔لیکن ہم نے دیکھا کہ چینی لڑکے لڑکیاں کولڈ ڈرنک کے نیم خالی ٹن بندروں کی طرف اچھالتے اور بندر اچھے فیلڈر کی طرح کیچ پکڑ لیتے۔۔۔۔پھر ہم انسانوں کی طرح ٹن میں بچے ہوئے جوس یا کولڈ ڈرنک کو پینے میں مشغول ہو جاتے۔۔۔۔بیگم شروع میں سہم سی گئیں تھیں مگر پھر بندروں کی حرکتوں سے لطف اندوز ہونے لگیں۔۔۔۔خیال رہے کہ یہاں نوٹس بورڈ پر لکھا ہوا تھا کہ ساحل پر پلاسٹک کی تھیلی لانے سے گریز کریں کہ یہ بندروں کو attract کرتی ہیں۔۔۔۔ساحل سے زیادہ ہم بندروں کی حرکتوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

ہمیں خیال آیا کہ کراچی میں تو یہ چھینا جھپٹی عام ہے۔۔۔۔آئے دن سینکڑوں موبائل۔۔۔کاریں۔۔۔پرس۔۔۔۔بٹوے اور زیورات، جرائم پیشہ افراد چھین کر لے جاتے ہیں انہی حالات سے جان چھڑا کر ہم ایک محفوظ ملک میں آئے تھے جہاں جرائم کی شرح بہت کم ہے۔۔۔۔مذکورہ نوعیت کے جرائم یہاں بہت کم ہوتے ہیں۔لیکن بندروں کی یہ حرکت دیکھ کر خوف محسوس ہوا اور خیال آیا کہ ملائیشیا میں بھی یہ جرائم عام ہیں۔۔۔یہ کام یہاں کی مافیا۔۔۔اپنے لوگوں سے نہیں بندروں سے کراتی ہے۔۔۔۔بیگم کو یہ سوچ سوچ کر خوف محسوس ہو رہا تھا کہ اگر بندران کا پرس چھین کر غائب ہو جاتا تو ہمارا پردیس میں کیا حال ہوتا کہ ہمارے پاسپورٹ، جہاز کے ٹکٹ اگلے شہروں میں ہوٹل کی بکنگ کے کاغذات اور تمام امریکی ڈالر یعنی کل زادسفر اسی پرس میں تھا۔۔۔ایسے واقعات کے خلاف پاکستان میں رپورٹ درج کرانے یا پرچہ کٹوانے کا طریقہ موجود ہے۔۔۔چوری کا سامان تو ملتا نہیں۔۔۔۔بہت بڑی سفارش کے نتیجہ میں سامان مل بھی جائے تو مال مسروقہ پولیس سے وصول کرنے میں اتنی مشکلات کہ آدمی قانون کے محافظوں پر چار حرف بھیج کر چپ ہو جاتا ہے۔۔۔بندر اگر پرس اچک کر بھاگ جاتا تو ان کی فرض شناس پولیس بھی کیا مدد کر سکتی تھی۔۔۔۔

چونکہ پرس پر بندر کا جھپٹنا۔۔۔۔ساحل پر اترتے ہی پیش آیا تھا یعنی سر منڈھاتے ہی اولے پڑے تھے۔۔۔۔اس لئے اپنے حواس بحال کرنے میں وقت لگا اب ہمیں خیال آیا کہ اس

بیچ کا نام White sand beach کیوں ہے۔۔۔۔ساحل کی ریت پر نظر ڈالی تو حیرت ہوئی۔۔۔۔کیونکہ یہاں ساحلی ریت بالکل سفید ابرق کی طرح۔۔۔۔۔ہم نے ساحل کی ریت سے مٹھی بھری تو لگا جیسے سفید باریک شکر یا عمدہ قسم کی سوجی۔۔۔۔میدہ کی طرح باریک نہیں تھی بلکہ سوجی کی طرح ڈڑی ڈڑی تھی ۔۔۔۔ہاتھ لگاؤ تو خوف آئے کہ ریت میلی نہ ہو جائے۔۔۔۔۔۔چند میل کے فاصلے پر۔۔۔کالی ریت کا ساحل۔۔۔۔اور یہاں سفید ریت کا ساحل۔۔۔۔!!

سمندر کی لہریں دوستانہ تھیں۔۔۔۔بہت سے لوگ پیراکی کے لباس میں سمندر کے کنارے نہا رہے تھے۔۔۔۔کچھ محتاط سیاح بھیگی ریت پر کھڑے تھے کہ پانی کی لہر ان کی ٹانگوں کو بھگو کر واپس چلی جاتی تھی۔۔۔۔پائنچے چڑھانے کا سوال ہی نہیں کہ سب نے Jeans پہن رکھی تھی۔۔۔۔تنگ Jeans کو ٹانگوں میں چڑھا کر پہننا مشکل اور پھر اسے اتارنا اس سے کہیں زیادہ مشکل۔۔۔اسی مشکل سے بچنے کے لئے Jeans استعمال کرنے والے اسے اتارنے کی زحمت نہیں کرتے۔۔

ہماری کشتی کے بیشتر مسافر ہماری طرح دور کھڑے چھوٹی چھوٹی کشتیوں کو دوڑتے دیکھتے رہے۔۔۔البتہ وہ ایک دس کے ہندسہ کے مشابہہ چینی جوڑا جو ہمارے ساتھ تھا۔۔۔۔اور ہجوم سے ذرا دور تھا انہوں نے کپڑے اتار کر پیراکی کا لباس پہنا ہوا تھا۔۔۔۔یہ عمل کب سرانجام پایا بخدا ہمیں علم نہیں لیکن ہم نے کشتی سے اترتے وقت بچشم خود انہیں ناقابل اعتراض لباس میں دیکھا تھا۔پیراکی کے لباس میں وہ کب اور کہاں سے نمودار ہوئے یہ ہمیں معلوم نہیں۔

اس کے شوہر یا، بوائے فرینڈ نے اپنی گوری کو زندہ درگور کرنے کے لئے اس کے دودھیا بدن پر سفید گیلی ریت بچھا دی تھی۔۔۔۔گوری کی معمولی حرکت، خواہشوں کے محل کو چکنا چور کر دیتی یعنی ریت گورے بدن سے پھسل پھسل جاتی۔۔۔۔ریت تو کیا اس کے بدن سے تو نظریں پھسل رہی تھیں۔۔۔کافی دیر تک محبوب نے محبوبہ کو جیتے جی ریت کی گود میں سلانا چاہا۔مگر کامیاب نہ ہو سکا۔۔۔وہ دونوں یوں ہی چہلیں کرتے رہے۔۔۔۔کشتی کے باقی مسافر ایک ایک کر کے سیڑھیوں سے پل کی طرف بڑھنے لگے۔۔۔۔بندر مسافروں کے ساتھ چل رہے تھے۔۔۔۔اتنے بندر تھے جتنے نواحی بستیوں کی گلیوں میں کتوں کی فوج ظفر موج۔۔۔۔موٹر سائیکل یا پیدل مسافر کی پذیرائی کے لئے موجود ہوتی ہے۔۔۔لیکن حیرت ہے کہ ایک بندر بھی

اس نیم عریاں جوڑے کی طرف نہیں گیا۔۔۔ بلکہ کسی بھی بندر نے درخت کی کسی شاخ سے چھپ کر بھی انہیں بری نظر سے نہیں دیکھا سچ بات یہ ہے کہ بڑے نیک اور شرمیلے بندر تھے۔۔۔ آخر ان کی اپنی بھی کچھ اخلاقی قدریں ہیں۔۔۔ ورنہ ''گوری بندریا'' کو یوں لباس سے آزاد دیکھ کر بھلا کون بندر نظر انداز کر سکتا ہے۔۔۔ حیرت تو ہمیں اس بات پر ہوئی کہ سینکڑوں بندر ادھر ادھر منڈلا رہے تھے۔۔۔ مگر کسی ایک نے بھی ان کے کپڑے اور بیگ جو قریب ہی خشک سفید ریت پہ پڑے تھے اچکنے کی کوشش نہیں کی۔۔۔ ان کے لباس کو چھوڑیئے بندروں نے تو گوری کے بے لباس پنڈے کو بھی دیکھنا گوارا نہیں کیا۔۔۔ حالانکہ ساحل پر موجود اکثر مسافر اسی جوڑی کو تک رہے تھے۔۔۔۔۔۔ سچ ہے کہ کیریکٹر بھی تو کوئی چیز ہے۔۔۔۔

کشتی پر بیٹھ کر بھی ہمیں اس جوڑے کا انتظار کرنا پڑا۔ ذرا دیر پہلے ایک فیملی جس میں بچوں کی والدہ حجاب پہنے ہوئے تھی کشتی میں سوار ہوئے۔۔۔ پہلی بار کسی نے کشتی پر قدم رکھتے وقت بآواز بلند اسلام وعلیکم کہا۔۔۔ مجھ سمیت دو چار مسافروں نے وعلیکم اسلام کہہ کر سلامتی کی دعا دی۔۔۔ وہ جب اپنی نشست پر بیٹھ گئے۔۔۔ تو میں نے ان سے پوچھا آپ کس ملک سے ہیں۔

لیبیا۔۔۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا

ہم پاکستانی ہیں۔۔۔ میں نے اپنا تعارف کرایا۔ اور پھر کہا کہ لیبیا کے کرنل قذافی اور ذوالفقار علی بھٹو کے درمیان بہت دوستی تھی۔۔۔ پاکستانی کرنل قذافی کو پسند کرتے ہیں۔

کرنل قذافی کے نام پر انہوں نے کسی پسندیدگی کا تاثر نہیں دیا اس لئے گفتگو کا سلسلہ آگے نہ بڑھ سکا یوں بھی ان کے اور ہمارے درمیان لمبی نشست پر چند اور مسافر بیٹھے تھے۔۔۔ ہم بھی چپ ہو رہے۔

چند منٹ میں دس کا ہندسہ بھی بھیگے بدن پر ریت آلود قابل اعتراض لباس پہنے کشتی پر آیا۔۔۔ اور اپنی مخصوص نشست پر بیٹھ گیا۔۔۔ تمام مسافروں سے بے نیاز بس ایک دوسرے میں مگن تھے۔۔۔ کشتی پھر اسٹارٹ ہوئی۔۔۔۔۔۔۔ سفر ایک بار پھر شروع ہوا۔۔۔ کشتی اپنی مقررہ رفتار میں چلنے لگی یعنی ٹوٹی پھوٹی آبی سڑک پر اچھلتی ہوئی دوڑنے لگی۔۔۔ مسافر تھک گئے تھے سمندر پر سیر کرتے ہوئے کافی وقت گذر چکا تھا۔۔۔۔۔۔۔ سب مسافر خاموش تھے۔۔۔ تھکے ماندے اونگھتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔۔۔ میں کشتی کے بالکل ایک سرے پر

بیٹھا تھا اس لئے لوہے کے اس پائپ کو مضبوطی سے تھامے ہوئے تھا جس پر پینا فلیکس کا شامیانہ یا چھت تنی ہوئی تھی۔۔۔۔ بچے ماؤں کی گود یا پہلو میں بے سدھ پڑے ہوئے تھے۔۔ میری نظر دس کے ہندسہ پر پڑی۔۔۔۔ لانبے قد کا جاپانی عالم چنا چوکنا بیٹھا تھا اور تیز ہوا میں اس کے بڑے بڑے کھلے بال ہوا میں اس طرح اڑ رہے تھے جیسے چڑیا کا متحرک گھونسلہ۔۔۔ ہمارے سر میں بچے ہوئے ایک چوتھائی بال کیا منظر پیش کر رہے ہونگے اس کا اندازہ باقی مسافروں کو ہوگا۔۔۔۔ ہم نے دیکھا کہ جاپانی عالم چنا کی گوری، اپنے پیا کے پہلو میں لگی ایسے سو رہی تھی جیسے اسکول کی بچی چھٹی کے بعد اپنی مام کا انتظار کرتے کرتے۔۔۔۔ اسکول کی سیڑھیوں کے ساتھ کھڑے گول ستون کا سہارا لیکر اونگھتے اونگھتے سو گئی ہو جتنی معصومیت اور بچپنا اسکول کی بچی کے چہرے پر ہوتا ہے ویسی ہی معصومیت اور بچپنا، اس گوری کے چہرے پر دمک رہا تھا۔۔۔۔۔

کشتی کچھ دیر تک چلتی رہی ہم دور و نزدیک کے پہاڑی نما گذرتے جزیروں کو دیکھتے رہے۔

☆☆☆

عقابوں کا نشیمن

کشتی کی رفتار ہلکی ہوئی تو اونگھتی آنکھیں کھلیں۔۔۔تھکن سے چور مسافروں میں حرکت ہوئی۔۔۔سب نے پہلو بدلے۔۔۔بچے ماؤں کی گود سے نکل کر اٹھ کھڑے ہوئے۔۔۔ہم پھر ایک بار Fresh Water Lake کے ماحول میں پہنچ گئے۔۔لیکن کشتی کسی کنارے کے قریب نہیں پہونچی بلکہ سمندر پر ہچکولے کھاتی رہی۔۔۔سامنے راستہ بند تھا۔۔۔تین طرف اونچے اونچے پہاڑ جن پر ایک دوسرے سے جڑے ہوئے درختوں کا ہجوم۔۔۔تینوں طرف سوائے درختوں، شاخوں اور پتوں کی دیوار کے کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔۔۔سمندر کی لہریں جن پہاڑیوں کی بنیادوں سے ٹکرا رہی تھیں وہاں بھی کائی جمی ہوئی تھی۔۔۔اور سبزہ اگا ہوا تھا۔۔۔اس منظر کو خوشگوار اور خوبصورت نہیں کہا جا سکتا تھا۔۔۔خود کو ہم گھنے اور خطرناک جنگل کے قریب بلکہ اس کی گرفت میں محسوس کر رہے تھے۔۔۔کشتی یہاں ٹھہر گئی انجن سے ہلکی ہلکی آواز بدستور آ رہی تھی۔۔۔شام کے سرمئی سائے چاروں اور پھیلے ہوئے تھے اور سمندر کی پرسکون لہریں اب زیادہ مچل رہی تھیں اور کشتی ڈگمگا رہی تھی۔۔۔سیاحوں کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو رہا تھا کہ یہاں بند گلی میں کشتی کیوں روک دی گئی۔۔۔اس دوران ڈرائیور اپنی سیٹ سے اٹھا ازاں بعد اپنی نشست کے قریب سے اس نے شاپنگ بیگز نکالے۔۔۔جن میں گوشت کے ٹکڑے۔۔خون آلود پارچے اور چھیچھڑے تھے۔۔۔۔پلاسٹک کی سفید تھیلی کے نچلے حصہ سے سرخ سرخ خون ہلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

پہلی بار ڈرائیور نے زبان کھولی۔۔۔یہ Eagle square ہے

یہ کہہ کر اس نے تھیلیوں میں بند گوشت۔۔۔مٹھی بھر بھر کر کشتی کے باہر سمندر کی کانپتی لہروں پر پھینکنا شروع کیا۔۔۔اس کے بعد۔۔۔تھیلیاں الٹی کر کے، بچے کچھے گوشت کے ٹکڑے اور خون بھی سمندر میں گرا دیا مگر خالی گندی تھیلیوں کو واپس اپنی کشتی کے ڈسٹ بن میں ڈال دیا۔۔۔اس کے بعد انجن اسٹارٹ کیا اور کشتی کو چند گز کے فاصلے پر لے کر کھڑا کر دیا۔

اب دیکھئے۔۔۔۔ڈرائیور نے کہا۔

مسافروں نے دیکھا ایک عقاب پہاڑی درختوں کے جھنڈ سے نکلا اور فضاء میں اڑتے ہوئے سطح سمندر پر اترا اور گوشت کا ایک پارچہ اپنے پنجوں میں اچک کر اسی زاویئے سے اوپر ہوا میں بلند ہوتا چلا گیا۔۔۔اس کے بعد دو۔۔۔۔تین۔۔۔۔پانچ۔۔۔۔دس۔۔۔۔بیس حتیٰ کہ پچاسوں عقاب ہمارے سروں پر منڈلاتے رہے۔۔۔۔اوپر سے Dive مارتے گوشت کا ٹکڑا پنجوں میں پکڑتے اور پھر اسی طرح فضا میں بلند ہو جاتے۔

مجھے بچپن کا زمانہ یاد آ گیا۔۔۔جب صدقہ کی کلیجی کے ٹکڑے لیکر ہم سب بہن بھائی چھت پر چڑھ جاتے۔۔۔ایک پارچہ۔۔۔۔فضاء میں اچھالتے اور سب مل کر چلاتے۔۔۔۔چیل۔۔۔۔چی۔۔۔۔چلل لل،،للّی۔۔۔۔آس پاس،دور و نزدیک چیل کا نام و نشان بھی نہیں ہوتا تھا لیکن لمحوں میں جانے کہاں سے چیلوں کا غول کا غول فضاء میں جمع ہو جاتا تھا۔۔۔۔شاید ہی گوشت یا کلیجی کا کوئی ایسا ٹکڑا ہوتا۔۔۔۔جو چیلوں کی گرفت سے بچ کر واپس چھت پر آ گرتا۔۔۔ذرا سی دیر میں تمام کلیجی کے ٹکڑے اور چھیچھڑے۔۔۔۔چیلیں لے اڑتیں۔۔۔۔بالکل۔۔۔۔ایسا ہی منظر تھا۔۔۔۔پہلے منظر میں چیل فضاء میں گوشت کا ٹکڑا پنجوں میں پکڑتی تھی۔۔۔۔اور موجودہ منظر میں۔۔۔۔عقاب فضا سے سطح سمندر پہ تیرتے ہوئے گوشت کے پارچے پر جھپٹا مار کر لے جاتے۔۔۔پانچ منٹ تک ان گنت عقاب ہماری کشتی کے اوپر اڑتے رہے۔۔۔۔اب ہمیں خوف آنے لگا کہ گوشت کم تھا اور بہت سے عقاب فضائی حملوں میں خالی پنجے ناکام لوٹے تھے اگر وہ عقاب بھوکے ہوتے اور امریکی فوجیوں کی طرح غصہ میں آ کر ہم پر فضائی حملہ کر دیتے تو سوائے لائف جیکٹس کے کشتی میں کیا باقی بچے گا بلکہ سچ پوچھو تو صرف جیکٹس بچیں گے۔۔۔لائف تو عقابوں کے پنجوں میں ہوگی۔۔۔۔ہم نے اپنی وائف کو دیکھا۔۔۔وہ بھی دوسرے مسافروں کی طرح خوفزدہ تھیں۔

ڈرائیور نے ایک بار پھر زبان کھولی۔۔۔They are not so hungry کیونکہ ہر کشتی سے یہاں سمندر میں گوشت پھینکا جاتا ہے اب شام ہو رہی ہے اور انہوں نے پیٹ بھر کر گوشت کھا لیا ہے۔۔۔ہم نے فوراً اللہ کا شکر ادا کیا کہ ہم صبح ساڑھے نو بجے والی پہلی کشتی سے یہاں نہیں پہنچے ورنہ عقابوں کو مطلوبہ خوراک نہ ملتی تو کیا عجب کہ مسافروں کو پنجوں میں پکڑ کر لے جاتے اور اس گھنے جنگل میں آرام سے ناشتہ کرتے۔۔۔۔

ایک ایک کر کے ۔۔۔تمام عقاب ان درختوں میں غائب ہو گئے۔مطلع صاف ہو گیا تھا۔۔۔دلوں میں عقابوں کے خلاف جو غبار تھا۔۔۔وہ دور ہو گیا۔کشتی نے واپس تیزی سے u ٹرن لیا اور آگے بڑھ گئی۔

اب ہم نے غور کیا تو ملائیشیا کی حکومت کے محکمہ سیاحت کی دور بینی اور منصوبہ سازی پر پیار آیا۔۔۔عام حالات میں سمندر کا یہ حصہ اس لائق نہیں تھا کہ اس جگہ پر سیاحوں کو لایا جائے لیکن ہر کشتی سے گوشت کے ٹکڑے سطح سمندر پر پھینکے جاتے ہیں تو ان گھنے جنگلوں میں رہنے والے عقابوں کو آرام سے خوراک مل جاتی ہے۔۔۔شاید یہ بنی اسرائیل کے زمانے کے عقابوں کی نسل ہے اور اللہ تعالیٰ ان پر من وسلویٰ اتار رہا ہے۔۔۔یہ سلسلہ اس لئے جاری ہے کہ یہ صابر و قانع عقاب ہیں۔۔۔بہت زیادہ خوفناک نہیں اسی لئے جنگل کی خاک یا کسی پیڑ کی تاک سے تہہ افلاک اڑان بھرتے ہوئے آتے ہیں اور اپنی خطرناک نگاہوں سے آب پر تیرنے والے گوشت کے ٹکڑے کو تاک کر نشانہ بناتے ہیں اور پنجوں میں پکڑ کر اپنے حصہ کی خوراک لے جاتے ہیں ۔۔۔ناچھینا جھپٹی نا آپس میں لپاڈگی ہمیں تو بندروں سے زیادہ اچھے لگے کہ برابر کھڑی کشتی کے مسافروں کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھا۔۔۔عقاب شکم سیر ہو تو غیر کے دسترخوان پر مڑ کر نہیں دیکھتا۔۔۔یہ تو انسان کی جبلت ہے کہ اپنا رزق بچا کر دوسروں کے رزق پر چھپٹا مارتا رہتا ہے ورنہ اب العالمین نے تو دنیا کے تمام انسانوں کے لئے رزق کے وافر وسائل مہیا کئے ہیں مگر غلط تقسیم نے دنیا کے ۹۰ فیصد لوگوں کو مسائل میں مبتلا کر دیا ہے۔۔۔خیر جانے دیجئے۔۔۔ان باتوں پر غور کرنے سے ہم خود کو عقابوں سے چھوٹا محسوس کرنے لگے تھے بہر حال یہ سچ ہے کہ عقابوں کا نشیمن سیاحوں کی دلچسپی کا مسکن بن گیا ہے۔۔۔ہم نے خود اس Tour کا انتخاب عقابوں کے نشیمن کے اسی منظر کو دیکھنے کے لئے کیا تھا۔

کشتی اب ہمیں ایک ساحل پر لے گئی۔۔۔تقریباً ویسا ہی ساحل جیسا ہم پہلے دیکھ چکے تھے۔۔۔چھوٹی چھوٹی کشتیاں۔۔۔Banana boats۔۔۔دو تین دکانیں ۔۔۔ساحل پر نہاتے ہوئے اور ساحلی ریت پر سن باتھ لیتے ہوئے سیاح۔۔۔کشتی کنارے جا لگی۔۔۔سب مسافر اترے تو ہم بھی اتر گئے۔۔۔جوتوں سمیت ساحل کی ریت پر ایک چکر لگایا ،یہ ساحل بڑا تھا۔۔''ہاکس بے'' کی طرح۔۔۔لیکن اس کے کنارے کنارے Huts نہیں تھے۔۔۔یہاں ایک ہوٹل بھی تھی اس کا نام Awana ہوٹل تھا سیاحوں کی ٹولیاں کھیل

کود۔۔۔میں مصروف تھیں۔ہنستے مسکراتے قہقہے لگاتے چہلیں اور شرارتیں کرتے ،اچھل کود کر رہے تھے۔۔۔چھوٹی چھوٹی کشتیاں چلا رہے تھے۔۔۔ہم کھڑے تماشہ دیکھتے رہے۔۔۔آدھ گھنٹے بعد روانگی ہوئی۔۔۔۔

کشتی نے ہمیں جیٹی پر اتار دیا۔۔۔تھکے ہارے بوجھل قدموں سے آگے بڑھے تو AOS کی کوسٹر ہماری منتظر تھی،اس Tourist کمپنی کا انتظام کمال کا ہے۔۔۔مجال ہے ایک منٹ بھی تاخیر ہو جائے۔ہوٹل کے پورچ میں کوسٹر نے ہمیں اتار دیا۔۔۔شام کے سائے لمبے اور گہرے ہو گئے تھے۔۔۔مگر دھندلے دھندلے اجالے ابھی موجود تھے اور دور و نزدیک کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔

کاندھوں پر تھکن کا بوجھ لئے ہم لاؤنج سے گذرے تو ایک دیکھا بھالا چہرہ سامنے آ گیا پہلی نظر میں پہچان نہ سکے۔۔۔کہ تھکے ہوئے بھی تھے اور خود اپنے آپ سے بیزار ہو رہے تھے۔۔۔میں نے اچٹتی سی نگاہ ڈال کر ابھی ایک قدم آگے بڑھایا تھا کہ آواز آئی۔۔۔رضوان صاحب ہیں۔۔۔

قدم تھم گئے۔۔۔قریب پہنچا تو دیکھا۔۔۔یہ سعید اختر تھے،آرٹس کونسل کے ہمارے ساتھی۔کراچی میں انکم ٹیکس پریکٹس کرتے ہیں۔۔۔پردیس میں ''گوٹھائی'' کو دیکھا تو جی خوش ہو گیا۔چالیس پچاس گھنٹے بعد بیگم کے علاوہ کسی سے اردو میں بات کی۔ان کی بیگم اور ہماری بیگم آپس میں ملیں،ٹھیک سے تعارف بھی نہیں ہو پایا۔۔۔۔۔ہم تھکے ہوئے۔۔۔اور وہ عجلت میں تھے۔۔۔سلام دعا کے بعد رخصت ہو گئے۔

کمرے میں گئے۔۔۔شاور لیا۔۔۔تازہ دم ہو گئے۔۔۔عصر کی نماز ادا کی۔۔۔بیگم نے کافی تیار کر رکھی تھی۔۔۔وہ منہ ہاتھ دھونے گئی اور ہم نے گھنٹوں بعد کافی کے ساتھ سگریٹ کا کش لیا۔ساری تھکن دور ہو گئی۔

رات کھانے کا کیا کریں۔۔۔اب بھوک لگ رہی ہے۔

میں نے کئی صفحات پر مشتمل Hotel Menu کا مطالعہ کیا۔۔۔کوئی پسندیدہ ڈش فہرست میں نہیں تھی۔۔۔Sea food کی ایک لمبی قطار تھی مگر Fish کے ساتھ کوئی بدذائقہ لفظ جڑا ہوا تھا۔۔۔جانے کس طرح پکاتے ہیں۔۔۔؟۔۔۔ہاں دال اور سبزی فہرست میں شامل تھی۔۔۔بڑی ہوٹلوں میں Mix vegitable ابلی ہوئی۔۔۔خشک اور بدذائقہ ہوتی

ہے۔۔۔روٹی لگا کر کھائیں تو خشک ہونے کی وجہ سے لقمہ گلے سے پانی لئے بغیر اترتا نہیں۔

دال ہمیں پسند ہے۔۔۔لیکن کھاریاں کینٹ کے قریب GT روڈ کے کنارے میاں جی کی ہوٹل کی دال کا جواب نہیں!!۔۔۔ہاں کبھی کبھی بے تکلف دوستوں کے ساتھ حقانی چوک میں واقع ۔۔۔ پہلوان کی ہوٹل کی دال کھانے چلے جاتے ہیں۔۔۔اس کے علاوہ ایک شہر سے دوسرے شہر کا سفر کر رہے ہوں تو کسی بھی ڈرائیور ہوٹل کے باہر گاؤں کی مٹیار کی کسی جوانی کی طرح کسے ہوئے پلنگ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھے ہوں اور دال میں تازہ بگھار دیا ہوا اور اوپر سے کٹی ہوئی ہری مرچیاں۔۔۔پودینہ اور پسے ہوئے گرم مصالحہ کی پھریری ڈال کر تنور سے اتری ہوئی گرم روٹیاں سامنے آجائیں۔۔۔تو بھوک سے زیادہ کھا لیتے ہیں۔۔۔لیکن تین چار ستارہ ہوٹل کی دال کے بارے میں دل نہیں ٹھکا۔۔۔پھر خیال آیا جس ہوٹل میں جاء نماز مہیا کرنے سے انکار کیا جائے وہاں حلال۔۔۔حرام کی تمیز کیسے کی جائے۔

بیگم نے کہا دال اور سبزی میں حلال، حرام کا خوف کیوں ہے آپ کو۔۔۔یوں بھی یہ مسلمان ملک ہے، اب مجھ میں تو کہیں جانے کی ہمت نہیں ہے۔بہتر ہے کہ ہم ہوٹل ہی میں کھانا کھالیں۔۔۔بیگم کے اصرار پر ہم نے ہوٹل ہی کے ریستوران میں کھانا کھایا۔۔۔

کمرے میں گئے تو۔۔۔احساس ہوا کہ پردیس میں ہمیں ایک دوست ملا بھی لیکن تھکن اور عجلت کی وجہ سے ڈھنگ سے بات بھی نہ کر سکے کل کراچی میں ملیں گے تو ہم ایک دوسرے کے بارے میں کیا سوچیں گے۔۔۔خیال آتے ہی میں نے ٹیلی فون آپریٹر کو فون کر کے سعید اختر سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔۔آپریٹر نے سعید اختر کے کمرہ میں کال ملادی۔۔۔فون پر گفتگو ہوئی تو طے پایا کہ دس منٹ بعد لاؤنج میں ملتے ہیں۔

ہمارے کمرے سے چند قدم کے بعد ہی کشادہ لاؤنج شروع ہو جاتا ہے۔۔۔دو دن پہلے جب ہم یہاں آئے تھے تو سرسری نگاہ سے اس جگہ کو دیکھا تھا، اب ہم نے غور کیا تو یہاں چھوٹی بڑی میزیں۔۔۔۔اور اس قدر خوبصورت اور دیدہ زیب کہ نظر پڑ جائے تو ہٹتی نہیں۔۔۔ مختلف رنگوں کے پتھروں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے میز پر کمال مہارت سے جنڈی کاشی کا کام کیا ہوا تھا۔۔۔پاکستان میں اب بھی دسترخوان استعمال ہوتے ہیں لمبے دسترخوانوں پر ایک فرد کی نشست کے برابر چوکور حصہ میں چھاپے کی مدد سے چھوٹی چھوٹی پتیوں کا گول ڈیزائن بنایا جاتا ہے، یہاں ہر میز میں بہت چھوٹے چھوٹے رنگ برنگے پتھروں سے ایسا ہی ڈیزائن بنایا گیا

تھا، چند میزیں اتنی بڑی تھیں کہ ان کے گرد دس کرسیاں لگائی جا سکتی تھیں۔۔۔ہم ان میزوں کا جائزہ لے رہے تھے کہ سعید اختر آ گئے۔۔۔تھکے تھکے لگ رہے تھے۔انہوں نے بتایا کہ صبح چھ بجے کرایہ کی گاڑی سے پینانگ تک کا سفر طے کر کے آ رہے ہیں ہمیں حیرت ہوئی کہ ہمارے علم کے مطابق پینانگ ایک جزیرہ ہے جہاں صرف فضائی اور سمندری راستے ہی سے سفر کیا جا سکتا ہے۔۔۔ان کا ارادہ۔۔۔کوالالمپور سے سنگاپور جانے کا تھا۔۔۔بہر حال ان سے ملاقات کے نتیجہ میں ہمیں بعض مفید معلومات حاصل ہوئیں کہ وہ کئی دن سے ملائیشیا کے مختلف علاقوں کا ہنگامی دورہ کر رہے تھے۔۔۔کافی دیر ہم ان سے باتیں کرتے رہے۔ملائیشیا کے بارے میں ہماری اور ان کی رائے یکساں تھی۔۔۔قانون پر عمل درآمد۔صفائی ستھرائی کا بہترین نظام ۔۔وقت کی پابندی۔۔قوتِ برداشت۔۔۔اطمینان اور خوش اخلاقی۔۔۔ہم پردیس کی تعریف کر کے دل ہی دل میں شرمندہ ہوتے رہے۔

کافی دیر کے بعد ہم نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا۔۔۔کیونکہ انہیں علی الصبح لنکاوی چھوڑنا تھا۔۔۔سعید اختر اپنے کمرے میں چلے گئے۔۔۔میں ٹہلتا ہوا لاؤنج کے اس حصہ میں پہنچ گیا جہاں ایک کشادہ فرشی بساط پر شطرنج کے جہازی سائز مہرے رکھے ہوئے تھے۔۔۔بادشاہ اور وزیر دو فٹ اونچے تھے جبکہ پیدل ڈیڑھ فٹ کے ہونگے۔۔۔پہلے دن ہم سمجھے کہ یہ Decoration Piece ہیں اور فرش سے جڑے ہوئے ہیں۔۔۔لیکن ہم یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ یہ پلاسٹک کے بے وزن مہرے ہیں۔اور کھلاڑی فرشی بساط کے آمنے سامنے کھڑے شطرنج کھیل رہے تھے، ہوٹل میں مقیم چند مسافر دائیں بائیں پڑی خوبصورت اور مضبوط کرسیوں پر بیٹھے تھے جن میں wood carving کا کام کیا ہوا تھا تین چار مسافر بساط کے اطراف میں کھڑے۔۔۔بازی دیکھ رہے تھے،

ہمیں شطرنج کا پرانا شوق ہے۔برسوں شطرنج کھیلی ہے۔ایک زمانہ میں تو کلیم صدیقی۔۔۔مسرت زبیری، فرحان الرحمٰن، سعادت جعفری اور لطیف پراچہ کے ساتھ ہر شام شطرنج کی بازی لگتی تھی۔۔۔مگر محمود خان چھاپہ مار کر ہماری بساط الٹ دیتا تھا۔۔۔لڑائی جھگڑا ہوتا تھا مگر وہ باز نہ آیا۔۔۔یوں ہم سب نے شطرنج کھیلنا چھوڑ دی۔۔"لیکن محمود خان ابتک بساط الٹنے کی عادت سے باز نہ آئے"

کھیل نہایت دلچسپ مرحلہ میں تھا۔۔۔ہم کھڑے کھڑے بازی سے لطف اندوز ہو رہے

تھے۔۔۔کئی مرحلے ایسے آئے کہ ہمارا چال بتانے کو جی چاہا۔۔۔مگر ماحول میں خاموشی طاری تھی۔۔۔اور تماشبین چپ چاپ بیٹھے کھیل دیکھ رہے تھے۔۔۔۔۔صرف کھلاڑی۔۔۔چال چلنے کے لئے بساط پر آکر مہرے تبدیل کرتا اور پھر دونوں کھلاڑی ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہو جاتے اور بساط پر نظریں جمائے چال سوچتے رہتے۔ایک دو بار تو یوں ہوا کہ چال بتانے کے لئے منہ کھولا۔۔۔ہلکی سی آواز بھی پیدا ہوئی مگر ہم ضبط کر گئے۔۔۔اس وقت ہمیں وہ لطیفہ یاد آیا جس میں کھیل سے باہر ایک تماشائی کبھی ایک کھلاڑی کو چال بتاتا اور کبھی دوسرے کھلاڑی کو چال بتاتا تھا۔۔۔کھلاڑی تماشائی کے رویئے سے تنگ آچکے تھے اور کئی بار سختی کے ساتھ تنبیہ کر چکے تھے۔۔۔تماشائی جوان کا ساتھی تھا۔۔۔وہ کچھ دیر تو برداشت کرتا۔۔۔چپ رہتا اور پھر کسی کھلاڑی کو چال بتا دیتا۔۔۔اس موقعہ پر ایک کھلاڑی کو غصہ آ گیا۔۔۔اس نے بڑی سختی سے کہا کہ اگر اب تم بازی کے بیچ۔۔۔بولے تو میں تمہیں جوتے مارونگا۔۔۔ان کا ساتھی شرمندہ ہو کر چپ ہو رہا۔۔۔۔لیکن بار بار وہ کچھ بولنا چاہتا تھا۔۔۔چال بتانا چاہتا تھا۔۔۔لیکن جوتے کی مار کے خوف سے چپ ہو رہتا۔۔۔ایک مرحلہ ایسا آیا کہ تماشائی نے اپنا جوتا نکالا اور کھلاڑی کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا یہ لو۔۔۔جوتا۔۔۔بے شک مارلو۔۔۔مگر رخ بیچ میں ڈال کر پیدل سے شہ مات بچالو۔۔۔

شطرنج کھیلنے کو ہمارا دل بھی بہت بے چین تھا۔۔۔چال بھی بتانا چاہتے تھے مگر پردیس میں جوتے کھانے کے خوف سے خاموش رہے۔۔۔بازی ختم ہوئی۔۔۔لیکن فوراً ہی دوسرے دو کھلاڑیوں نے بازی لگالی۔۔۔ہم کھڑے کھڑے تھک گئے تھے اس لئے کمرے میں آگئے۔۔۔کمرہ بے حد ٹھنڈا تھا۔۔۔A.C کو Low پر کیا ہوا تھا پھر بھی دو کمبلوں میں سردی لگ رہی تھی۔۔۔جانے یہاں کس قوت کی توانائی ہے ہمارے ہاں A.C چلنا تو محال پنکھا بھی آخر شب کی تھکی ہوئی رقاصہ کی طرح بے دلی کے ساتھ چکر لگاتا ہے اس پر مستزاد یہ کہ کبھی ایک دم بلب کی روشنی تیز اور کبھی بجلی ہوتے ہوئے بھی ٹیوب لائٹ بند ہو جاتی ہے اور پنکھا آہستہ خرامی کے ساتھ لڑکھڑانے لگتا ہے کبھی کبھی تو خوف آتا ہے کہ کہیں پنکھا چھت سے نہ گر پڑے۔۔۔ہم پر ایک بار چھت سے چلتا ہوا پنکھا گر چکا ہے۔۔۔واقعہ تفصیل طلب ہے اس لئے کسی اور موقع پر اس کا ذکر کریں گے۔۔۔خیال رہے کہ ہمارے شہر میں بجلی کی آنکھ مچولی جاری رہتی ہے Fluctuation کی وجہ سے۔۔۔آئے دن کبھی T.V اڑ جاتا ہے۔۔۔کبھی بلب فیوز ہو

جاتے ہیں اور بجلی کا بل دسمبر میں بھی جون کے مہینے کے بل سے زیادہ ہوتا ہے۔۔۔پچھلے برس تک تو KESC کے شکایتی مرکز پر فون بھی کر دیا کرتے تھے۔۔۔اب فون ہی ہفتوں سے خراب ہے۔۔۔Cell فون سے شکایتی مرکز پر فون کرو تو۔۔۔!! ۔۔۔خیر اب پردیس میں اپنے دیس کا کیا گلا کریں۔۔۔دامن اٹھائیں تو اپنا ہی پیٹ نظر آئے گا۔۔۔

بیگم سامان سمیٹ کر پیکنگ میں مصروف تھیں۔۔۔کمرہ بہت ٹھنڈا تھا اس لئے ہم کمبل لپیٹ کر ٹی وی اسکرین پر غیر دلچسپ channals کو بدل بدل کر دیکھتے رہے۔۔۔لنکاوی میں یہ ہماری آخری رات تھی۔۔۔صبح چونکہ ہماری کوئی مصروفیت نہ تھی اس لئے اطمینان سے باتیں کرتے رہے اور جانے کب سو گئے۔۔

صبح خاصی دیر تک سوتے رہے۔۔۔آنکھ کھلی تو منہ پر چھپاکا مار کر انہی کپڑوں میں ناشتہ کے لئے کمرہ سے باہر نکل آئے۔۔۔ریستوران میں ناشتہ کرنے والوں کی خاصی تعداد تھی ۔۔۔ہم عجلت میں نہ تھے اس لئے سکون سے ناشتہ کرتے رہے۔۔۔ریستوران سے باہر نکل کر سوئمنگ پول کے سامنے لاؤنج میں پڑی کرسی پر بیٹھ گئے۔۔۔سامنے پام کے درختوں کے اوپر کھلا آسمان اور پول کے آس پاس، خوبصورت گملوں اور صاف ستھری کیاریوں میں دیدہ زیب اور رنگ برنگے پھولوں کے پودے۔۔۔ہم نے سگریٹ سلگایا اور منظر سے لطف اندوز ہوتے رہے

کمرہ میں آکر ہم نے واپسی کی تیاری شروع کی۔۔۔پیکنگ کے لئے روانگی میں ابھی دیر تھی۔۔۔اس لئے گیلری میں کھڑے دیر تک باہر کے ماحول سے سکون حاصل کرتے رہے۔۔۔بیگم سفری کاغذات کو جانچ رہی تھیں، کہ اچانک کہنے لگیں۔۔۔ہمارے پاس آج کی Drinks کے کوپن بھی ہیں، کیوں نہ ذرا پہلے کمرہ چھوڑ کر لاؤنج میں چلیں۔۔۔۔مناسب تجویز ہے لیکن کمرہ کیوں چھوڑیں۔۔۔ابھی کافی وقت ہے۔۔۔سامان بعد میں لے چلیں گے۔۔

یہ بھی ٹھیک ہے بیگم نے ہماری رائے سے اتفاق کیا اور چابی لیکر کمرہ سے باہر نکل آئیں۔۔۔میں نے کمرہ بند کیا اور راہداری طے کرتے ہوئے لاؤنج میں آئے ہوٹل کاؤنٹر پر گئے اور اپنے کوپن دکھائے۔۔۔کاؤنٹر پر کھڑے مینجر نے مسکراتے ہوئے بتایا کہ آپ کو AMORUS جانا ہوگا۔۔۔نام سن کر ہمارے چہرے پر بڑا سا سوالیہ نشان ابھر آیا۔۔۔وہ پھر مسکرایا اور اشارہ سے بتایا کہ آپ Reception Counter کے بائیں جانب تنگ سی راہداری سے ذرا آگے جائیں گے تو Amorus ASP نظر آجائے گا۔۔۔وہاں آپ کو پن

دکھائیں۔۔۔وہ آپ کو Drink Serve کریں گے۔۔۔۔ریستوران سے باہر نکل کر ہم نے بیگم کا ہاتھ تھاما اور استقبالیہ کے ساتھ بغلی راہداری میں داخل ہو گئے۔۔۔۔چند قدم چلے ہونگے کہ ایک رنگ برنگے خوبصورت دروازہ پر لکھا تھا Amorus ASP Hotel ۔۔۔۔۔دروازہ پر ہاتھ کا دباؤ بڑھایا تو دروازہ کے پیچھے کھڑی لڑکی نے دروازہ کھولا۔۔۔۔ مسکرائی اور ہیلو کہکر ہمارا خیر مقدم کیا۔چھوٹے سے کاؤنٹر کے ساتھ کھڑی لڑکی کو ہم نے اپنے کوپن دیئے۔مسکرا کر انہوں نے سامنے پڑے ہوئے آرام دہ صوفوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔۔۔اب ہم نے کمرہ کا جائزہ لیا۔۔۔۔۔چھوٹا سا کمرہ۔۔۔۔چند صوفے اور دو تین خوبصورت کرسیاں ۔۔۔۔دیوار پر Paintings لگی ہوئیں۔۔۔۔خاص بات یہ کہ کمرہ خوشبوؤں سے مہکا ہوا تھا ۔۔۔۔جس چیز نے ہمیں اپنی جانب متوجہ کیا وہ ہمارے سامنے دیدہ زیب چوبی میز پر ایک انتہائی خوبصورت ''کونڈا'' رکھا تھا۔۔۔کونڈا۔۔۔۔۔ارے بھئی ہر گھر کی رسوئی میں آٹا گوندھنے کا کونڈا۔۔۔فرق صرف اتنا تھا کہ۔یہ بے حد جاذب نظر تھا۔۔۔۔جنڈی کاشی کا کام کیا ہوا تھا۔گل بوٹے بنے ہوئے تھے اور اس کے اوپر بہت چھوٹے چھوٹے پھول۔۔۔۔اس طرح سجائے تھے کہ POT کا پیندا نظر نہیں آرہا تھا۔۔۔۔وہ تو ہمارے پیر کے چھونے سے میز میں نامحسوس جنبش ہوئی تو پتہ چلا کہ تمام پھول پانی کی سطح پر سجائے گئے ہیں اور Pot پانی سے بھرا ہوا تھا۔۔۔یونہی ہم نے دائیں طرف دیکھا تو ایک خوبصورت Stand پر ایک پھولدار منقش چینی Bowl رکھا تھا اس میں موجود پانی کی سطح پر اسی طرح پھول سجے ہوئے تھے۔۔۔۔

اس دوران ایک۔۔۔۔خاتون۔۔۔مگر خاتون والی عمر تھی نہ لچھن۔۔۔۔اس لئے ہم لڑکی ہی کہیں گے۔۔۔۔آئی۔۔۔۔رکوع کی صورت جھکی۔۔۔۔ایک منقش ٹرے میں رکھی دو چھوٹی چھوٹی پیالیاں بڑے قرینے سے ہمارے سامنے رکھدیں ایک چھوٹی سی طشتری میں کٹا ہوا لیموں اور شکر۔۔۔۔بمشکل دو گھونٹ سبز چائے ہوگی۔۔میز پر ایک پلیٹ میں لونگ۔کالی مرچ۔۔۔۔اور اسی قسم کے دوسرے مصالحہ جات رکھے تھے۔۔۔کچھ اور بھی جڑی بوٹیاں تھیں۔۔۔

ابھی ہم نے چائے کا ایک Sip لیا ہی تھا کہ ایک اور لڑکی۔۔۔گوری چٹی اور خوبصورت بیگم کی موجودگی میں اس سے زیادہ کیا توجہ دیتے۔۔۔۔قریب آئی۔۔کہنے لگی۔۔۔مساج کرائیں گے۔۔۔۔؟

ہم دھک سے رہ گئے ۔۔۔۔ملائیشیا کے بارے میں سنا تھا کہ یہاں مساج عام ہے ۔۔تین دنوں کے قیام کے دوران ہم نے اس سے پہلے کوئی ایسی جگہ نہیں دیکھی ۔۔۔۔۔جس ہوٹل میں تین دن سے مقیم تھے اس میں موجود ''مساج سینٹر'' کا بھی ہمیں اب پتہ چلا ۔۔۔۔۔پہلے سے معلوم ہوتا تو کوئی ترکیب نکالتے ۔۔۔۔بیگم سے کچھ بھی کہکر اس طرف چلے آتے ۔۔۔۔لیکن اب کیا کریں ۔۔۔۔؟

ہم نے نہایت بے نیازی سے جواب دیا۔۔۔۔No Thanks ۔۔۔ایک لمحہ کو مایوسی کا سایہ دودھیا رنگت پر لہرایا اور پھر ہونٹوں پر پیشہ ورانہ مسکراہٹ لوٹ آئی ۔۔۔۔اور جن قدموں سے آئی تھی ۔۔۔انہی قدموں سے واپس چلی گئی۔

سبز چائے کا مفٹ ٹوکن دینے کا مطلب اب سمجھ میں آیا کہ ہوٹل میں مقیم مسافر اس بہانے ''مساج مرکز'' تک پہنچیں باقی کام AMORUS کے اسٹاف کا ہے ۔۔۔۔ایک بات اور بتاتے چلیں کہ یہاں تقریباً تمام بڑی ہوٹلوں کے ساتھ ایک لفظ لکھا ہوتا ہے ۔۔''ASP'' اس کا مطلب ہے مساج مرکز یعنی ہوٹل میں مساج کرانے کی سہولت موجود ہے پاکستان میں ''مساج مرکز'' کو جسمانی عیاشی کا اڈہ سمجھا جاتا ہے ۔۔یہاں ایسی کوئی بات نہیں ہے ۔۔۔مالش کرانے کا رواج ہمارے ملک میں بھی ہے ۔۔۔بڑے شہروں کی نواحی بستیوں میں آج بھی رنگ برنگے تیل سے بھری شیشوں کو ''مالشیئے'' ایک دستی جھینگے میں لئے پھرتے ہیں اور تھکے ماندے لوگ کسی چوک یا فٹ پاتھ ہوٹل میں بیٹھ کر مالش کراتے ہیں ۔۔۔۔۔مساج اسی عمل کی ترقی یافتہ شکل ہے ۔۔۔مختلف جڑی بوٹیوں کے تیل کی مدد سے یہاں خواتین ہی نہیں مرد بھی مساج کرتے ہیں اور مرد ہی نہیں خواتین بھی مساج کراتی ہیں ۔۔۔۔یہاں یہ کوئی معیوب بات نہیں ہے اور نہ ہی بند کمرے میں یا تنہائی میں کوئی لڑکی مالش کرتی ہے ۔عام طور پر مساج مراکز کو Fitness سینٹر کہا جاتا ہے ۔۔۔۔یہ جڑی بوٹیاں عام دکانوں میں بھی ملتی ہیں بلکہ بلیک سینڈ آئر لینڈ کی ایک چھوٹی سی دکان میں ایک سیلز گرل نے ہماری بیگم کو جڑی بوٹیوں سے بنے ہوئے تیل کی شیشی فروخت کرنے کی کوشش کی تھی اور مسکراتے ہوئے کہا تھا کہ خرید لیجئے اور اپنے میاں کی مالش کیجئے گا ۔۔۔

بیگم نے انکار کر دیا ۔۔۔سبز چائے پی کر ہم AMORUS سے چلے آئے ۔۔کمرہ میں آکر اپنا اسباب سمیٹا ۔۔۔کاؤنٹر پر چابی جمع کرائی ۔۔۔ہوٹل کے اندرونی حصہ پر الوداعی نگاہ ڈالی ۔۔۔اور باہر آکر Lobby میں بیٹھنا چاہا ۔۔مگر AOS والے پہلے سے ہمارے

منتظر تھے۔

کوسٹر میں ہم دو ہی مسافر تھے۔۔۔۔ڈھائی بجے ہوٹل ہالیڈے ولا لنکاوی سے ہم روانہ ہوئے۔۔۔۔منی مارٹ تک دیکھا بھالا راستہ اس کے بعد چناؤلش روڈ سے ہم بائیں جانب مڑ گئے۔۔۔۔ہمیں تقریباً 40 کلومیٹر کا راستہ طے کرنا تھا۔۔۔راستے ایک جیسے تھے۔۔۔۔کچھ دیر بعد ایک سات آٹھ منزلہ عمارت پر نظر پڑی Decoda Shopping Centre یہاں کافی رونق تھی۔۔۔۔لوگوں کا اژدھام تھا۔۔۔اس سے پہلے لنکاوی کی سڑکوں پر ہم نے مسافروں کی اتنی تعداد نہیں دیکھی تھی۔آگے بڑھے تو GAWA Town آیا۔۔۔تقریباً 35 کلومیٹر کے فاصلے پر یہ بارونق علاقہ ہے۔۔۔۔بہت سی اونچی اونچی عمارتیں۔۔۔خریداری کے مراکز سڑک پر مقامی ٹریفک۔۔۔۔۔آگے بڑھے۔۔۔Bay view ہوٹل پر نظر پڑی دس بارہ منزلہ عمارت ۔۔۔۔یہ GAWA Town کا کمرشل ایریا ہے اس راستے سے ہم نہ گذرتے تو لنکاوی کو تین چار منزلہ عمارتوں پر مشتمل ایک تفریحی مقام ہی سمجھتے گویہ الگ ٹاؤن ہے مگر لنکاوی ہی کا حصہ ہے۔

راستے میں چار پانچ مسجدیں بھی دیکھیں۔۔۔۔۔سڑک کنارے خاصی کشادہ مساجد۔۔۔یہاں مسجدوں کا طرز تعمیر ہمارے یہاں سے ذرا مختلف ہے، ہر مسجد میں ایک اونچا مینار۔۔۔زیادہ تر چوکور۔۔۔ایک بڑا گنبد۔۔۔مقامی طرز تعمیر کی عکاسی کرتے ہیں۔۔۔گاڑی ایک چھوٹے سے پل پر سے گذری نیچے ایک نہر بہہ رہی تھی۔۔۔۔راستہ میں سڑک کے اوپر پیدل چلنے والوں کا ایک پل۔۔۔۔جوں جوں ہم جیٹی کے قریب پہنچ رہے تھے۔۔۔۔راستہ مزید بارونق ہوتا جارہا تھا۔۔۔

جیٹی سے ایک کلومیٹر پہلے ''کوائی'' واقع ہے۔یہ بھی ایک ٹاؤن ہے۔۔۔بہت خوبصورت اور بارونق۔۔۔متعدد شاپنگ سینٹرز۔۔۔یہاں مسجد قابل دید ہے۔۔۔بہت کشادہ۔۔۔۔ایک بلند مینار اور بڑا گنبد۔اس کے چاروں طرف کوئی درجن بھر چھوٹے چھوٹے گنبد۔۔۔۔شاید اس علاقہ کی یہ مرکزی مسجد ہے جسے ہم جامع مسجد کہہ سکتے ہیں۔۔۔۔اس کے قریب ایک کشادہ پارک۔۔۔۔پارک میں بچوں کے کھیلنے کے لئے جھولے۔۔۔۔پھسلنیاں اور مضبوط پلاسٹک کے رنگ برنگے tubes جس میں داخل ہوکر چھوٹے بچے دوسری طرف پھسلتے ہوئے باہر نکل آتے ہیں۔۔۔۔پارک میں درختوں کی قطاریں اور بڑے بڑے سبزہ زار۔۔۔۔آگے چلے تو کئی خوبصورت عمارتیں۔۔۔۔ان میں اشیاء سے بھری دکانیں۔۔۔۔پارکنگ میں لاتعداد گاڑیاں

کھڑی تھیں۔۔۔لنکاوی میں پہلی بار ہم نے اتنی تعداد میں کاریں دیکھیں لیکن ان میں اکثر گاڑیاں درمیانے درجے کی تھیں۔۔۔بڑی اور قیمتی گاڑیاں ہمیں دیکھنے کو نہیں ملیں۔۔۔نہ پجیرو۔۔۔نظر آئیں اور نہ۔۔۔"پجیرو کلچر"۔۔۔۔جیٹی کے باہر خیموں کی طرز میں خوبصورت انداز کے Shades دیکھے۔۔۔بے اختیار جدہ ائیر پورٹ کا بیرونی حصہ نظروں میں سما گیا۔۔۔

ایک جگہ کوسٹر رک گئی۔۔۔ڈرائیور نے دروازہ کھولا ہم گاڑی سے باہر آئے ۔۔۔ڈرائیور نے مسکرا کر ہاتھ ہلایا۔۔۔اور اجازت طلب کی۔۔۔ہم نے اس کا شکریہ ادا کیا۔۔۔کوسٹر چلی گئی۔۔۔ہم کھڑے رہ گئے۔۔۔اب کیا کریں۔۔۔؟؟ بھلے آدمی نے کچھ بتایا بھی نہیں کہ کہاں جائیں۔۔۔کس سے ملیں۔۔۔اب ہم نے داخلی حصہ پر نظر ڈالی تو حیرت زدہ رہ گئے۔۔۔اس جگہ پر تو بلاشبہ کسی ائیر پورٹ کا گمان ہوتا تھا۔۔۔چکنے ٹائلز کا فرش۔۔۔کشادہ راہداریاں۔۔۔دونوں طرف جدید اشیاء سے سجے بڑے بڑے شوکیسز۔۔۔دکانیں ہی دکانیں۔۔۔یہ بہت ہی خوبصورت اور وسیع شاپنگ پلازہ تھا۔۔۔ایک دکان پر نظر ڈالی تو کیمرے اور سیل فونز شوکیس میں سجے ہوئے تھے۔۔۔ہمارے موبائل کا چارجر جل چکا تھا۔موبائل فون کی بیٹری ختم تھی۔۔۔اب نہ کسی سے فون پر بات کر سکتے تھے اور نہ تصویریں بنا سکتے ہیں دکان دیکھ کر بیگم خوش ہو گئیں۔لیکن ہم نے کہا کہ پہلے وہ جگہ تو تلاش کر لیں جہاں سے فیری جاتی ہے۔۔۔

بیگم نے کہا ٹھیک ہے۔۔

ہم نے ایک صاحب سے جیٹی کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے ہماری راہنمائی کی ہم دکانوں پر نظر ڈالتے آگے بڑھتے رہے لیکن ایک دکان کے سامنے خود بخود قدم رک گئے۔جلی لفظوں میں لکھا تھا"حاجی اسماعیل گروپ"۔۔۔یہ کٹلری اور کراکری کی دکان تھی۔۔۔دکان کیا۔۔۔کراکری کی ایک دنیا تھی طارق روڈ کی ایک دکان سے بیس گنا بڑی دکان۔۔۔ہم اندر چلے گئے۔۔۔دنیا جہان کی کراکری۔۔۔جانے کیوں لگا کسی پاکستانی کی ملکیت ہے۔۔نام سے وطن کی خوشبو آ رہی تھی۔۔۔جی چاہا کاؤنٹر پر جا کر دریافت کریں۔۔۔دو سال پہلے ہم اپنے سسرال چیچہ وطنی گئے۔۔۔ٹرین سے خانیوال اترے۔۔۔خانیوال سے بس کے ذریعہ چیچہ وطنی پہنچے۔۔۔بس اسٹاپ سے رکشہ کے ذریعہ سبزی منڈی چوک

آئے۔۔۔رکشہ سے اترے تو بیگم نے کہا کہ سامنے مٹھائی کی دکانیں ہیں ،اماں جی کے گھر جارہے ہیں خالی ہاتھ جانا مناسب نہیں آپ سامنے سے دوکلو مٹھائی لے آئیں۔۔۔۔میں سامان کے پاس کھڑی ہوتی ہوں۔۔۔۔چوک پر مٹھائی کی کئی دکانیں تھیں ایک دکان پر لکھا تھا'' ریواڑی سوئٹ مارٹ''۔۔۔۔نام پر نگاہ پڑی تو 55 سال پیچھے چلے گئے۔۔۔۔جے پور اور ریاست الور ہمارا آبائی وطن تھا۔۔۔۔بچپن میں والدین سے ریواڑی کا نام بہت سنا تھا۔۔۔۔شاید وہاں کچھ ننہیالی رشتہ دار بھی تھے۔بے اختیار قدم ریواڑی سوئٹ مارٹ کی طرف اٹھ گئے۔۔۔

دکان پر پہنچ کر ہم نے سیلز مین سے پوچھا آپ ریواڑی کے رہنے والے ہیں۔۔۔؟

باریش نوجوان تھا۔۔۔

کہنے لگا! نہیں جی!

آپ کی دکان کا نام ریواڑی سوئٹ۔۔۔۔

بات کاٹ کر بولا۔۔۔میرے دادا ادھر سے آئے تھے۔''

ہم شرمندہ ہو گئے۔۔۔۔دوکلو مٹھائی لی اور واپس پلٹ آئے۔۔۔

ہم کاؤنٹر پر جانے کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ اب رک گئے۔۔۔سوچا اگر ہم حاجی اسماعیل کا پوچھیں اور سوال کریں کہ کیا آپ پاکستانی ہیں،تو ان کا بیٹا یا بھائی جواب دے

No: Please tell me what can i do for you

نام بڑا دھوکہ دیتے ہیں۔اگر حاجی اسماعیل برسوں پہلے پاکستان سے آئے بھی ہونگے ،تو ان کی اولادوں کو اب پاکستان سے کیا دلچسپی ہوگی۔۔۔۔اب تو خود پاکستانیوں کو پاکستان سے دلچسپی نہیں رہی۔۔۔۔اتنا بڑا کاروبار درجنوں سیلز مین۔۔۔۔سینکڑوں گاہک۔۔۔۔!!!ایسے میں تو اپنوں کو بھی نہیں پہچانا جاتا۔۔۔۔!!

ہم واپس پلٹ آئے۔۔۔۔شرمندگی سے بچ گئے۔۔۔۔

لوگوں کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے رہے۔چند منٹ کے بعد ہی ہم ایک وسیع اور کشادہ ہال میں پہنچ گئے۔۔۔۔ہمارے سامنے شیشوں کے اس پار ان گنت کشتیاں اور چھوٹے بحری جہاز کھڑے تھے۔۔۔ہم PINTO A یعنی گیٹ نمبر ا سے داخل ہوئے ایک طرف عملہ کے چند باوردی ملازمین نظر آئے۔۔۔ہم نے فیری کا ٹکٹ دکھا کر کہا کہ پنیانگ جانا ہے ۔۔۔۔کہنے لگے۔ابھی فیری کی روانگی میں 45 منٹ باقی ہیں آپ انتظار کریں۔۔۔

ہم نے اطراف کا جائزہ لیا۔۔۔ائیر پورٹ کے لاؤنج سے کم خوبصورت اور ریلوے پلیٹ فارم سے کہیں زیادہ بہتر اور صاف ستھرا۔۔۔مسافروں کے انتظار کے لئے ایک دوسرے سے جڑی ہوئی پلاسٹک کی کرسیاں۔۔۔کم وبیش 200 مسافروں کی نشستیں۔۔۔ہم نے دو کرسیاں منتخب کیں۔۔۔اپنا مختصر سا سامان قدموں کے ساتھ رکھا اور آرام سے بیٹھ گئے۔۔۔ہمارے سامنے پچاسوں فیریز۔۔۔چند فیریز پلیٹ فارم سے لگی کھڑی تھیں باقی ذرا فاصلے پر سمندر میں قطار اندر قطار ٹھہری ہوئی تھیں۔۔۔بہت سے مسافر ہماری طرح منتظر، کرسیوں پر بیٹھے تھے۔۔۔PINTO A یعنی گیٹ نمبر A سے مسافروں کی ورفت آمد کا سلسلہ جاری تھا۔۔۔کافی شاپ۔۔۔کولڈ ڈرنک کے اسٹالز موجود تھے۔۔۔بیگم نے کہا ابھی کافی وقت ہے۔۔۔میں اس دکان سے Charger خرید لیتی ہوں۔۔

دیکھو گم نہ ہو جاؤ۔۔۔ہم نے بیگم سے کہا

مسکراتے ہوئے بولیں، راستہ میں نے سمجھ لیا ہے آپ فکر نہ کریں یوں بھی آپ اتنے خوش نصیب نہیں ہیں!

ہم ہنس دیئے۔۔۔ہم چپ رہے۔۔۔

بیگم گئیں تو سگریٹ کی طلب محسوس ہوئی۔۔۔دیواروں پر جگہ جگہ No smoking کے بورڈ آویزاں تھے۔۔۔پھر بھی ایک آس تھی کہ کہیں آس پاس smoking zone ہوگا یوں بھی یہ حصہ Air condition نہیں تھا۔۔۔ہال بہت بڑا تھا۔۔۔موٹے موٹے آٹھ ستون۔۔۔25۔۔۔25 فٹ کے فاصلے سے تین قطاروں میں چھت کو سہارا دیئے ہوئے تھے۔۔۔ہم اپنی کرسی سے اٹھ کر سامنے کاؤنٹر پر گئے جہاں دو تین عملہ کے ملازمین خوش گپیوں میں مصروف تھے۔۔۔ہم ان کے قریب پہنچے اور ایک شخص سے سگریٹ پینے کی جگہ کے بارے میں پوچھا۔ اچانک اس کے ہاتھ پر نظر پڑی، دیکھا اس کی انگلیوں میں پھنسی سگریٹ کے روشن سرے سے دھواں اٹھ رہا تھا۔۔۔مسکرایا، شرمندہ سا ہوا اور کہنے لگا ok no problem

ہم بھی ہنس دیئے۔۔۔سگریٹ سلگانے سے پہلے پل بھر کو اپنی ہی آواز سنائی دی۔۔۔ابے کہیں مروانا دیئیں۔۔۔یہ پہلا اور آخری موقع تھا کہ ہم نے کسی کو ملائیشیا میں قانون کی خلاف ورزی کرتے دیکھا۔

ہر ستون کے ساتھ Dustbin رکھے تھے۔۔۔ہم نے سگریٹ سلگائی اور محتاط انداز میں

کش لینے شروع کئے ۔۔۔کئی جگہ دیواروں پر TV سیٹ لگے ہوئے تھے جہاں کمرشلز دکھائے جارہے تھے۔

پچھلے تین دنوں کے دوران ہم نے کئی ملایئے الفاظ سیکھ لئے تھے۔۔۔۔Kelunar باہر نکلنے کے راستے Exit کے معنی میں استعمال ہوتا تھا۔Lenaki۔۔۔ٹوائے لیٹ کے معنی میں استعمال ہوتا تھا اور Pinto ۔۔۔دروازہ کو کہتے تھے جبکہ سڑک یا شاہراہ کے لئے Jalan استعمال ہوتا ہے۔

آدھ گھنٹے میں بیگم آگئیں ۔۔۔بہت خوش تھیں کہ انہیں Charger مل گیا۔

مسافروں کی تعداد بڑھتی جارہی تھی ۔۔۔دنیا کے مختلف ملکوں کے سیاح کالے، گورے، گندمی اور بھورے ۔۔۔سیاہ فام پیلے اور سرخی مائل گورے ۔۔۔شلوار قمیض کہیں نظر نہ آیا۔۔۔ہاں دو ایک ساریاں ۔۔۔اکثر مقامی لباس میں سرتا ملبوس ۔۔۔باقی عورتوں ،مردوں نے جینز پہن رکھی تھیں ۔۔۔ہمارے شہر میں بھی اسکول کی چھوٹی بچیاں اب گھٹنوں سے ذرا نیچے تک پاجامہ پہننے لگی ہیں ۔۔۔مگر یہاں چند لڑکیوں نے ہمارا مطلب ہے کہ بالغ لڑکیوں نے گھٹنوں تک ڈھیلا سا پاجامہ پہن رکھا تھا ۔۔۔ہم اسے کچھنا نہیں کہہ سکتے کہ بس ایک بالشت بڑا تھا۔۔۔۔لیکن پائنچے میں جوتے کے فیتے کی طرح ڈوری یا لیس باندھی ہوئی تھی ۔۔۔ازار بند والی گرہ سے ۔۔۔ہم نے بعد میں ایک بے تکلف پاکستانی دوست سے اس پہناوے کا ذکر کیا تو کہنے لگے ۔۔۔آپ نے بڑے شاپنگ سینٹرز میں دیکھا ہوگا کہ بعض مصنوعات کو ڈبے کھول کر ذرا سا نمایاں کر کے رکھ دیا جاتا ہے تاکہ گاہک اندازہ لگالے کہ ڈبے کے اندر مال کیسا ہے؟۔۔۔۔ بس یہ پہناوا بھی ایسا ہی ہے ۔۔۔فرق اتنا ہے کہ شوکیس میں ڈبے کے اوپر مال کا ذرا سا حصہ ظاہر کیا جاتا ہے ۔۔یہاں اوپر سے بدن ملبوس اور نیچے پنڈلیوں کی نمائش کی جاتی ہے ۔۔۔اور میرے بھائی تجربہ کار نانبائی تو دیگ کا ایک چاول نکال کر اندازہ کر لیتا ہے کہ بریانی تیار ہوگئی یا ایک آنچ کی کسر ہے ۔۔۔ادھر تو تم نے سمجھو ایک تہائی مال دیکھ لیا ۔۔۔بس یہی مقصد ہے اس پہناوے کا۔۔۔

ہم نے پوچھا ساحل سمندر میں دو پٹیاں پہنیں جو خواتین ہم نے دیکھی تھیں ان کے بارے میں کیا خیال ہے ۔۔

ہشت ! وہ خواتین کب تھیں ۔۔۔وہ تو بیکنگ سے نکلا ہوا کھلا مال تھا ۔۔۔ہاں تم اپنے

مال پر نظر رکھو۔۔۔نگاہ بہک جائے تو بندہ بھٹک جاتا ہے۔ہر مال کو چھان پھٹک کر تھوڑا ہی دیکھا جاتا ہے ایسا مقام آئے تو دل سے برے خیالات جھٹک دیا کرو۔۔۔اسی میں عافیت اور عاقبت کی بہتری ہے، بصورت دیگر روز قیامت بڑی قباحت ہوگی۔۔۔ندامت سے کام نہیں چلے گا کہ وہاں تو بدن کا ایک ایک حصہ اعمال کی چھوٹی چھوٹی حکایت بھی اتنی تفصیل سے تلاوت کرے گا کہ دنیا کی ساری زندگی بے بندگی، شرمندگی ہی شرمندگی محسوس ہوگی۔۔اور پھر کہے دیتا ہوں۔روز قیامت، خجالت سے کام نہیں چلے گا بس اللہ کی رحمت اور حضور ﷺ کی شفاعت ہی باعث نجات ہوگی

یہ سن کر ہم اس قدر خوفزدہ ہوئے کہ پھر کبھی کسی بے تکلف دوست کو پینانگ کی سیاحت کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔

ذرا دیر بعد پنانگ کی سواریوں کو پکارا گیا۔۔ایک ہجوم اٹھ کھڑا ہوا۔ہم بھی قطار میں کھڑے ہوگئے۔۔۔۔رسمی طور پر پاسپورٹ دیکھا اور دروازہ سے اندر جانے دیا۔۔۔اس کے بعد ہم فیری میں داخل ہوئے۔۔۔ہمیں اوپری منزل پر جانے نہیں دیا گیا بلکہ ''گراؤنڈ فلور'' کے لئے اترنے والی سیڑھیوں کی طرف اشارہ کیا۔۔نیچے اترے، فیری کا ماحول پسند نہیں آیا اس میں پرانی بسوں کی طرح نشستیں تھیں ہم دونوں بیٹھ گئے اب کھڑکی سے باہر کا منظر نظر آرہا تھا۔۔۔سامان بھی داخلی دروازہ کے قریب ایک حصہ میں رکھ دیا گیا۔۔۔۔فیری روانہ ہوئی۔۔۔۔سورج ڈوبنے تک ہم سمندر اور اس کے پاس کے غیر آباد چھوٹے چھوٹے جزیرے دیکھتے رہے۔۔۔۔پھر اندھیرا ہوگیا۔۔۔TV سیٹ پر ایک غیر دلچسپ سی فلم دکھائی جارہی تھی۔۔۔۔سفر آرام دہ نہیں تھا۔۔۔۔ایک بار باتھ روم کی تلاش میں نکلے۔۔۔۔آخری سرے پر پہنچے۔۔۔TANDAS کا دروازہ دھکا دے کر کھولا۔۔۔اندر ایک پرانے زمانے کا کموڈ رکھا تھا۔آب دست کے لئے لوٹا بھی نہیں تھا۔ادھر ادھر تلاش کیا تو ایک ٹونٹی سے جڑا پلاسٹک کا ڈیڑھ فٹ لمبا پائپ پڑا تھا۔نلکا یا ٹونٹی بھی کوئی دو چار رنگٹ والی ہوگی۔۔۔حیرت ہوئی، فیری میں کیا ٹوائلٹ ایسے ہوتے ہیں۔

آٹھ بجے کے بعد ہم پینانگ پہنچے۔۔۔۔دوسرے درجہ کے ریلوے پلیٹ فارم کی طرح ایک پلیٹ فارم تھا۔۔۔تعجب اس بات پر ہوا کہ فیری جس برتھ پر جا کر رکی۔۔۔۔وہ ایک منزل اوپر تھا۔۔۔مسافروں کو کہا گیا کہ وہ، گراؤنڈ فلور سے فرسٹ فلور اور اس کے بعد سیڑھیاں چڑھ کر Deck پر چلے جائیں۔۔۔ہم نے یہی کیا۔۔۔ڈگمگاتی فیری کی چھت پر سے ہم سہارا لیتے

ہوئے چھلانگ لگا کر پلیٹ فارم پر پہنچے۔۔۔اگر بیل باٹم کا زمانہ ہوتا تو خواتین تو کسی صورت فیری سے نہیں اتر سکتی تھیں کہ بیل باٹم کا قمیض، ٹانگوں کے گرد، مشتاق یوسفی کے فقروں سے زیادہ چست ہوتا تھا یا یوں کہیے'' تنگ دامنی'' گھٹنوں کو باندھے رکھتی تھی۔۔۔قدم بھی ناپ ناپ کر فٹوں کی بجائے انچوں میں اٹھائے جاتے تھے۔۔۔۔خواتین چلتی تھیں تو لگتا تھا کہ سلوموشن میں چل رہی ہیں۔۔۔اب زمانہ بدل گیا، لباس سکڑ گیا اور دامن بھی ختم ہو گیا۔۔۔اس لئے نہ گریبان پہ ہاتھ ڈالنے کا خوف نا دامن کے تار تار ہونے کا خطرہ۔۔۔!!

تمام مسافر پلیٹ فارم پر پہنچ گئے مگر۔۔۔مسئلہ ان کے سامان کا تھا کیونکہ وہ تو نشیب میں تھا۔۔۔

دس منٹ بعد بمشکل فیری کی انتظامیہ نے اوپر نیچے کھڑے تین آدمیوں کی مدد سے سامان اوپر پہنچایا بالکل اسی طرح جس طرح 35 سال پہلے بیاہ شادی کی تقریب میں بریانی کی ڈش دیگ سے کئی میزبانوں کے ہاتھوں ہوتی ہوئی دسترخوان پر بیٹھے مہمانوں تک پہنچتی تھی۔

سامان لیکر ہم باہر نکلے۔۔۔ایک صاحب ہمارے نام کی تختی لئے کھڑے تھے۔۔۔ہم ان کے قریب گئے۔۔۔اپنا تعارف کرایا۔۔۔مسکراتے ہوئے ہمارا سامان لیا اور ہم ڈرائیور کے پیچھے چل دیئے۔

نام پوچھنے پر ڈرائیور نے بتایا۔۔۔میرا نام محمد ہے۔۔۔سن کر جی خوش ہوا۔۔۔اب ہم پینانگ شہر میں تھے۔۔

☆☆☆

پینانگ

گاڑی میں بیٹھ کر ہوٹل کے لئے روانہ ہوئے۔۔۔کوسٹر نے جیٹی سے نکل کر جیسے ہی شہر جانے والی شاہراہ پر سفر شروع کیا تو ہم حیرت زدہ رہ گئے۔۔۔آسمان کو چومتی فلک بوس عمارتیں، سڑک کے دونوں طرف قرینے اور بڑے وقار سے ایستادہ تھیں، رات کا وقت تھا ایسا لگتا تھا کہ شہر نے چمکنے والے ستاروں کی چادر اوڑھی ہوئی ہے۔۔۔اونچی اونچی عمارتیں ۔۔۔جدید ہوٹلیں۔۔۔اہم سرکاری دفاتر ۔۔۔پیچھے دوڑتے رہے۔۔۔سڑک پر ٹریفک ۔۔۔دائیں بائیں کاریں، بسیں ۔۔۔۔۔۔۔۔اور فٹ پاتھ پر پیدل چلنے والوں کی بھیڑ ۔۔۔۔کھمبوں پر ٹریفک کے نشانات۔۔۔تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ٹریفک سگنلز۔۔۔کوسٹر میں بیٹھے دائیں بائیں ہم یہ مناظر دیکھتے رہے۔۔۔

لنکاوی، ایک تفریحی مقام تھا۔۔۔عام طور پر وہاں ایک دو منزلہ عمارتیں اور چار پانچ منزلہ ہوٹلیں ہیں۔۔۔صرف کوائی کے مقام پر چند آٹھ، دس منزلہ عمارتیں دیکھی تھیں۔۔۔ان میں اکثر شاپنگ سینٹرز اور ہوٹلیں تھیں، جیٹی کے قریب کوائی کے شاپنگ سینٹرز میں لوگوں کا ہجوم اور سڑک پر معمولی ٹریفک دیکھا تھا۔۔۔لیکن ''پینانگ'' ایک شہر ہے۔

ملائیشیا میں تیرہ ریاستیں ہیں۔9 ریاستوں پر گورنرز کی حکمرانی ہوتی ہے۔۔۔لنکاوی اور پینانگ ان میں شامل ہیں۔۔۔گاڑی میں بیٹھے بیٹھے لوگوں کا جائزہ لیا قد وقامت اور رنگ وروپ سے ہمیں چینی زیادہ نظر آئے۔۔۔

ہمارا گائیڈ محمد ایک خوش اخلاق اور باتونی نوجوان تھا وہ بار بار ہم سے سوال کرتا تھا۔۔۔

آپ کو پینانگ کیسا لگ رہا ہے۔۔۔یہ میرا شہر ہے۔۔۔میں یہیں پیدا ہوا ہوں۔۔۔میم آپ کو یہ شہر کیسا لگتا ہے۔۔۔اس نے بیگم سے بھی کئی بار یہ سوال کیا ہم نے کہا بہت اچھا۔۔۔بہت خوبصورت شہر ہے۔

آپ کو لنکاوی کیسا لگا۔۔۔محمد نے پوچھا

لنکاوی، بہت پرسکون اور اچھی جگہ ہے۔۔۔ہم نے کہا۔۔۔

مگر محمد نے پھر کہا۔۔۔لیکن آپ کو پینانگ اور زیادہ پسند آئے گا۔۔۔۔۔یہ دیکھئے ۔۔۔۔فلاں ہوٹل ہے۔۔۔ یہ یہاں کی مشہور عمارت ہے۔۔۔۔اور آپ کے سیدھے ہاتھ کو سپریم کورٹ ہے۔۔۔۔ہم نے وکٹورین طرز تعمیر کی خوبصورت عمارت بھاگتے دیکھی۔۔۔۔۔سر!۔۔۔۔پینانگ آپ کو بہت پسند آئے گا۔۔۔محمد، پینانگ کے بارے میں اتنی محبت اور اپنائیت سے باتیں کر رہا تھا جیسے، پینانگ شہر نہیں اس کی محبوبہ ہے اور ہم اس کے بے تکلف دوست ہیں اچانک مجھے کراچی یاد آ گیا۔۔۔۔وہ میرا شہر تھا، مگر میں نے اپنے شہر سے اتنی شدید وابستگی کا ظہار کرنا تو کجا اس کے بارے میں اتنی اپنائیت سے کبھی سوچا بھی نہیں۔۔۔میں نے اپنے آپ سے کہا، اس شہر میں رہنے والوں نے کبھی اسے OWN نہیں کیا۔۔۔۔کراچی ۔۔۔۔غریب نواز ہے۔۔۔سب کے لئے اس کے بازو کھلے اور دل کشادہ رہتے ہے۔۔۔لیکن کوئی اس شہر کو اپنا مانتا نہیں۔۔۔ہم سب اس کے وسائل سے فائدہ ہی نہیں اٹھاتے بلکہ اسے لوٹتے رہتے ہیں سب کے گھر بھر گئے۔۔۔۔۔مگر حرص و ہوس کے در کھلے ہوئے ہیں۔۔۔میں نے سوچا محمد اسی شہر میں پیدا ہوا۔۔۔۔ پلا بڑھا۔۔۔جوان ہوا۔۔۔اب ادھیڑ عمر کا ہے۔۔۔۔اور ڈرائیوری کرتا ہے۔۔۔سچ پوچھو تو پینانگ نے اسے کچھ بھی نہیں دیا۔۔۔۔لیکن یہ

اپنے شہر سے کتنا پیار کرتا ہے۔۔۔اتنی محبت اور عقیدت سے تو ہم نے کبھی اپنے خون کے رشتوں ۔۔۔۔کی تعریف بھی نہیں کی۔۔۔۔اب کہیں جا کر سٹی ناظم مصطفیٰ کمال نے I own Karachi کا نعرہ لگایا ہے۔۔۔محمد کی آواز نے میرے خیالات کا سلسلہ توڑ دیا۔۔۔۔۔۔

سر یہ چورنگی بہت خوبصورت ہے۔۔۔۔۔یہاں سیاحوں کا ہجوم لگا رہتا ہے۔۔۔۔آپ کو یہاں کے کھانے بہت پسند آئیں گے۔۔۔۔بڑے Tasty ہوتے ہیں۔۔۔۔آپ یہاں آئے ہیں تو کومتار بلڈنگ ضرور دیکھنے جایئے گا۔۔۔۔Sleeping Budha اور اسٹیٹ مسجد بھی دیکھنے کے لائق ہے۔۔۔۔

محمد کی زبان، اور گاڑی کی رفتار بڑی خوش رفتاری سے چلتی رہی۔۔۔یہاں کون کون لوگ رہتے ہیں، میرا طلب ہے کس کمیونٹی کے لوگ زیادہ ہیں، میں نے سوال کیا۔۔۔؟؟

یہاں ملیشین رہتے ہیں، محمد نے جواب دیا۔

لیکن یہ چینی۔۔۔۔۔

بات کاٹ کر بولا۔۔۔سب ملیشینز ہیں۔۔۔۔اور یہ دیکھئے یہ بڑی خوبصورت مسجد ہے ۔۔اس کے ساتھ ہی یہ گرجا ہے۔۔۔۔ہم دیکھتے رہے۔محمد بتاتا رہا۔۔۔یہ ایک مندر ہے۔۔۔۔اور۔۔۔اور یہ مسجد ہے۔۔۔اور دیکھیں آپ کے الٹے ہاتھ کو بدھسٹ کا Temple ہے۔۔۔۔۔ہم نے پوچھنا چاہا۔۔۔مسجد کے پاس گرجا کیسے بن گیا۔۔۔۔؟؟

کیا صبح جب مندر میں گھنٹیاں بجتی ہیں تو فجر کی نماز میں خلل نہیں پڑتا۔۔؟

مسجد کے پاس یہ مندر۔۔۔۔مسلمانوں نے اس پر اعتراض نہیں کیا۔۔۔!!

ہمارے ذہن میں ایسے بہت سے سوالات تھے۔۔۔مگر ہم محمد سے پوچھ نہیں سکے۔کیونکہ ہم پہلے سوال پر ہی شرمندگی محسوس کر رہے تھے۔۔

پون گھنٹے بعد ہماری کوسٹر ایک ہوٹل کے احاطے میں داخل ہوئی۔۔۔بہت بڑا بورڈ لگا تھا۔۔۔ Bay viewBeach Resort عمارت کے پورچ میں گاڑی داخل ہوئی۔۔۔ہم گاڑی سے اترے۔۔۔محمد نے دروازہ کھولا اور ایک باوردی پورٹر ہمارا سامان اٹھانے کے لئے قریب آ گیا۔

کل ساڑھے نو بجے گاڑی آئے گی۔۔۔آپ یہیں پر آ جایئے گا۔۔۔محمد نے کہا اور سلام کر کے جانے لگا۔۔۔۔۔ہم نے اس کا شکریہ ادا کیا۔۔۔

ہوٹل کی لابی میں آئے ۔۔۔کراچی کے ہوٹل شیریٹن کی Look نظر آئی ۔۔۔لابی کے مختلف حصوں میں صوفے اور آرام دہ کرسیاں سلیقے سے رکھی گئی تھیں ۔۔بیگم ایک خالی صوفے پر بیٹھ گئیں ۔۔ہم کاؤنٹر پر پہنچے ۔۔

ہم سے پہلے ایک صاحب کاؤنٹر پر کھڑے تھے ہم قطار میں لگ گئے ۔اچٹتی نظر سے ہوٹل کا جائزہ لیا ۔۔۔خوبصورت کیپسول لفٹ ،سبک رفتاری سے اوپر جارہی تھی ۔۔۔لابی برقی قمقموں سے جگمگا رہی تھی ۔۔۔ہماری پشت پر ایک اور کاؤنٹر تھا ۔۔۔ہنستی مسکراتی لڑکیاں ،سیاحوں کو معلومات فراہم کررہی تھیں ۔۔شہر کی بعض عمارتوں اور اہم تفریحی مقامات کی بڑی بڑی تصویریں آس پاس آویزاں تھیں ہماری باری آئی ۔۔۔تو ہم نے AOS کا ایک خط مسکراتی ہوئی چپٹی ناک والی لڑکی کی طرف بڑھایا ۔اس نے برابر الماری سے ایک فائل نکالی ۔۔۔کاغذات الٹ پلٹ کر دیکھے ۔۔۔پھر مسکراتے ہوئے ایک فارم ہماری طرف بڑھا دیا ۔۔۔ہم نے ضروری کوائف درج کئے ۔۔۔اس کے بعد ایک دراز قد خاتون نے ایک فولڈر ہمارے حوالے کیا ۔۔۔دو تین لفافوں کے ساتھ ساتھ ایک چھوٹا سا جیکٹ بھی تھا ۔۔۔اس میں دو پلاسٹک کے کارڈز تھے ،بالکل بنک کے کریڈٹ کارڈز کی طرح ۔۔۔یہ آپ کا کمرہ نمبر ہے ۔۔۔اور یہ دو چابیاں ہیں ،پلاسٹک کارڈ کو انہوں نے Key کہا ۔۔۔مزید کہنے لگیں ۔۔۔ایک چابی یعنی کارڈ کمرہ کی دیوار پر لگے ہوئے ہولڈر پر لگا دیجئے ۔۔اور یہ ایک چابی ،۔۔۔آپ کے استعمال کے لئے ۔۔۔پھر کہنے لگیں آپ کے لئے جو Deluxe room بک کیا گیا تھا ۔۔۔ہم اسے Upgrade کررہے ہیں ۔

میں گھبرا گیا ۔۔۔دل میں خیال آیا کہیں یہ ہم سے مزید رقم نہ مانگ لیں اس لئے فوراً بولا ۔۔۔بہت شکریہ جو کمرہ بھی ۔۔۔

وہ سمجھ گئیں ،بات کاٹ کر بولیں ۔۔۔آپ فکر نہ کریں ،ہمارے چیف مینیجر نے آپ کے لئے بطور خاص Executive Suit دینے کی ہدایت کی ہے ۔۔۔آپ پاکستان کے مشہور ادیب ہیں ناں اس لئے یہ Complimentary ہے ۔۔وہ ہماری طرف دیکھ کر مسکرائیں ۔۔۔

ہم نے دل میں سوچا ۔۔۔ہم تو پاکستان کے مشہور ادیب نہیں ہیں ۔۔۔بس ادب کے ادنیٰ سے طالبعلم ہیں یہاں ادیب و شاعر کی یہ قدر و منزلت ۔۔۔!! حیرت ہوئی پھر خیال آیا

جاوید حسن نے ہم پر یہ تہمت لگائی ہے۔۔۔

پاکستان میں اگر کسی پانچ ستارے والی ہوٹل میں انتظامیہ کو پتہ چل جائے کہ یہ مسافر ادیب یا شاعر ہے، تو انتظامیہ کے رویہ میں سرد مہری اور ملازمین اور خدمت گاروں کے ہونٹوں پر کھلتی مسکراہٹ پھیکی پڑ جاتی ہے۔۔۔ بہر حال ہم نے ان کا شکریہ ادا کیا۔۔ جواب میں لانبے قد کی مینجر مسکرائیں اور پورٹر کو اشارہ کیا۔۔۔ وہ پہلے ہی ہمارا مختصر سا سامان ایک بڑی سی ٹرالی پر رکھے منتظر تھا۔۔۔ ہم اس کے پیچھے Lift تک آئے۔۔۔ بیگم کا چہرہ دیدنی تھا۔۔۔ وہ Lift کو استعمال کرنے سے ہمیشہ گریز کرتی ہیں ایک انجانا سا خوف ہے ان کے دل میں۔۔۔ سرگوشی میں پوچھا۔۔۔ کونسے فلور پر کمرہ ہے۔۔

میں نے کہا۔۔۔ 9th floor ۔۔۔۔۔ چپ ہو گئیں۔۔۔ لیکن خوف کے سائے چہرے پر نمایاں تھے۔۔ لفٹ کے شیشے والے بازو نصف گول دائرہ میں کھلے ہوئے تھے۔۔ چند لوگ باہر آئے۔۔۔ ہم لفٹ کے اندر گئے۔۔۔ اس سے پہلے اتنی خوبصورت lift نہیں دیکھی تھی کراچی P.C ہوٹل اور حبیب پلازہ میں بھی ایسی ہی Lifts ہیں۔۔۔ مگر یہ کہیں زیادہ جدید اور سبک رفتار۔۔۔ پورٹر نے مطلوبہ بٹن دبایا۔۔۔ نامحسوس انداز میں بغیر کسی جھٹکے کے تیز اور سبک رفتار لفٹ اوپر اٹھتی چلی گئی۔۔۔ لابی کا منظر ہم سے نیچے ہوتا گیا۔۔۔ ٹھیک سے لفٹ کو اندر سے دیکھا بھی نہیں تھا کہ بغیر آواز کے لفٹ رک گئی۔۔۔ اور ہم نویں منزل کے ایک خوبصورت حصہ میں پہنچ گئے۔۔۔ اور راہداری طے کر کے کمرہ نمبر 11 کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔۔۔ پورٹر نے Key Jacket ہم سے لیکر ایک کارڈ دروازہ کے ہینڈل کے ساتھ ایک خالی جگہ میں Insert کیا۔۔۔ دروازہ کھل گیا۔۔۔ ایک کارڈ اس نے دروازہ کے پیچھے دیوار میں لگے ہوئے ہولڈر میں رکھ دیا۔۔۔ سامان اس نے قریب ہی ایک میز پر رکھا اور چلا گیا۔۔۔ ہم نے دل میں سوچا۔۔۔۔۔ دروازہ کھولنے کے لئے دو کارڈ زیا چابیاں ہیں، ایک ہمیں دی اور دوسری چابی کو اس نے دروازہ کے ساتھ والی دیوار میں اٹکا دیا۔۔۔ کیا یہ بہتر نہیں، کہ ایک چابی ہم رکھیں اور دوسری بیگم کے پاس رہے۔۔۔ اتنی بڑی ہوٹل چلا رہے ہیں لیکن اتنی سی بات ان کی سمجھ میں نہیں آئی۔۔۔

ہم ایک اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے۔۔۔ ایک طرف باتھ روم اور دوسری طرف ڈریسنگ روم۔۔۔ وہاں ایک بڑی الماری میں سفید اجلے گاؤن۔۔۔۔۔ برسوں پہلے شیخ

منظر عالم نے ایسے گاؤن ہمیں تحفہ میں دیئے تھے ۔۔۔ہم نے گاؤن کے کالر کو پلٹ کر اس میں لگے اسٹیکر کو اس امید کے ساتھ دیکھا کہ شاید Pearl Fabric لکھا ہو۔۔۔مگر یہ منظر عالم کی فیکٹری کا بنا ہوا نہیں تھا۔۔۔ مایوسی ہوئی۔۔۔۔دو بڑے جہازی سائز کے فاضل تکیے ۔۔۔آگے بڑھے۔۔۔۔بڑا کشادہ بیڈ روم، اسی مناسبت سے ڈبل بیڈ۔۔۔اس کی سفید براق چادر پر کھلی ہوئی خوبصورت رنگوں سے مزین قبلہ رو ایک جائے نماز۔۔۔خوشی کی ایک لہر رگ و پے میں سرایت کر گئی۔لنکاوی کے ہوٹل میں ہم بیگم کی شال بچھا کر نماز ادا کرتے تھے یہاں جاء نماز موجود۔۔۔کمرے میں ایک بڑے اسکرین کا TV Set اس کے برابر لمبی میز اور اس کے نیچے ایک چھوٹا فرج۔۔۔جس میں حسب معمول کولڈ اور ہاٹ ڈرنکس کے ٹن۔۔۔پینے کے پانی کی بوتلیں ساتھ ہی دو کرسیاں، اور ایک میز۔۔۔ہم بیڈ روم کا جائزہ لے ہی رہے تھے کہ بیگم نے کمرے کے اندر ایک دروازے کے لٹو کو گھمایا تو ایک اور کمرہ۔۔۔ڈرائنگ روم یا Sitting room۔۔۔اس کمرہ میں داخل ہوئے۔۔۔ایک بڑی رائٹنگ ٹیبل پر خوبصورت پلاسٹک کا فولڈر رکھا تھا قریب ہی بال پین اور پینسل۔۔۔۔ایک دیوار کے کونے پر اونچا اسٹینڈ جس پر گلدستہ سجا ہوا اور اس کے قریب ٹرالی پر T.V سیٹ۔۔۔اس کے ساتھ ایک صوفہ سیٹ اور اس کے سامنے بڑی میز پر رنگین پنی میں لپٹی ایک پھلوں کی ٹوکری۔۔

ایک طرف میز پر الیکٹرک کیٹل اور اس کے ساتھ چائے اور کافی کا ملفوف سامان۔۔۔بیگم نے پہلے کیتلی سنبھالی۔۔۔باتھ روم سے پانی بھرا اور کہنے لگی۔۔۔ذرا باتھ روم دیکھ کر آئیں۔۔۔ہم باتھ روم میں آئے۔۔۔باتھ ٹب کے علاوہ شاور کے لئے علیحدہ کمرہ بھی موجود۔۔۔ضرورت سے زیادہ اشیاء۔۔۔یعنی شیونگ کا سامان، ٹوتھ برش اور پیسٹ ۔۔۔کنگا اور ماچس خوشبوئیں وغیرہ۔

آپ سوچتے ہونگے کہ ہوٹل کے کمرے کی اس قدر تفصیل کیوں بیان کی جارہی ہے تو عرض ہے کہ ہماری اوقات سے زیادہ آرام دہ اور توقع سے زیادہ سہولتوں سے آراستہ باتھ روم تھا۔۔۔باتھ روم سے ہم نے چھوٹی سے ماچس، قابو کی۔۔۔چائے کا کپ بیگم نے میز پر رکھا اور منہ ہاتھ دھونے چلی گئیں۔۔۔سگریٹ بہت دیر بعد پیا۔۔۔بڑا لطف آیا۔۔بہت تھکے ہوئے تھے اس لئے بستر میں جا گھسے۔۔۔ایک گھنٹہ آرام کیا۔۔۔شاور لیکر تیار ہوئے اور بیگم سے وقت پوچھا تو پتہ چلا پونے گیارہ بج رہے ہیں۔۔۔رات کے کھانے کی فکر لاحق ہوئی

۔۔۔محمد نے بتایا تھا کہ ہوٹل سے چند منٹ کے پیدل فاصلے پر ''جیسمین ہوٹل'' ہے۔۔۔جہاں تندوری روٹی ملتی ہے، اور انڈین کھانے بھی۔۔اس وقت ناگوار تو بہت گذرا کہ پاکستانی کھانوں کو دیگر ممالک کی طرح یہاں بھی انڈین کھانے کہا جاتا ہے۔۔۔لیکن جیسمین کے نام کی وجہ سے ہم نے اسی وقت طے کرلیا کہ رات کا کھانا اسی ہوٹل میں کھانا ہے۔۔۔اصل میں ہمیں جیسمین کی خوشبو پسند ہے عشائیہ کے بعد جیسمن ٹی بھی مرغوب ہے پھر ٹی وی کا ٹاک Pulse with Jasmine بھی پسند ہے، موقعہ مل جائے اور ٹی وی سامنے ہو تو ہم اس پروگرام کو ضرور دیکھتے ہیں۔۔۔اینکر پرسن جس طرح اونچی آواز اور تحکمانہ لہجہ میں تیز تیز اردو بولتی ہے اور پھر وہ اپنے ''معزز سیاستدان مہمانوں'' کے ساتھ جو ''حسن سلوک'' کرتی ہے اور اور پھر ان کے چہروں پر جو رنگ اترتے چڑھتے ہیں وہ بڑا مزہ دیتے ہیں۔

بڑی عجلت میں ہوٹل سے باہر آئے۔۔۔لیکن دروازہ بند کرنے سے پہلے ہم نے دوسرا Key card بھی دیوار سے لگے ہولڈر سے نکال کر بیگم کو دیدیا۔۔۔اور تیز تیز قدموں سے فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے ہوٹل کی تلاش میں نکلے۔

یہ علاقہ شہر سے دور تھا۔۔۔سڑک تقریباً سنسان پڑی تھی۔۔۔اکا دکا لوگ فٹ پاتھ پر آجا رہے تھے۔۔۔دائیں بائیں چھوٹی چھوٹی دکانیں تھیں۔۔۔فاصلے فاصلے سے کھانے کی ہوٹلیں بھی تھیں۔۔۔کہیں کہیں دکان سے باہر فٹ پاتھ پر ملبوسات ہینگرز میں فروخت کے لئے لٹکے ہوئے تھے۔۔۔ہمیں جیسمین ہوٹل پہنچنے کی جلدی تھی۔۔۔چند منٹ گذر گئے تو ایک دکاندار سے پوچھا انہوں نے مزید آگے جانے کا اشارہ کیا۔۔۔بالآخر ہم نے ہوٹل تلاش کرلیا۔

لیکن مایوس ہوئے کیونکہ ہوٹل بند ہو چکا تھا۔۔اب خیال آیا کہ راستے میں ایک بیکری نما دکان تھی۔۔۔چھوٹا سا اسٹور۔۔۔وہیں سے کچھ کھانے کا سامان خریدتے ہیں۔۔۔وہاں پہنچے تو جوس، کولڈ ڈرنکس اور بسکٹ کے سوا کچھ نہ تھا۔۔۔بیگم نے مکھن اور ڈبل روٹی خرید لی۔۔۔کیونکہ بسکٹ اور ٹکیاں ہمارے پاس موجود تھیں۔۔۔اب ہم واپس ہوٹل کی طرف روانہ ہوئے۔۔۔اچانک ایک دوست کی بات یاد آئی۔۔۔کہ اپنے سامان کے بارے میں محتاط رہیں، کراچی جتنے تو نہیں لیکن لوٹ مار اور چھینا چھپٹی کے واقعات یہاں بھی رونما ہوتے ہیں۔۔

تیز تیز قدموں سے واپس ہوٹل آئے۔۔۔اور کمرہ میں جانے کی بجائے لابی ہی میں بیٹھ گئے۔۔۔مسافروں کی تعداد کم تھی۔۔۔باہر ہلکی گرمی تھی لیکن لابی کا ماحول خوشگوار

تھا۔۔۔اچانک یاد آیا، ہمارے پاس ''ویلکم ڈرنکس'' کے کوپن ہیں۔۔۔انہیں استعمال کرنے کا اس سے بہتر وقت اور کیا ہوگا۔۔۔ہمارے قریب ہی ''بار کاؤنٹر'' تھا۔۔۔ہر قسم کے مشروبات وہاں موجود تھے۔۔۔ہم اپنی جگہ سے اٹھ کر کاؤنٹر پر گئے۔۔۔کوپن دیا۔۔۔مسکرا کر سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔۔۔ہمارے سامنے انہوں نے پھلوں کا تازہ جوس تیار کیا۔۔۔گلاس کی بجائے۔۔۔نازک سے دو جام ہمارے سامنے میز پر رکھ دیئے۔۔۔خوش ذائقہ جوس تھا۔۔۔تازگی سی محسوس ہوئی۔۔۔

کچھ دیر بعد ہم اوپر آئے کارڈ Insert کیا مگر دروازہ نہیں کھلا۔۔۔کئی بار کوشش کی اس کے بعد بیگم نے پرس سے دوسرا کارڈ نکالا۔۔۔انہوں نے اپنی سی کوشش کی۔۔۔مگر دروازہ نہیں کھلا۔۔۔اب ہم کیا کریں۔۔۔سوچا واپس Reception جائیں اور اپنی مشکل بتائیں۔۔۔ہم ابھی یہ سوچ ہی رہے تھے کہ۔۔۔"Lobby Boy" راہداری میں نظر آیا۔۔۔ہم نے اسے آواز دی اور اپنا مسئلہ بیان کیا۔۔۔۔ویٹر نے چابی لیکر۔۔۔یعنی Key card لیکر Insert کیا اور دروازہ کھل گیا۔۔۔ہم نے ویٹر سے پوچھا کہ دروازہ ہم سے کیوں نہیں کھلا۔۔۔ویٹر نے بتایا کہ Card اندر ڈال کر فوراً نکال لیں اور دروازہ Push کریں ہم نے ایک بار خود ایسا کیا اور دروازہ کھل گیا۔۔۔

کمرہ میں اندھیرا تھا۔۔۔ویٹر اندر آیا اور دروازہ کے پیچھے دیوار پر لگے ہولڈر کو دیکھا اور کہا دوسرا کارڈ کہاں ہے۔بیگم نے دوسرا کارڈ ویٹر کو دیدیا۔۔۔ویٹر نے کارڈ ہولڈر میں رکھا اور کمرہ روشن ہو گیا۔۔۔ہم بڑے حیران ہوئے۔۔۔دوسری چابی کے اس مصرف سے تو واقف ہی نہیں تھے۔۔۔

ویٹر اچانک کہنے لگا۔۔۔کمرہ کا A/C بند ہے۔یہاں تو بہت گرمی ہے۔۔

میں خود بند کر کے گئی تھی۔۔۔بیگم نے بڑی متانت سے کہا

No۔۔No۔۔۔AC۔۔کبھی بند نہ کیجئے۔۔۔بلب کے سوئچ بھی آف نہ کریں، آپ جب باہر سے واپس آئیں تو کمرہ ٹھنڈا ہونا چاہیئے۔۔۔ہم نے آپ کے آرام کے لئے یہ سسٹم رکھا ہے۔۔۔کمرہ ٹھنڈا ہونے میں وقت لگے گا۔۔۔اتنی دیر تک آپ بے آرام رہیں گے۔۔۔کوئی اور خدمت۔۔۔ویٹر نے پوچھا۔۔

بہت شکریہ۔۔۔

ویٹر چلا گیا۔۔۔ہم لوڈ شیڈنگ کے مارے ہوئے۔۔۔اپنے گھر میں باتھ روم کا بلب آف کرنا کبھی بھول جائیں۔۔۔تو یہی بیگم۔۔۔۔جی ہاں یہی بیگم۔۔۔انکوائری کمیٹی بٹھا دیتی ہیں۔۔۔تحقیقات ہوتی ہیں۔۔۔۔سب بچ جاتے ہیں ہم ہی آخر میں مجرم گردانے جاتے ہیں ۔۔۔یہاں ایک باتھ روم کے بلب کی بات نہیں۔۔۔درخواست کی جارہی ہے کہ AC بند نہ کیا کریں۔۔۔۔ہم نے سوچا۔۔۔۔ملائیشیا۔۔۔۔دنیا کے نقشہ میں نقطہ کے برابر ملک ہے ہم سے 10 سال بعد 31 اگست 1957 کو آزاد ہوا ہے، یہ لوگ ساڑھے تین سو سال انگریزوں کی غلامی میں رہے۔۔۔کمیونسٹوں کے ظلم برداشت کئے۔۔۔بادشاہت بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔۔۔لیکن انہوں نے مختصر سے عرصہ میں اتنی ترقی کیسے کر لی۔۔۔۔ہم نے بیگم سے بھی تذکرہ کیا۔۔۔کہنے لگیں، اتنا بڑا ہوٹل ہے۔۔۔ان کا اپنا Power Generator ہوگا، پھر ہم سے انہوں نے پیسے لئے ہیں۔۔۔مسافروں کے آرام کا خیال رکھتے ہیں۔ ہر ممکن سہولت مہیا کرتے ہیں۔۔۔تب ہی دنیا بھر سے کشاں کشاں لوگ یہاں چلے آتے ہیں۔

وہ تو ٹھیک ہے منّو! مگر ہمارے ملک میں بھی تو ہوٹل والے پیسے لیتے ہیں۔تمہیں یاد ہے کہ ایک بار سوات کے سفر میں تم نے شاہدہ سے ایک چھوٹی استری مانگ لی تھی، کئی ہوٹلوں میں ٹھہرے مگر کسی ہوٹل کی انتظامیہ نے استری کا تھری پن نہیں دیا سوات!!!۔۔۔

بیگم اداس ہوگئیں کہنے لگیں۔۔۔میں پچھلے دنوں نوشین کو اپنی پرانی تصویریں دکھا رہی تھی منگورہ۔۔۔وائٹ پیلس۔۔۔۔میاندم۔۔۔بحرین۔۔استور۔۔۔بیگم نے سوات کا ذکر چھیڑ دیا۔۔

کمرہ ٹھنڈا ہونے لگا لیکن فضاء اداس ہوگئی۔۔۔۔ہم دونوں کافی دیر تک گم صم بیٹھے رہے۔۔۔۔وقت گذرتا رہا۔۔۔کل کا سوات۔۔۔اور آج کا سوات۔۔۔!!۔۔بہر حال پہلے ،بیگم نے ٹکیاں۔۔۔بسکٹ، ڈبل روٹی اور مکھن نکالا۔۔۔چائے کا پانی رکھا۔۔۔سوات کی خوشگوار یادیں، دھندلی ہو کر دھیرے دھیرے ذہن سے محو ہوگئیں۔۔۔۔بیگم نے میز پر سامان سجایا اس کے بعد ڈرائنگ روم میں آئے

میز پر رکھی پھلوں کی ٹوکری پر نظر پڑی۔۔۔۔تمام دن اس قدر مصروف رہے کہ پھلوں کی باسکٹ کی طرف دھیان ہی نہیں گیا۔۔۔۔اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہمارے علم میں ہے کہ فرج میں رکھی اشیاء اور پھل وغیرہ استعمال کریں تو اس کی قیمت ادا کرنی ہوتی ہے۔۔۔۔ہم اپنے

رنگٹ بچانا چاہتے تھے۔۔۔اب ذرا فرصت ملی تو ہم نے وہ تین لفافے اٹھائے جو Check in کے وقت کاؤنٹر مینجر نے دیئے تھے،، پہلا خط انتظامیہ کی جانب سے تھا جس میں ہمیں خوش آمدید کہا گیا تھا اور قیام کے دوران ہمارے لئے نیک تمناؤں کا اظہار کیا تھا۔۔۔اور دوسرا خط AOS کی جانب سے تھا جس میں Pick up time ساڑھے نو بجے درج تھا۔درخواست کی گئی تھی کہ وقت کی پابندی کریں تیسرا خط ہوٹل کے جنرل مینجر کی طرف سے تھا اور انہوں نے Fruit Basket تحفہ کے طور پر بھیجی تھی ہم نے بیگم کو آخری خط پڑھ کر سنایا تو وہ خوش ہوگئیں ۔۔۔۔اب ہم نے غور سے پھلوں کی ٹوکری پر نظر ڈالی۔۔۔خوبصورت پیکنگ کی پنی اتاری ۔۔۔۔انناس۔سنگترہ۔آم۔بڑے سیاہ انگوروں کا گچھا۔۔۔ایک سرخ سیب ایک ہرے رنگ کا چھوٹا سیب

رات کے کھانے کا اللہ تعالیٰ نے بندوبست کر دیا۔۔۔بیگم نے چائے کی بجائے کافی بنانے کا فیصلہ کیا۔۔۔ہم نے اس دوران صبح کا پروگرام ذہن میں تازہ کیا۔۔۔کچھ کھایا پیا۔۔۔ ہمیں صبح ساڑھے نو بجے سٹی ٹور پر جانا ہے ۔۔۔وقت کی پابندی لازمی تھی۔۔۔شیو کرنا ۔۔۔شاور لینا۔۔۔نماز۔۔۔صبح ناشتہ اور سوا نو بجے لابی میں تیار ہو کر پہنچنا۔

یہ سارے کام اس وقت ممکن ہیں جب ہم ۷ بجے بستر چھوڑ دیں بیگم نے کہا کہ سویرے اٹھنا آپ کے لئے تو زندگی کا مشکل ترین کام ہے میری رائے میں تو آپ نیند کی گولی لے لیں اور سو جائیں۔بیگم نے مشورہ دیا۔

وہ تو ٹھیک ہے مگر نیند کی گولی لیکر بھی نیند ڈیڑھ دو گھنٹے بعد آتی ہے۔۔۔بیس سال ہو گئے گولی کا اثر بھی ختم ہو گیا ۔۔۔میں تو بس نیند کی گولی کے ساتھ وضعداری نبھا رہا ہوں ۔۔۔۔۔لیکن ہم صبح سویرے اٹھیں گے کیسے۔۔۔؟

اس کے لئے آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں ۔۔۔40 سال میں کبھی مقررہ وقت پر آپ کو جگانے میں ایک منٹ کی بھی تاخیر ہوئی ہے۔۔۔بتائیں،

وہ تو ٹھیک ہے،تم بھی تھکی ہوئی ہو۔۔۔پردیس کا معاملہ۔۔۔نیا ماحول۔۔۔رسک نہیں لیا جا سکتا۔۔۔یہ کہکر میں نے فون کا رسیور اٹھایا اور آپریٹر سے کہا کہ ہمیں ساڑھے سات بجے اٹھا دیں۔۔۔بیناگ کی اس بڑی ہوٹل میں بھی مقامی TV Channels کے علاوہ کوئی غیر ملکی چینل نہیں تھا۔۔۔ملائے ۔۔۔چینی اور تامل ہمیں نہیں آتی۔۔۔اتنی جلدی نیند بھی

نہیں آتی۔۔۔بہرحال بستر پر لیٹ گئے۔۔۔۔جانے کب آنکھ لگی۔

صبح ٹیلی فون کی آواز پر آنکھ کھلی۔۔۔۔آپریٹر نے بتایا ساڑھے سات بجے ہیں۔بیگم پہلے سے تیار تھیں۔۔۔ہم بھی شاور لینے باتھ روم میں چلے گئے۔تیار ہوکر لفٹ کے ذریعہ Reception سے نیچے فلور پر پہونچے۔۔۔۔لفٹ سے اترے تو ہمارے سامنے ایک اور لفٹ کا دروازہ تھا۔۔۔یہ وہ لفٹ ہے جسے ہم نے ہوٹل میں داخل ہوتے وقت ہوٹل کے بیرونی حصہ میں دیکھا تھا کیپسول لفٹ بالکل PC Hotel کی طرح۔مگر کہیں زیادہ جدید

Dinning Hall میں پہونچے۔۔۔اپنا کوپن دکھایا۔۔۔ڈیڑھ سو سے زیادہ مسافر ناشتہ میں مصروف تھے۔۔۔کاؤنٹر سے ہمیں ایک پلاسٹک کی stick ملی جس پر Reserved لکھا تھا۔۔۔ہم نے ایک میز منتخب کی اور میز پر رکھے ایک خوبصورت مگ میں اسٹک کھڑی کر دی۔۔۔ہم مطمئن ہوگئے کہ یہ ہماری ٹیبل ہے۔۔۔اب جو بوفے کی طرف بڑھے ۔۔۔۔حیران رہ گئے۔۔۔ہمارے ذہن میں Holiday Resort Langkawi ہی کا ناشتہ تھا۔۔۔۔یہاں تو سینکڑوں چیزیں تھیں۔۔۔۔زیادہ معیاری، بہتر قرینہ مقابلتاً زیادہ سلیقہ اور وافر مقدار میں کھانے پینے کی چیزیں۔۔۔تمام پھل موجود تھے۔۔۔بعض، مقامی بھی تھے یعنی پاکستان میں وہ پھل نہیں ہوتے تربوز ہمیں پسند ہے۔۔۔لیکن لنکاوی کا تربوز ہم نہیں بھول سکے۔۔۔

ناشتہ کر کے کافی پی۔۔۔۔اور ہم ساڑھے نو بجے لابی میں آگئے۔چند منٹ بعد ہی محمد گائیڈ ہمیں لینے آگیا۔۔۔۔پوری کوسٹر میں ہم دو ہی مسافر تھے۔

سٹی ٹور شروع ہوا۔۔۔یہ علاقہ Batu Ferrighi Beach کہلاتا ہے۔۔۔سڑک کا نام ''باتو فرنگی'' ہے۔۔۔محمد نے بتایا کہ فرنگی سے مراد غیر ملکی یعنی وہی معنی جو ہمارے یہاں رائج ہیں۔۔۔۔یہ دورویہ سڑک تھی، زیادہ کشادہ نہیں تھی۔۔۔دونوں طرف عمدہ اینٹوں کا خوبصورت فٹ پاتھ۔۔۔۔ہوٹل جیسمین سے گذرے اب تمام مناظر اجنبی تھے، سورج چمک رہا تھا ۔۔۔۔گاڑی سے باہر خاصی تمازت تھی۔۔۔۔دکانوں اور ہوٹلوں کے عقب میں سبزہ ہی سبزہ ۔۔۔درخت ہی درخت بائیں جانب اوپر تک اٹھے ہوئے پہاڑ اور ان میں ڈھلے ڈھلائے درخت۔۔۔۔۔ذرا آگے بڑھے تو Sea food village پر نظر پڑی کشتی کی طرز پر ہوٹل کی عمارت تعمیر کی گئی تھی۔۔۔آگے ایک چھوٹی مارکیٹ Happy Mart۔۔۔گاڑی آگے بڑھی تو

سیدھے ہاتھ کو سمندر۔۔۔۔اور اتنا قریب کہ فٹ پاتھ سے نیچے قدم رکھو تو سمندر کی بھیگی ریت ''پائے لاگوں'' کہہ کر تلوے چاٹنے لگے۔۔۔۔دل چاہا گاڑی سے اتر کر ننگے پیر ریت پہ کھڑے ہو جائیں تاکہ گیلی ریت میں چھپے پانی کی نمی تلوؤں کو چھو کر رگ وپے میں سرایت کر جائے۔۔۔۔سنا تھا سمندر کا پانی کنارے کھڑے لوگوں کو اپنی لہریں بھیج کر بلاتا ہے۔۔۔لیکن گاڑی آگے نکل گئی۔۔۔ساحل پر ننگے پاؤں کھڑے ہونے کی خواہش پیچھے رہ گئی۔۔۔۔۔بائیں جانب دیکھا تو محسوس ہوا کہ ہم مری جا رہے ہیں۔بیگم نے توجہ دلائی دیکھیں بالکل مری کا راستہ ہے۔۔۔فرق اتنا کہ مری میں اونچے اونچے درخت ہیں اور یہاں بازو کی طرح کھلی ہوئی شاخیں ایک دائرہ سا بنائے ہوتی ہیں، یہاں کے درخت نیم اور پیپل کے درختوں کی طرح۔۔۔گھنے اور چھتنار ہیں۔۔۔۔سڑک کے ایک کنارے سمندر کی لہریں سر ٹپک رہی تھیں اور دوسری جانب پہاڑی پر درختوں کا ہجوم۔۔۔انہی درختوں کے درمیان بیس بیس منزلہ رہائشی عمارتیں اور ہوٹلیں۔۔۔۔۔۔راستہ میں ایک مقام آیا جسے ''میامی بیچ'' کہا جاتا ہے یوں تو امریکہ کی ریاست فلوریڈا میں میامی بیچ بہت مشہور ہے۔۔۔اپنے بھتیجے ظفیر صدیقی کے ساتھ ہم نے بھی میامی بیچ دیکھی ہے۔۔۔۔دن میں بھی اور رات میں بھی۔۔۔۔۔پینانگ کی میامی بیچ۔۔۔۔تو میامی بیچ کا چربہ بھی نہیں تھی۔۔۔۔اصل میں سڑک کے کنارے کنارے سمندر کا ساحل ہمارے ساتھ سفر کر رہا تھا۔۔۔۔میامی کے مقام پر باقاعدہ ایک راستہ ساحل تک جاتا تھا۔۔۔۔۔بہت سی کاریں اور گاڑیاں کھڑی تھیں۔۔۔۔اسکوٹرز بھی پارک تھے۔۔۔۔سمندر میں چھوٹی بڑی کشتیاں بھی تھیں اور ساحل پر لوگ بھی تھے یوں تو ساحل کا یہ حصہ بے حد طویل ہے۔۔۔لیکن اس مقام کو سیاحوں کے لئے مختص کیا گیا ہے۔اور اس کا نام میامی بیچ رکھ دیا گیا ہے۔

کوسٹر آگ بڑھتی رہی۔۔۔۔راستے کے دونوں طرف اس قدر خوبصورت اور سحر انگیز مناظر تھے کہ ہم ان میں کھو گئے۔۔۔خوابوں میں اور یادوں میں۔۔۔۔۔سمندر کے ساتھ ساتھ۔۔۔ساحل پر ایسے مقامات بھی آئے جہاں بڑے بڑے پتھر۔۔۔پتھر کیا۔۔۔پہاڑی کے ٹکڑے۔۔۔۔ہم نے منوڑہ میں ایسے چند ٹیلے یا بڑے پتھر دیکھے ہیں جہاں کبھی کبھی ناراض سمندر کی بپھری ہوئی لہریں پتھر کو بگھونے چلی آتی ہیں۔۔۔۔لیکن یہاں یعنی باتو فرنگی پینانگ میں ساحل پر بڑے بڑے، چکنے چکنے اور طرح طرح کے پتھر۔۔۔جی چاہا گاڑی رکوا کر کسی ایک پتھر کی پیالی نما چوٹی پر بیٹھ جائیں اور لہریں گننا شروع کریں۔۔۔۔کبھی چھت پر لیٹ کر تارے بھی

تو گنا کرتے تھے۔۔۔کئی میل تک ہم اس منظر سے لطف اندوز ہوتے رہے۔۔۔سمندر میں دور ونزدیک لاتعداد کشتیاں۔۔۔قد وقامت۔۔۔ڈیزائن، اور نشستوں کی تعداد کے اعتبار سے ان کے نام بھی مختلف ہیں، ایک چھوٹی کشتی دیکھی 40 sail catamaran اس کے اوپری حصہ میں کوسٹر کی طرح ۱۲ مسافروں کی نشستیں ہیں۔

100 sail schoonet کشتی۔۔۔۔چار بڑے بڑے بادبان اس میں ۶۰ افراد کی گنجائش ایک اور خوبصورت کشتی صرف ایک بادبان 55 sail honahul۔۔۔اس کے علاوہ بھی چھوٹی چھوٹی کشتیاں۔۔۔۔بہت دور۔۔۔بحری جہاز۔۔۔کوسٹر چلتی رہی، سمندر کے مناظر آنکھوں سے یادوں کی باؤلی میں اترتے گئے۔۔۔کئی میل کے سفر کے بعد سمندر دور تو نہیں ہوا لیکن ساحل پر عمارتیں نظر آنے لگیں۔

اسی دوران۔۔۔اچانک۔۔۔پہاڑوں میں ایستادہ درختوں کی شاخوں میں بادل الجھنے لگے۔۔۔دودھیا۔۔۔سرمئی۔۔۔گہرے اور گھنے بادل۔۔۔بیگم بے اختیار بولیں۔۔۔بالکل مری کا منظر ہے۔۔۔گاڑی سے باہر ہوتے تو ہم شاید ذرا اوپر جا کر ان بادلوں کو چھو سکتے تھے۔۔۔یاد ہے نا ایک بار مری میں، شاید مال روڈ پر اتنے گھنے بادل امڈ کر آ گئے۔۔۔کہ سارے منظر بادلوں میں چھپ گئے۔۔۔چہرے پر نمی کا احساس ہونے لگا۔۔۔ایک دوسرے کے چہرے دھندلے نظر آنے لگے۔

ٹھیک یاد دلایا۔۔۔ایسے ہی بادل تھے۔۔۔

اشجار وہی۔۔۔بادل بھی وہی۔۔منظر بھی وہی۔۔۔مگر دیس پرایا ہے۔۔۔عمارتوں کے درمیان خالی جگہ سے اب سمندر نظر آتا تھا۔۔۔تاہم پہاڑ بدستور ہمارے ساتھ ساتھ تھے۔۔۔اوران پہاڑوں کے دامن میں فلک بوس عمارتیں۔۔

یہاں رہائشی عمارتیں سادہ ہیں۔۔۔جن عمارتوں میں گیلری نہیں ہوتی وہ چھوٹے فلیٹ ہیں کم آمدنی والے افراد کے لئے۔۔۔جن رہائشی عمارتوں کے فلیٹوں میں گیلری ہوتی ہے۔۔۔وہ نسبتاً بہتر آمدنی والے افراد کے لئے حکومت نے تعمیر کئے ہیں۔۔۔ان میں نجی سرمایہ کاروں کا تعاون بھی شامل ہوتا ہے۔۔۔۔تصدیق نہیں لیکن لوگوں سے دریافت کرنے پر پتہ چلا ہے کہ یہاں کوئی شخص بے گھر نہیں۔۔۔!!!

رہائش کے معاملے میں ہم کہاں کھڑے ہیں؟

سوچئے آبادی کے ایک بڑے حصے کے سر پر چھت تو دور کی بات ہے کھڑے ہونے کے لئے گھر کا صحن بھی نہیں ہے۔۔۔لیکن اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ بمبئی کلکتہ کے مقابلے میں کراچی ،لاہور، اسلام آباد، ایسے شہر ہیں جہاں لوگ فٹ پاتھ پر نہیں سوتے ۔۔۔اللہ کے فضل سے پاکستان میں سرکاری زمین بہت ہے۔۔۔آپ قبضہ کر کے جھگی بنالیں۔۔۔جمہوری دور آئے۔۔۔ جب بھی آئے گا وزیر اعظم اپنے پہلے ہی خطاب میں کچی بستیوں کو مالکانہ حقوق دینے کا اعلان کردے گا۔۔۔مجبوری سفید پوش طبقہ کی ہے کہ وہ کسی زمین پر قبضہ کر کے جھگی نہیں بنا سکتا۔۔۔معاف کیجئے گا ہم بھی وہی دکھڑے لے بیٹھے جن سے عارضی طور پر نجات پانے کے لئے۔۔۔تفریح کی خاطر چند دن گذارنے یہاں آئے ہیں۔۔

لیجئے۔۔۔یہ تو ہم کسی جدید ترقی یافتہ شہر میں داخل ہو گئے۔۔چاروں طرف فلک بوس عمارتیں۔۔۔آسمان سے باتیں کرتی ہوئی بلڈنگز۔۔۔50.50 منزلہ۔۔۔۔۔اور محمد نے بتایا کہ یہ سامنے KOMTAR Tower ہے۔۔۔۔65 منزلہ۔۔۔کوسٹر میں بیٹھے بیٹھے مختلف پہلو بدل کر دیکھنا چاہا مگر ٹاور کی آخری منزل نظر نہیں آئی۔۔۔۔یہ شہر کا ڈاؤن ٹاؤن ہے یہی سٹی سینٹر کہلاتا ہے۔۔۔صاف ستھری سڑکیں۔۔۔۔باقاعدہ رواں ٹریفک۔۔۔فٹ پاتھ اور دکانوں پر عوام کا ہجوم۔۔۔اور عوام۔۔۔سمجھو دنیا بھر کے لوگ جمع ہیں مختلف صورت شکل، رنگ ونسل اور مذہب وملت کے لوگ۔۔۔۔اکثر ہمیں چینی نظر آئے۔۔اصل میں جاپان، سنگاپور، تھائی لینڈ وغیرہ کے لوگ ملتے جلتے ہوتے ہیں اس لئے ہمارے لئے شناخت مشکل ہے۔۔پینانگ میں بدھ مت کے ماننے والوں کی اکثریت ہے۔۔۔شہر کی کل آبادی میں 40 فیصد چینی ہیں۔۔۔۔لیکن ان میں مختلف فرقے ہیں۔۔۔مگر آپس میں لڑتے نہیں۔۔۔۔ایک دوسرے کی عبادت گاہوں پر خودکش حملے ہوں تو ان میں تمیز پیدا کی جائے۔۔۔اس لمبے راستے میں ہم نے کل بھی مسجد و مندر و کلیسا اور ٹیمپل ایک ساتھ دیکھے تھے۔۔۔۔اب بھی دیکھے۔۔۔قریب۔۔۔قریب۔ لیکن۔۔۔۔ لڑائی جھگڑا ۔۔۔دنگا فساد ۔۔۔جلسہ جلوس۔۔۔ملائیشیا کے عوام ان لفظوں سے واقف نہیں ۔۔۔بڑے خوش بخت ہیں۔۔انہیں تو فرقہ واریت علاقائی نسبت، لسانی عصبیت، دینی مسلک علاقہ واریت اور صوبائیت کے معنی بھی نہیں معلوم۔۔۔۔ہماری تو کئی نسلیں انہی لفظوں کے معنی ومفہوم کو سمجھنے، انہیں اختیار کرنے اور پھر اپنے مخالفین سے نفرت کرتے کرتے اللہ کو پیاری ہو گئیں۔۔۔۔ برصغیر میں اسلام پہلی صدی

ہجری میں پہنچ گیا تھا۔۔۔ان علاقوں میں اسلامی تعلیمات بہت بعد میں پہنچی۔۔ہمارا حافظہ کمزور اور بات شاید پرانی تھی اس لئے بھول گئے مگر محمد کو یاد ہے۔۔۔۔ملائیشیا کے تمام لوگوں کو یاد ہے کہ ۔۔۔۔مذہبی رواداری۔۔۔امن پسندی۔۔۔۔عفو و درگذر۔۔۔۔حسن اخلاق۔۔۔نرمی اور شائستگی۔۔۔۔ادب وآداب۔۔۔۔اور میل ملاپ کی اسلام میں کیا اہمیت ہے۔۔۔۔انسان سے دشمنی۔۔۔دلشکنی اور، اس کی بے توقیری۔۔۔مذہب میں شدت پسندی ایسے لفظوں سے یہاں کے لوگ واقف نہیں۔

گاڑی کو بریک لگا تو خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔۔۔ٹریفک سگنل پر سرخ بتی دیکھ کر کوسٹر رک گئی۔۔۔۔علاقہ میں بلا کی چہل پہل۔۔۔لوگوں کا اژدھام۔۔۔۔کاروں اور گاڑیوں کی رواں لمبی قطاریں۔۔۔۔اب تک کوئی بڑی گاڑی نہیں دیکھی۔۔۔چھوٹی اور سستی گاڑیاں ہزار بارہ سو cc کی گاڑیاں۔۔۔۔ٹریفک جام نہیں ملا۔۔۔۔سگنل پر سبز بتی جلی تو کوسٹر بھی روانہ ہوئی ۔۔۔ذرا آگے بڑھے تو ایک بازار ہمارے یہاں کے جمعہ بازار کی طرح۔۔۔۔محمد نے بتایا کہ یہ ''بنڈل بازار'' ہے یہاں سستے اور پرانے کپڑے ملتے ہیں ضرورت کی اور اشیاء بھی فروخت ہوتی ہیں۔۔۔۔یہ یہاں کا لنڈا بازار ہے۔۔۔غریبوں کا بازار کسی بھی ملک میں ہو نام بھی گنوار وجیسا ہی ہوتا ہے۔۔۔ہمیں تو بنڈل بازار اور لنڈا بازار ایک سے لگے۔۔۔۔محمد آس پاس کے بارے میں بتاتا رہا۔۔۔۔اپنے شہر کی ہر چیز کی تعریف کرتا رہا۔۔۔۔آپ یہاں بھی ضرور آیئے گا۔۔۔اس بلڈنگ کو بھی ضرور دیکھئے گا۔۔۔۔یہاں کوئی Tension نہیں ہے۔۔۔۔آپ Enjoy کریں گے۔۔۔۔

محمد، بہت خوش مزاج گائیڈ تھا۔۔۔۔راستے میں کئی پرائیوٹ اسکول دیکھے۔۔۔ابھی ایک چینی گرلز اسکول دیکھا تین منزلہ خوبصورت عمارت۔۔۔میدان میں طلبہ و طالبات کا ہجوم ۔۔۔۔بچے کھیل رہے تھے۔۔۔۔شاید بریک ہوا تھا۔۔۔۔آگے بڑھے تو ایک ہوٹل پر نظر پڑی یہ زبیدہ ہوٹل کہلاتی ہے مگر لکھتے وقت z کے بجائے s استعمال ہوا تھا یعنی Subaida ۔۔۔۔۔۔۔اس کے علاوہ یہاں c کا انگریزی لفظ چ کی آواز میں استعمال ہوتا ہے ہم چ کے لئے ch لکھتے ہیں۔۔۔۔ملائے میں c کافی ہے ملائے زبان چ کے لئے c کے ساتھ h کا بوجھ برداشت نہیں کرتی۔۔۔۔ہمیں محمد نے بتایا کہ زبیدہ ہوٹل۔۔۔۔''انڈین مسلم ہوٹل'' ہے اور بہت مشہور ہے۔

بیگم نے خواہش کی کہ کسی شام یہاں کھانا کھانے آئیں گے۔

شہر کا تجارتی علاقہ ختم ہوا۔۔۔سڑک کنارے چھوٹی چھوٹی بستیاں ۔۔۔چھوٹے چھوٹے ہوٹل۔۔۔ کیفے۔۔۔ریستوران۔۔۔دکانیں ۔۔۔ایک جگہ درختوں کے بیچوں بیچ ایک چھوٹی سی رہائشی بستی۔۔۔تمام مکانات ایک سے ۔۔۔ایک منزلہ یا دو منزلہ۔۔۔۔سرخ اینٹوں ایسی جھگی نما چھتیں۔۔یہ مقامی طرز تعمیر ملا ایشین اسٹائل کہلاتا ہے۔۔۔۔اونچی عمارتوں کے علاوہ تمام مکانات۔۔گھر۔۔دکانیں ۔۔۔ہوٹل۔۔سب کی چھتیں اسی انداز کی ہوتی ہیں۔۔بس مری اور ایوبیہ کی طرح چھتوں میں چمنیاں نہیں ہیں۔۔۔اس لئے کہ یہاں نہ سردی پڑتی ہے اور نہ برف باری ہوتی ہے بارہ مہینے ایک سا موسم رہتا ہے۔۔۔۔۔راستے میں ایک مندر دیکھا۔۔۔بے حد خوبصورت۔۔۔سنہری کلس۔۔۔چھوٹے چھوٹے درجنوں گنبد، ان میں ایک بہت بڑا۔۔۔۔۔گاڑی سے گذرتے دیکھا۔۔۔ذرا آگے چلے تو ایک اور مندر دیکھا لیکن یہ بس ایک دکان کے برابر تھا۔۔۔شاید اس علاقہ میں ہندو آبادی کم ہوگی۔

اور آگے چلے ایک مقام پر ۔۔۔۔گاڑیوں کا ایک ہجوم تھا۔۔۔آس پاس کی سڑکوں، گلیوں اور میدانوں میں بہت سی کاریں، بسیں، ویگنیں پارک تھیں۔۔۔۔سامنے ایک بڑا چینی طرز کا کھلا دروازہ اس کے قریب ہی ایک سونیر شاپ۔۔۔۔کافی و کولڈ ڈرنک کی دکانیں ۔۔۔۔یہاں بڑی مہارت سے محمد نے اپنی گاڑی پارک کی۔۔۔۔یہ ہماری پہلی منزل تھی۔۔۔۔ایک گھنٹہ ہے آپ کے پاس محمد نے کہا۔

☆☆☆

بوٹونیکل گارڈن

ہم سائنس کے طالب علم کبھی نہیں رہے، اسکول میں جیومیٹری اور الجبرا پڑھا تھا۔۔۔ عاد اعظم ذو اضعاف عقل۔۔۔ٹرائی اینگل۔۔۔۔اور اسکوائر۔۔اس وقت بھی سمجھ میں نہیں آتے تھے۔۔۔۔اب اس عمر میں ہم نباتات کا باغ دیکھ کر کیا کریں گے۔۔۔۔لیکن حضرت علیؓ کا قول یاد آ گیا۔۔۔علم مومن کی میراث ہے جہاں ملے، جس سے ملے ضرور حاصل کرو۔۔۔بس ہم خوش خوش باغ میں داخل ہوگئے۔۔۔صدر دروازہ ہی سے سڑک بلندی کی طرف جا رہی تھی۔۔۔۔یعنی چڑھائی تھی۔۔۔دائیں بائیں دیکھا۔۔۔درخت ہی درخت۔۔۔۔۔گذشتہ چار دن سے ہم انہی درختوں کو دیکھتے آ رہے ہیں۔۔۔لیکن یہاں پہونچ کر درختوں کو قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا۔۔۔۔عجیب وضع قطع کے درخت۔۔۔بونے۔۔۔۔اور اونچے۔۔۔۔کچھ گنجے۔۔۔کچھ چھتنار۔۔۔کم شاخوں والے بھی اور گھنے درخت بھی۔۔۔انتظامیہ نے ان درختوں کے درمیان نہایت مہارت سے آرام دہ اور خوبصورت راہداریاں تعمیر کی تھیں۔۔۔اندر داخل ہوتے ہی، ایک مہکار سی تھی جو ہر سو پھیلی ہوئی تھی یہ کیسی خوشبو تھی۔۔۔۔اسے کیا نام دیا جائے۔۔۔۔لیکن مشام جاں کو بھلی لگ رہی تھی۔۔۔ہر سانس میں تازہ اور مہکتی ہوا کا احساس ہوتا تھا۔۔۔۔یہاں سیاح موجود تھے۔۔۔۔مگر تعداد زیادہ نہیں تھی۔۔ممکن ہے آگے کسی خاص Spot پر سیاحوں کا مجمع نظر آئے۔

آگے بڑھے۔۔۔۔سڑک کے کنارے کھڑے بوڑھے درختوں کے قریب گئے تو معلوم ہوا کہ ہر درخت کے تنے پر ایک ٹن کی تختی لگی ہے اور اس پر شجر کا شجرہ نصب تھا۔

باٹونیکل گارڈن اس شہر کا تاریخی باغ ہے 1830ء میں انگریزوں نے قائم کیا تھا۔تقریباً 170 ایکڑ پر پھیلا ہوا ہے۔۔اس باغ میں دنیا بھر سے درخت لا کر لگائے گئے تھے جو اب عمر رسیدہ ہو گئے ہیں بیشتر درختوں پر 1938 کا سال درج ہے۔۔۔اکثر درخت ہم سے پانچ سال بڑے ہیں۔۔۔درختوں کی قومیت بھی درج ہے۔۔۔بیشتر درخت امریکہ کے Tropical areas سے لائے گئے تھے۔۔۔۔سیاحوں کی معلومات کے لئے ہر درخت کا نام ونسب اس کی صفات وثمرات

کی تفصیل بھی درج تھی۔۔۔ ہمارے لئے تو اجنبی اجنبی سے تھے کہ ہمارے ملک میں ایسی صورت شکل کے درخت ناپید ہیں۔۔۔ جڑوں سے لیکر اوپر شاخوں تک بڑے حیرت انگیز اور پراسرار لگ رہے تھے۔۔۔ ان درختوں کے گرد کھڑے ہو کر سیاح تصویریں بنوا رہے تھے۔۔۔ بعض لوگ اپنی یاداشت کے لئے Notes بھی لے رہے تھے۔۔

ان درختوں پر لگی ''Name Plates'' دیکھ کر یونہی خیال آیا کہ انگریزوں کو حسب نسب کا کس قدر خیال ہے۔۔۔ ایک ایک درخت کی تاریخ پیدائش سے لیکر ان کی صفات و ثمرات کے بارے میں تفصیل درج تھی۔۔۔ لیکن یہ گورے اپنے حسب نسب کے بارے میں بالکل کورے ہیں۔۔۔ بہت سوں کو ماں باپ کے بارے میں معلومات نہیں اکثر دادا کے نام سے واقف نہیں، ان درختوں کی طرح اپنا شجرہ نسب یاد کر لیتے تو دوسری قوموں کو حقیر نہیں سمجھتے۔۔۔ اس باب میں شاید اس لئے توجہ نہیں دی کہ علم درائیت کی رو سے روایت کے راوی کا سلسلہ ٹوٹ ٹوٹ جاتا ہے۔۔۔ ہاں لوٹ لوٹ کر مقبوضہ علاقوں سے لایا ہوا سامان، نادر اشیاء کے طور پر عجائب گھروں میں سجایا جا سکتا ہے، انہیں درختوں، گھوڑوں اور کتوں کے اجداد کی فکر رہتی ہے۔۔۔ مگر اپنے آبا و اجداد کا ذکر کرنے سے گریز کرتے ہیں۔

ہمیں یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی تھی کہ ملائیشیا میں رنگ و نسل ۔۔۔ ملک و ملت، عقیدہ و مذہب کی کوئی تمیز نہیں ۔۔۔ تمام لوگ محبِ وطن ہیں ۔۔ ملائیشین کہلانے پر فخر محسوس کرتے ہیں لیکن نباتاتی پارک میں یہ تمیز برقرار ہے۔۔۔ اس کا بڑا صدمہ ہوا، غیر ملکی آقاؤں کے لائے ہوئے درختوں کو سڑک کے کنارے صف اول میں جگہ دی گئی ہے ان کا حسب نسب بھی درج کر دیا گیا اور ملت و قومیت اور اوصاف و کمالات بھی درج کئے گئے ہیں لیکن مقامی درخت یعنی ماضی کے غلام درختوں کو کونے کھدروں میں یا پارک کے دور افتادہ اور نواحی حصوں میں لگایا گیا ہے۔۔۔ حالانکہ مالائیشیا کے درخت پھل بھی دیتے ہیں اور دودھ بھی (ربر کا درخت) ثمر دار بھی ہوتے ہیں اور ''گل برتاک'' بھی۔۔۔ انگریزوں نے ''تقسیم کرو اور حکومت کرو'' کے جس اصول پر چل کر یہاں تین سو سال حکمرانی کی۔۔۔ وہ یہاں کی سماجی زندگی میں تو ختم ہو گئی۔۔۔ مگر نباتاتی زندگی میں موجود ہیں۔۔۔ شاید سیاحوں کی دلچسپی کے لئے۔۔۔ کیونکہ سیاحت ملائیشیا کی بڑی صنعتوں میں سے ایک ہے۔

ایک بڑی درخت دیکھا۔۔۔ گہری جڑوں اور مضبوط تنے کے ساتھ اوپر بہت اوپر تک

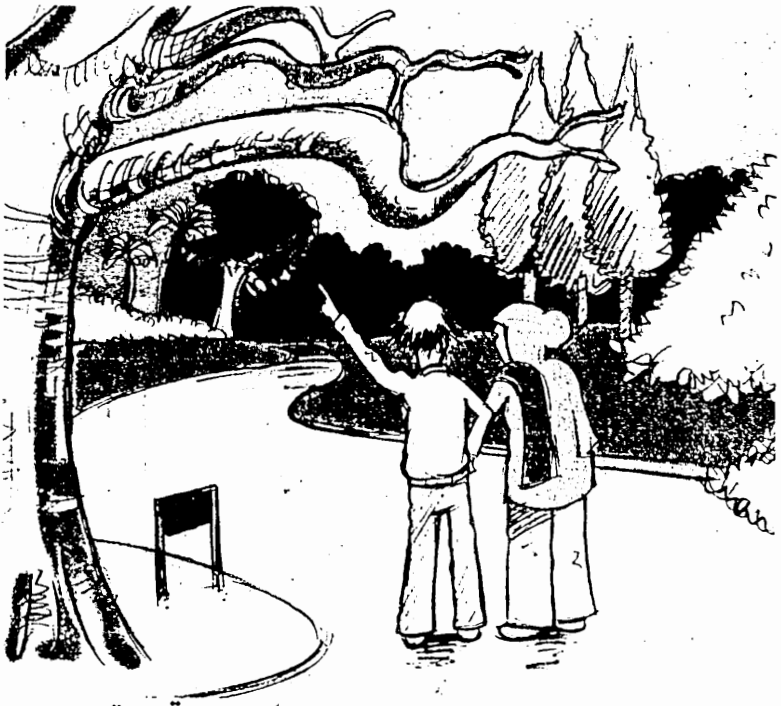

چلا گیا تھا۔۔۔سڑک کے کنارہ یہ درخت لگایا گیا ہے، اس کی لکڑی بہت قیمتی ہوتی ہے ہمارے ہاں ساگوان نفیس فرنیچر بنانے کے کام آتی ہے۔۔۔۔ہم نے بھی سالخوردہ اور بزرگ درختوں کے سائے تلے، کھڑے ہوکر تصویریں بنوائیں۔۔۔عمر میں یہ درخت ہم سے بڑے تھے اس لئے ہم نے ان کے قدموں میں کھڑے ہوکر فوٹو اتروائے۔۔۔ہمارے لاشعور میں بھی تو آقا اور غلام کا رشتہ موجود ہے۔۔۔۔ہمارے بڑوں کے آقاؤں نے ہی تو یہ درخت یہاں لگائے تھے۔۔۔۔حالانکہ ہمارے بزرگوں نے جو برگد کے پیڑ لگائے تھے۔۔۔۔وہ بوڑھے برگد آج بھی گلی محلوں میں سرسبز و شاداب کھڑے ہیں۔۔۔نیم اور پیپل تو سایہ بھی بہت دیتے ہیں۔۔۔مگر پاکستان میں ہم نے کسی کو ان درختوں کے نیچے کھڑے ہوکر فوٹو بنواتے نہیں دیکھا۔۔۔۔ریڈیو پاکستان کراچی کے صحن میں تو اب تک وہ برگد کا بوڑھا پیڑ کھڑا ہے جس کے سائے تلے سینکڑوں نامور اور بزرگ فنکاروں کے بچپن کی یادیں۔۔۔۔چڑھتی جوانی کے قصے، معصوم خواہشیں اور ادھورے ارمان دفن ہیں چند مہینوں پہلے تک مرحوم محمود علی واحد فنکار تھے جو ہر ماہ پینشن لینے آتے تو گھڑی دو گھڑی اس بوڑھے برگد کے نیچے کھڑے ہوکر کسی سے بات کر لیتے تھے۔۔۔اب تو

ایک قاضی واجد رہ گئے ہیں جو اپنی کار اس پیڑ کے نیچے کھڑی کر کے پینشن وصول کرنے آتے ہیں۔۔۔اگر غور کریں تو یہ درخت بھی آقاؤں ہی کے ہاتھ کا لگا ہوا ہے۔۔۔ہم نے نباتاتی زندگی میں انگریزوں کے اصول بھلا دیئے مگر سماجی زندگی میں پوری دیانتداری ۔ذمہ داری۔اخلاص اور عقیدت کے ساتھ گوروں کے اصول زندہ رکھے ہوئے ہیں۔

گلے شکوے چھوڑیئے اس باغ کی تزئین و آرائش میں انتظامیہ نے کمال کیا ہے۔۔۔پھولوں کے تختے۔۔۔سبزہ زار۔۔۔راہداریاں۔۔۔مصنوعی آبشار۔۔۔تخت۔۔۔گیلریاں۔۔۔پگڈنڈیاں سب دیکھنے کے لائق ہیں۔۔۔یہ باغ ہموار اور مسطح جگہ پر نہیں ہے بلکہ پہاڑی ہے اس پر اوپر چڑھنے کے راستے ہیں۔۔۔۔راہداریوں میں سیڑھیاں بہت قرینے سے تعمیر کی ہیں اور ان کے دائیں بائیں پھولوں کی کیاریاں ہیں۔۔۔تھوڑا سا میدانی علاقہ ہے جسے سبزہ زار بنا دیا ہے۔۔۔خردبین سے دیکھیں تب بھی مجال ہے گھاس میں کوئی سوکھی یا پیلی پتی نظر آجائے۔۔۔لگتا ہے سبز قالین بچھا ہوا ہے۔۔۔ہم جب باغ میں داخل ہوئے تو وہاں اسکول کے بچوں کو لیکچر دیا جا رہا تھا ہاتھ میں مائک پکڑے ٹیچر انہیں علم نباتات کا سبق پڑھا رہی تھیں، اسکول کی بچیاں یونیفارم میں تھیں، یہ چینی گرلز اسکول کے طلباء وطالبات تھے۔۔۔بڑا پیارا منظر تھا۔۔۔کئی سو بچے ہونگے۔۔۔سب ایک نظم اور ضابطے کی لڑی میں پروئے ہوئے تھے یہی نسل نظم وضبط کی تربیت حاصل کر کے اپنے ملک کے مستقبل کو تابناک بنانے میں اپنا بھرپور کردار ادا کرے گی۔

یہاں کیکٹس کے لئے علیحدہ گوشہ ہے۔۔۔کئی سو مربع گز پر ایک پگوڈا بنا ہوا ہے چاروں طرف جالیاں ہیں اور اس کے اندر سینکڑوں بلکہ ہزاروں قسم کے کیکٹس کے پودے اور درخت ہیں۔۔۔پتلی انگلی کی لمبائی سے لیکر سندھڑی آم کے پیٹر کے برابر تک۔۔۔گول مول تربوز کی طرح۔۔۔سبزی کی مختلف پھلیوں کی طرح۔۔۔بہت سے پھلوں کی طرح، عجیب عجیب وضع قطع کے۔۔۔چھوٹے بڑے کانٹوں والے۔۔نرم اور سخت کانٹوں والے۔۔۔مختلف اقسام کے۔۔۔مختلف صورتوں کے لاتعداد۔۔۔ان گنت کیکٹس۔۔۔۔دیکھے۔۔۔۔۔اور پھر انتظامیہ کے حسنِ انتظام اور حسن انتخاب پر بے ساختہ داد بھی دی۔

جب بھی ہم ان علاقوں کی بہت زیادہ تعریف کرتے۔۔۔تو ہماری بیگم فوراً شمالی علاقہ جات وصوبہ سرحد کے تفریحی مقامات کی تصویر کھینچ کر مقابلہ پر لے آتیں۔۔۔اور زیادہ نمبر سوات،

مری، ناران اور کاغان کے علاقوں کو دیتیں۔۔۔ایک موقع پر ہم مذکورہ کھلے اور کشادہ سبزہ زار کی تعریف کر رہے تھے تو فوراً شوگران کے اوپر ''سری پائے'' کے سبزہ زار کی مثال لے آئیں۔۔۔ہم لاجواب ہوگئے۔بلاشبہ ہمارے علاقوں کا حسن بے پایاں اور سونے پر سہاگہ وہاں کا موسم۔۔۔یہاں یہ حال تھا کہ بنیان پسینہ سے بھیگا ہوا تھا۔۔۔جہاں جہاں درختوں کے باہمی انتشار کی وجہ سے سورج کی کرنیں زمین پر اتر آئیں تھیں وہاں تو کھڑا ہونا مشکل۔۔۔!!

اس پارک میں بعض لوگوں نے اپنا Collection بھی عطیہ کیا ہوا تھا ان کے نام پر جگہ جگہ گوشے بنے ہوئے تھے ان میں Mrs. Bromelaid اور Mr. Dejonia کے پھولوں اور پودوں کے Collections کمال کے تھے۔۔۔طرح طرح کے چھوٹے بڑے گملوں میں اتنے خوش رنگ۔۔۔اتنے پیارے، اتنے خوبصورت نت نئے اور اچھوتے پھولوں کے پودے تھے کہ جی چاہے آنکھوں میں جذب کرلیں۔۔۔یادوں میں محفوظ کرلیں۔۔۔۔دل چاہے چرا کرلے جائیں۔۔۔کہ پھر کہاں دیکھنے کو ملیں گے۔۔۔

بڑی بڑی ہوٹلوں میں ہم نے جن بیلوں۔۔۔پودوں اور پھولوں کو دیکھا تھا وہ سب یہاں بڑے قرینے سے سجے ہوئے تھے ان کی دیکھ بھال اور نگہداشت میں پیار اور خلوص جھلکتا تھا۔۔۔یہ کام سرکاری ملازموں سے نہیں ہوسکتا، اس کے لئے۔۔۔ایک تعلق خاطر۔۔۔اپنائیت کا ایک رشتہ۔۔لگن، محبت اور Commitment کی ضرورت ہوتی ہے۔۔۔یہاں کے سرکاری ملازم بھی ایسے ہی ہوتے ہیں۔

Rumah Orkate۔۔۔یہ بھی ایک گوشہ ہے جہاں انواع واقسام کے پودے جمع کئے گئے ہیں۔۔۔۔یہ نرسری کی طرز پر ہے یہاں پودوں کے بچے پیدا کئے جاتے ہیں ان کی نشوونما پر بھرپور توجہ دی جاتی ہے پرورش کی جاتی ہے ان کی تراش خراش کی جاتی ہے۔۔۔اس کے بعد ان پودوں کو کہیں منتقل کردیا جاتا ہے۔

اوپر چڑھتے چڑھتے تھک گئے تھے۔۔۔ہمارے قریب ایک نالی سے پانی گذر رہا تھا۔۔۔شفاف پانی۔۔۔۔ہم ایک درخت کے پاس آئے Fiddle wood امریکہ کے ٹروپیکل ایریا کا درخت ہے۔۔۔عجیب درخت۔۔۔۔اس کے تنے اور چھال پر سفید دھبے تھے۔۔۔جیسے انسانی چہرے پر برص کے داغ۔۔۔۔خوشی ہوئی۔۔۔۔سوچا، سپر پاور کی کسی چیز میں تو داغ دکھائی دیا۔۔۔سچ پوچھو۔۔۔ہمیں تو ان کی ہر چیز پر داغ نظر آتا ہے۔۔۔۔دامن پہ

بھی ۔۔۔پر کیا کریں ان کے لباس میں دامن ہی نہیں ہوتا۔۔پتلون اور جینز میں ان کا upper بھی اندر کو اڑسا ہوتا ہے ہمارا دامن صاف بھی ہو تو لمبے کرتے اور ''ثوب'' کا دامن اتنا بڑا ہوتا ہے۔۔۔کہ ہلکا سا دھبہ بھی لگ جائے تو نمایاں ہو جاتا ہے۔۔۔لیکن اس درخت کے اوصاف میں خود امریکیوں نے لکھ بھیجا ہے کہ اس درخت میں داغ ہوتے ہیں ۔۔۔عجب اتفاق ہے کہ ہم نے ان کا داغ تلاش بھی کیا مگر وہ سیاہ نہیں سفید ہے!!

اب جانے اردو کے ماہر لسانیات سفید رنگ کے دھبے کو داغ کہتے ہیں یا نہیں!۔۔۔برے معنی میں استعمال ہوتا ہے یا یہ سفید دھبہ اوصاف میں شمار ہوتا ہے۔۔۔

تھک گئے تھے اسی لئے بہتی نالی کی منڈیر پر بیٹھ گئے ۔۔۔بیگم کا پرس کھلا۔۔بسکٹ اور نمکیاں برآمد ہوئیں جو جلد ہی شکم میں درآمد ہو گئیں۔۔۔ہم نے دیکھا کہ سبزہ زار پر لیکچر ختم ہو چکا تھا۔۔سینکڑوں پیارے پیارے بچے بچیاں کندھوں پر بیگ سنبھالے اٹھ کھڑے ہوئے ۔۔۔ان کی یونیفارم کی پشت پر لکھا تھا Convert daduket karamat۔۔۔۔ہنستے مسکراتے، چہلیں کرتے بچے ۔۔۔۔ادھر ادھر پھیل گئے ۔۔۔تمام راستے اور راہداریاں بچوں سے سج گئیں۔۔بڑا خوشگوار منظر تھا۔۔۔ہم نے انتظار کیا کہ یہ بچے نکل جائیں ۔۔۔ہم بیٹھے رہے۔۔۔ستاتے رہے۔۔۔جب منظر کشی کرنے کو جی چاہتا ہے تو اپنے دامن میں لفظوں کی کمی پر ملال ہوتا ہے بار بار سبزہ ہی سبزہ۔۔۔۔Lush green لکھتے لکھتے حیا آتی ہے۔۔۔لیکن کیا کریں ہر طرف ایسا ہی ہے۔۔۔۔70 مربع ایکٹر پر پھیلے ہوئے اس باغ میں اتنے درخت ہیں کہ دھوپ بھی شاخوں اور پتوں کی چلمن کے اس پار بیٹھی ہوئی شہزادی کی طرح نگاہوں سے اوجھل ہی رہتی ہے۔۔۔کبھی کبھی ہوا کا کوئی تیز جھونکا درختوں کے اوپری پتوں کو چھیڑتا ہوا گذر جائے تو آسمانی بجلی کی طرح پل بھر کو دھوپ کی کرن چمکتی ہوئی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے

کافی وقت ہو چکا تھا۔۔۔ہم اٹھ کھڑے ہوئے ۔۔۔لیکن اب بھی بعض ٹیچر۔۔۔۔دو، دو چار چار طلباء کو لئے ہوئے ایک ایک درخت کے بارے میں معلومات فراہم کر رہے تھے۔۔

یہ باغ نہیں۔۔۔مرکز علم نباتات ہے

☆☆☆

کرافٹ باتک

طلباء و طالبات کا ہجوم ختم تو نہیں ہوا مگر خاصے بچے باہر نکل چکے تھے۔۔۔اب ہم بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔۔۔اور نشیب کی طرف اترنے لگے۔۔۔چند منٹ بعد اسی صدر دروازہ سے باہر نکل آئے مگر یہاں بچوں کا اژدھام تھا۔۔۔اور ان کی غالب اکثریت۔۔۔کون، آئسکریم۔۔۔کولڈ ڈرنکس اور چپس کے پیکٹ ہاتھ میں لئے اپنی اپنی بسوں اور ویگنوں کی تلاش میں تھے۔ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ طلباء کے علاوہ طالبات کی ایک بڑی تعداد ''نباتاتی باغ'' میں موٹر بائیک کے ذریعہ آئی تھی، صدر دروازہ کے باہر سڑک اور پارکنگ کی جگہ لاتعداد کاریں، بسیں اور ویگنیں کھڑی تھیں۔محمد نے کمال مہارت سے اپنی کوسٹر اس ہجوم سے باہر نکالی اور ہم کھلی سڑک پر آ گئے۔۔۔دائیں بائیں چھوٹی چھوٹی رہائشی کالونیاں۔۔۔ایک دو منزلہ سرخ چھتوں کے گھر مگر تمام مکانوں کا بیرونی Elevation ایک جیسا۔۔۔ہمیں بعد میں عبدالباسط نے بتایا کہ چھوٹے رہائشی مکانات کے لئے، دو تین قسم کے منظور شدہ نقشہ ہیں اس لئے آپ کو ہر بستی میں ایک جیسے مکانات نظر آئے ہونگے ہاں اگر شہر سے دور کسی رہائشی علاقہ میں آپ کے پاس ایک ہزار مربع گز یا اس سے زیادہ بڑا پلاٹ ہے تو آپ آرکیٹیک سے اپنی پسند کا نقشہ اور ڈیزائن بنوا سکتے ہیں۔

کچھ دیر کے بعد ہی ہم ایک منزلہ عمارت کے سامنے رک گئے۔محمد نے کہا کہ دس منٹ میں آپ دستکاری کا یہ شوروم دیکھ آئیں۔۔۔پہلے ہم شوروم کے عقب میں ایک کچے حصہ کی طرف گئے جہاں چند ورکرز کپڑوں پر ہاتھ سے چھپائی کر رہے تھے۔۔۔ہمارے سندھ میں جس قرینے سے اجرک کی چھپائی ہوتی ہے اس کی مثال کہاں!!۔۔۔یہاں دو تین لڑکیاں ہاتھ میں برش لیکر بیل بوٹے بنا رہی تھیں ہماری بیٹی نہد یہ یہ کام زیادہ سلیقہ سے کرتی ہے کہ اس نے کراچی اسکول آف آرٹس سے فائن آرٹ میں گریجویشن کیا ہے۔۔۔لیکن یہاں کے فنکار بھی اپنے کام میں مہارت رکھتے ہیں۔۔۔ان کی انگلیوں میں پھنسا ہوا برش تیزی سے پھول پتیاں بنا رہا تھا۔کمال کی بات یہ تھی کہ کپڑے پر پہلے سے چاک کے ذریعہ آؤٹ لائن نہیں بنائی گئیں تھیں۔۔۔عقب

سے بھی ایک دروازہ شوروم کی طرف کھلتا تھا۔۔۔ہم دروازہ کھول کر شوروم میں آئے۔۔۔خاصا بڑا شوروم تھا۔۔۔ہاتھ کی چھپائی ۔۔۔کڑھائی اور سلائی کے ملبوسات۔۔۔۔ اسکارف۔شال۔دسترخوان۔بیگز۔۔۔اور نجانے کیا کیا چیزیں یہاں فروخت کے لئے رکھی گئی تھیں اس کے علاوہ سوونیر کی اور بہت سی اشیاء موجود تھیں۔۔۔۔ملائیشیا نے گھریلو صنعت کاری میں بے پناہ ترقی کی ہے جو خواتین باہر نکل کر کام نہیں کرتیں وہ فاضل وقت میں اپنے گھر ہی میں مختلف قسم کی دستکاری میں مصروف رہتی ہیں، بچوں کے کھلونے، زنانہ کپڑے، موبائل فون اور مختلف اشیاء کی پیکنگ کا کام گھروں پر کیا جاتا ہے۔۔۔

اشیاء کی قیمتیں زیادہ تھیں اس لئے بیگم نے شوروم میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لی اور جلد ہی ہم واپس آ کر کوسٹر میں بیٹھ گئے۔۔۔عجیب اتفاق تھا کہ بیگم ہوٹل سے نکلتے وقت جس نشست پر بیٹھی اس رخ دھوپ آ رہی تھی۔۔۔۔بوٹونیکل گارڈن سے نکلتے وقت بیگم نے فرمائش کی کہ میں اب آپ کی جگہ بیٹھونگی۔۔۔ہم نے کہا ٹھیک ہے۔۔۔کوسٹر جب گارڈن سے روانہ ہو کر سڑک پر آئی تو پھر دھوپ ان کی طرف۔۔۔۔باتک سے نکلے تو بیگم نے پھر پرانی والی نشست منتخب کی۔۔گاڑی سڑک پر آئی تو پھر انہی کی سمت دھوپ۔۔۔۔جھنجلا کر کہنے لگیں۔

کیا مصیبت ہے۔۔۔میں جہاں بیٹھتی ہوں، دھوپ میری طرف ہی ہوتی ہے۔

سورج کی کرنیں بھی اپنے پسند کے چہرے تلاش کرتی ہیں۔۔۔۔ویسے ایک شعر یاد آ گیا۔۔۔۔

بات کاٹ کر کہنے لگیں آپ کو شعر کیسے یاد آ گیا۔۔۔کیونکہ ہزاروں شعری مجموعے پڑھ کر اور سینکڑوں مشاعروں میں شرکت کے باوجود آپ کو شعر یاد نہیں رہتے۔۔۔

تم ٹھیک کہتی ہو مگر بس نجانے کیسے یہ شعر یاد آ گیا۔حسب حال ہے سنو!

یہ دھوپ تو ہر رخ سے پریشان کرے گی
کیوں ڈھونڈ رہے ہو کسی دیوار کا سایہ

اب ہم ایک بار پھر شہر کے بارونق علاقہ میں آ گئے۔۔۔سرخ بتی پر گاڑی رکی۔۔۔یہ ایک چورنگی تھی۔۔ہر طرف شاپنگ سینٹر۔۔۔۔پہلی بار ایک کارنر پر ایک ساتھ K.F.C اور Mc donald کی ریسٹوران دیکھیں۔۔۔۔بالکل ویسے ہی جیسے ہمارے شہر میں ہیں۔۔۔آس پاس زندگی تھی۔۔۔سیاحوں کا ہجوم تھا۔۔۔خریداروں کی بھیڑ اور تماشبینوں کا

مجمع۔۔۔گاڑی آگے بڑھ گئی۔۔۔ یہ علاقہ one stop midland park and shopping palza کہلاتا ہے یہاں شہر کی کئی ہوٹلیں اور متعدد خریداری کے مراکز ہیں۔۔۔یہاں New gurney drive نام کا مشہور ہوٹل ہے عمارت کے بجائے کھلے حصے میں ہوٹل بنائی گئی ہے۔۔۔کہیں درختوں کی چھاؤں اور کہیں میز کے اوپر رنگ برنگی چھتریاں سایہ کئے ہوئے ہیں۔۔۔یہاں سیاحوں کا ہجوم رہتا ہے۔۔۔کرسیوں کے ساتھ ساتھ اسٹول بھی نصب ہیں، جن پر بیٹھ کر لوگ فاسٹ فوڈ کھاتے ہیں۔۔۔محمد ہمیں تفصیلات بتاتا جا رہا تھا۔۔۔بے حد بارونق جگہ۔۔۔اس چورنگی کے ساتھ ایک تیس پینتس منزلہ سرخ رنگ کی عمارت ہے۔۔۔عمارت دو حصوں میں بٹی ہوئی تھی اس لئے ہم اسے Twin tower بھی کہہ سکتے ہیں۔۔محمد نے بتایا کہ اس کے آخری فلور پر ''واٹر پارک'' بھی ہے۔

ذرا آگے بڑھے تو نہایت خوبصورت سنہری عبادت گاہ ہمیں نظر آئی۔۔۔۔بے حد سجی ہوئی لگتا تھا پوری عمارت میں سونے کا پانی چڑھایا ہوا ہے مگر محمد نے بتایا کہ یہ سنہری پالش ہے اسے عام طور پر برمی ٹیمپل کہتے ہیں اور اس کا نام ہے 'Dharmikarama'' اس عمارت کو ہم نے پہلے مرحلے میں ذرا دور سے دیکھا۔۔۔ایک سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر تصویر بھی بنوائی ہماری نشست سے صرف پانچ منزلہ اونچا مینار نظر آ رہا تھا۔۔

☆☆☆

خوابیدہ بُدھا

اب ہماری منزل Sleeping Budha تھی۔۔۔کچھ دیر بعد ایک خوبصورت پرشکوہ اور سنہری عمارت کے باہر دروازے پر ہماری کوسٹر رک گئی۔۔۔گاڑی سے اترتے ہی ہم حیرت زدہ رہ گئے۔۔۔دروازہ سے داخل ہوئے تو فرش سے اوپر پلیٹ فارم پر جانے کے لئے کشادہ سیڑھیاں۔۔۔۔لیکن ان کے دونوں طرف ایک فٹ چوڑی اور دو فٹ اونچی دیواریں جن پر سانپ نما مگرمچھ اپنے خطرناک جبڑے کھولے لیٹے ہوئے تھے یوں لگتا تھا کہ سبز رنگ کے سانپ کو زبردستی لٹانے کے لئے سنہری رسی سے باندھا گیا ہے اس کی پشت پر دم سے جبڑے تک بھی ایک خاردار مگر خوبصورت اور سنہری رسی لپٹی ہوئی تھی۔۔۔بے حد غصہ میں اپنے جبڑے کھولے ہوئے۔۔۔دیواروں کے دونوں طرف اژدھے جکڑے ہوئے تھے سیڑھیاں چڑھ کر آپ ہاتھ سے انہیں چھو سکتے ہیں۔۔مجسمہ ساز نے نہایت مہارت سے ان اژدھوں کو تراشا ہوگا۔۔۔۔

پاکستان کے قارئین کے لئے یاد دلاتے چلیں کہ جب بھی چین سے کوئی ثقافتی طائفہ آتا ہے تو اپنے show میں یہ اژدھے ہمیں دیکھنے کو ملتے ہیں اور یہ ڈریگن کہلاتے ہیں۔۔کہ دو تین افراد اپنے اوپر اژدھے کا خول چڑھا کر اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

سیڑھیاں چڑھ کر دائیں بائیں ان خوبصورت اژدھوں کو دیکھنے کے بعد سامنے دیوار پر نظر پڑی تو وہ بھی خوبصورت جنڈی کاشی اور بیل بوٹوں سے سجی ہوئی تھی۔۔۔۔داخلی دروازوں کے دائیں بائیں کوئی بارہ پندرہ فٹ اونچے دو پہرے دار، قدیم روایتی لباس پہنے، ایستادہ تھے۔۔۔یہ مجسمے بھی کمال مہارت سے بنائے گئے تھے۔۔۔اندر جانے سے پہلے ہم نے جوتے اتار دیئے۔۔۔۔ہمارے بالکل سامنے ایک چبوترہ سا تھا اور چھوٹے کمرے کی بیرونی دیوار کو مختلف طاقچوں، طاقوں اور خانوں سے مزین کیا گیا تھا۔۔۔ایک طرف مومی شمعیں روشن تھیں۔۔۔آگے بڑھے تو سیدھے ہاتھ کو ضروری معلومات اور متعلقہ لٹریچر حاصل کرنے کے لئے ایک استقبالیہ کاؤنٹر موجود تھا۔۔۔یہ بھی روایتی طرز تعمیر سے مزین۔۔۔آگے بڑھ کر دیوار کی طرف دیکھا تو دیوار سے ملحق ایک گیلری پر مہاتما بدھ محو استراحت تھے۔۔۔تکیہ کے ساتھ اپنی ہتھیلی پر گال رکھے آرام کر رہے

تھے۔۔۔یہ گوتم بدھ کا مجسمہ ہے اور یہ Sleeping Buddha کے نام سے مشہور ہے ہم نے مختلف عجائب گھروں میں گوتم بدھ کے جو سینکڑوں چھوٹے بڑے مجسمے دیکھے ہیں یہ ان سے بالکل مختلف ہے۔۔۔گوتم بدھ تو بہت شکیل، وجیہ اور خوبصورت انسان تھے ان کے چہرے پر تو شانتی اپنی پوری معنوی سچائی کے ساتھ موجود رہتی تھی۔۔۔مگر ہم جس گوتم کے مجسمے کو دیکھ رہے تھے وہ ہمارے تصور سے کہیں زیادہ مختلف تھا۔۔

مہاراجہ گوتم بدھ 563 ق۔م میں کپل وستو میں پیدا ہوئے ان کے والد سا کیا قبیلہ کے کھتری راجہ شدوودھن تھے جو کپل وستو کے راجہ تھے۔۔۔گوتم بدھ کا اصل نام سدھارتھ تھا۔۔۔اٹھارہ سال کی عمر میں ان کی شادی راجکماری یشودھرا سے ہوئی۔۔۔گوتم بچپن سے بہت نیک دل اور انسان دوست تھے۔۔۔لڑائی جھگڑے۔۔۔شکار اور جانوروں پر زیادتی کو بھی پسند نہیں کرتے تھے۔

گوتم کو راج پاٹ کے طور طریقہ پسند نہیں تھے، ایک دن وہ اچانک اپنی بیوی کو چھوڑ کر جنگل میں نکل گئے۔۔۔سات برس تک تپسیا کرتے رہے لیکن دل کو قرار نصیب نہیں ہوا۔۔۔اس کے بعد ان کی ملاقات ایک یوگی سے ہوئی، گوتم کے ایک چیلے نے گوتم اور یوگی کے درمیان ہونے والے مکالمے قلم بند کئے تھے جو ازاں بعد ایڈن آرنلڈ نے Life of Asia کے نام سے انگریزی میں شائع کئے ہیں۔۔گوتم اپنے علاقہ کو چھوڑ کر ہندوستان کے صوبے بہار کے ایک قصبہ ''گیا'' میں آ گئے اب یہ علاقہ بدھ گیا کہلاتا ہے۔۔۔یہاں گوتم کئی برس تک ایک برگد یا پیپل کے درخت کے نیچے بیٹھے ریاضت کرتے رہے۔۔۔بھوک پیاس کی پرواہ کئے بغیر اپنی تپسیا میں وہ اتنے محو ہوئے کہ ہڈیوں کا ڈھانچہ ہو گئے۔۔۔پھر انہیں ایک دن گیان حاصل ہوا۔۔۔انہوں نے لوگوں کو تعلیم دی کہ سارے دکھ اور مسائل ہماری جہالت، خود غرضی اور ہوس پرستی کا نتیجہ ہیں۔۔انسان ان برائیوں کو ترک کر دے تو اسے بھی نروان حاصل ہو سکتا ہے۔

گوتم کی تعلیمات سے لوگ متاثر ہوئے۔۔۔ہندوستان کے بادشاہ اشوک اعظم نے گوتم کی تعلیمات کو پتھروں پر کندہ کرا کے عام کیا گوتم کی زندگی ہی میں لاکھوں لوگ ان سے متاثر ہو کر بدھ مت اختیار کر چکے تھے۔۔۔گوتم ۸۰ سال کی عمر میں 483 ق۔م۔۔۔میں اس دنیا سے رخصت ہوئے۔۔۔1896ء میں نیپال کے ایک علاقہ میں کھدائی کے دوران ایک صندوقچہ ملا جس میں گوتم کی راکھ تھی ازاں بعد 1972 میں، ہندوستان کے ممتاز ماہر آثار قدیمہ سری واستو کو

کھدائی کے دوران پتھر کے چند اور صندوقچے ملے۔۔۔ان میں گوتم کی ہڈیاں محفوظ تھیں۔۔۔
انتقال کے بعد گوتم کی راکھ ساکیا قبیلے کی آٹھ شاخوں میں تقسیم کر دی گئی۔۔۔آج ہم پینانگ میں گوتم کے جس مجسمے کے سامنے کھڑے ہیں روایت مشہور ہے کہ یہاں بھی گوتم کی راکھ موجود ہے۔۔۔دنیا بھر میں گوتم کے ماننے والوں کی تعداد 25 کروڑ ہے۔۔۔حیرت کی بات ہے کہ بدھ مت ہندوستان سے شروع ہوا تھا مگر اب یہاں بدھ مت کے پیروکار بہت کم ہیں۔۔۔ تاہم۔چین۔جاپان۔تھائی لینڈ۔منگولیا۔سری لنکا۔نیپال، ہند چینی۔میانمر اور ملائیشیا میں ان کے ماننے والوں کی تعداد بہت ہے۔۔۔بدھ مت میں بھی فرقے بن گئے۔۔۔ایک ''مہایا آن مت'' دوسرا ''ہنایا آن مت'' کہلاتا ہے۔

دنیا بھر میں جس قدر مجسمے گوتم کے بنائے گئے ہیں شاید کسی اور شخصیت کے بنائے گئے ہوں۔۔۔پاکستان میں تخت بھئی۔۔۔ٹیکسلا وغیرہ سے کھدائی کے دوران ہزاروں چھوٹے بڑے مجسمے برآمد ہوئے ہیں۔۔۔میں نے لندن، کراچی، ٹیکسلا اور سوات کے عجائب گھروں میں گوتم کے متعدد مجسمے دیکھے ہیں، عام طور پر پرانے زمانے میں جو مجسمے تیار کئے جاتے تھے ان میں گوتم کے بدن کی کوئی ہڈی۔بال یا جسم کا کوئی عضو شامل ہوتا تھا۔

گوتم بدھ کی اتنی تفصیل ہم نے اس لئے درج کی کہ اسکول کے زمانے میں تاریخ ہندوستان ہمارے نصاب میں تھی۔۔۔گوتم کے بارے میں تفصیلات ہم نے پڑھی تھیں اس کے بعد گوتم کے مجسمے ہم نے مختلف عجائب گھروں میں دیکھے تھے گوتم بچپن سے ہی ہمیں اچھے لگے۔۔۔ یہاں آئے تو گوتم کو دیکھ کر مایوسی ہوئی ہے۔۔ان کے ۲۰ میٹر لمبے مجسمے کو رنگین پالش سے خوبصورت بنانے کی کوشش کی ہے۔۔چہرے پر پوڈر۔۔۔ہونٹوں میں سرخی اور آنکھوں کے ارد گرد کاجل وغیرہ لگایا گیا ہے۔۔۔اب تو زمانہ بدل گیا ہے لیکن ۵۰ برس پہلے تک دلہن کو جس طرح سرخی۔۔مسی، دندھاسا، کاجل اور میدہ کی طرح پوڈر تھوپ کر سجایا جاتا تھا اسی طرح گوتم کو سجایا گیا ہے۔۔۔

گوتم کا مجسمہ ۲۰ میٹر طویل ہے اور اس سے چند میٹر زیادہ کمرے کی لمبائی تھی اور اس سے ذرا کم اس ہال کی چوڑائی تھی۔۔۔یہاں کی سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ یہاں ہزاروں مرحومین کے مردہ جسم کی راکھ رکھی ہوئی ہے۔۔۔دیوار کے ساتھ ساتھ کتابیں رکھنے کی سینکڑوں Recks بنی ہوئی دیکھیں تو ہم چونکے قریب گئے تو تقریباً 5x6 انچ کے قطار اندر قطار

''کا بک''۔۔۔یا لکڑی کے طاقچے بنے ہوئے ہیں ہر طاق میں ایک مرتبان ہے اور ہر مرتبان میں کسی مرحوم کی راکھ رکھی ہوئی ہے۔۔۔۔ہر طاق یا کا بک یا چوکھٹے پر شیشہ لگا ہوا ہے اس شیشہ پر مرحوم / مرحومہ کا نام ولدیت، پیدائش اور انتقال کی تاریخ درج ہیں۔

ایک خانہ پر لکھا تھا Loving memory of YA.SIN.Ch تاریخ پیدائش ۲۴ دن چینی کیلنڈر اور چھٹا مہینہ 1905 ایک خانے میں لکھا تھا ''سن۔یو۔تھر۔دختر اوسا کیون''۔۔۔۔یہاں ہزاروں طاق ہیں جن میں مرنے والوں کی راکھ چھوٹے چھوٹے مرتبانوں میں رکھی تھی بعض طاقچوں میں مرحومین کی تصویر بھی لگائی گئی تھی۔۔۔۔بعض خوبصورت چہرے جوانی میں راکھ ہو گئے، کیسے کیسے کڑیل جوان۔۔۔۔عمر رسیدہ بزرگ۔۔۔۔بااثر اور اہم شخصیات۔۔۔نامور لوگ۔۔۔۔اپنے اپنے ملک کے مشہور و مقبول فنکار۔۔۔۔عظیم کھلاڑی۔۔۔۔اچھے برے سیاستدان۔۔۔۔معاشرہ کو سجانے اور بگاڑنے والے۔۔۔۔مختلف شعبہ ہائے زندگی اور مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے۔۔۔انجام کار سمٹ سمٹا کر ان مرتبانوں میں قید۔۔۔۔ایک نشانی کے طور پر۔۔۔یقیناً یہ مقام عبرت۔۔۔بالآخر مٹی اوڑھ کر سو جانا ہے یا راکھ بن کر دریا برد ہونا۔۔۔۔یا فضاء میں بکھر جانا ہے یا ان مرتبانوں میں قید ہو جانا ہے۔۔۔۔۔۔شروع میں تو ہم سامنے کی دیوار پر یہ خانے دیکھتے گئے۔۔۔اس کے بعد جس کمرہ کا ہم نے ابتدا میں ذکر کیا اس کی عقبی دیوار میں سینکڑوں خانے بنے ہوئے تھے اور ازاں بعد ہم نے ایک دروازہ میں جھانک کر دیکھا تو کمرہ کی چاروں اندرونی دیواروں میں ایک سے خانوں میں مرنے والوں کی راکھ رکھی تھی۔۔۔۔دوسرے لفظوں میں ہم اس عمارت کو قبرستان بھی کہہ سکتے ہیں۔۔۔قبرستان میں مرنے والے کے لئے دو گز زمین مختص ہوتی ہے یہاں چند انچ کے مرتبانوں میں مرنے والوں کی راکھ محفوظ کر دی جاتی ہے ان کا عقیدہ ہے کہ ان کے پیارے یہاں شانتی سے ہیں خیال رہے کہ گوتم آواگون کے قائل نہیں تھے اور ایک خدا کے وجود کے بارے میں خاموش تھے۔اس ہال میں بے شمار مجسمے تھے مگر پتھر کو تراش کر نہیں بنائے گئے تھے۔۔تمام مجسموں پر مختلف رنگوں سے پالش کی گئی تھی۔۔ہو سکتا ہے ان مجسموں کو پتھر، سیمنٹ اور بجری سے بنایا گیا ہو۔۔۔۔تاہم تمام مجسمے مختلف رنگوں سے Paint کئے گئے تھے۔۔۔اور رنگ بھی بہت گہرے استعمال کئے گئے تھے۔۔۔۔دیواروں پر بھی مجسمہ سازی کی گئی تھی کسی تصویر میں گوتم بدھ کے سامنے لوگ عقیدت سے بیٹھے ہیں۔۔۔۔ایک مجسمہ نما تصویر میں بدھا کے سامنے ایک رقاصہ

رقص کر رہی تھی۔۔۔ایک مجسمہ روایتی انداز کا جس میں گوتم بدھ آلتی پالتی مار کر آنکھیں موندے گیان میں مصروف تھے۔

یہاں سب کچھ تھا مگر مجسمہ سازی کے فن کی مہارت کہیں نظر نہیں آئی۔۔۔ہر مجسمہ نو آموز یا نا تجربہ کار مجسمہ ساز کی بچکانہ کوشش کی عکاسی کرتا تھا۔۔۔ظاہر ہے بدھ مت والوں نے ارادتاً اس طرح کے مجسمے بنوائے یا بنائے تھے۔۔۔اس ٹیمپل میں اور بہت سے مجسمے بھی تھے۔۔۔

اس کے علاوہ کوئی تین چار درجن آدم قد سے زیادہ بڑے گوتم بدھ کے مجسمے ایستادہ تھے۔۔۔ایک 9-8 فٹ گوتم کا خوبصورت مجسمہ، شہزادوں کی طرح شاہی لباس میں۔۔۔تمام مجسمے Paint کئے ہوئے تھے۔۔۔ہم نے کاؤنٹر پر جا کر ایک لڑکی سے معلوم کیا کہ یہاں اپنی راکھ رکھوانے کے لئے کیا کوئی رقم Donate کرنا ہوتی ہے۔۔۔اس نے اثبات میں جواب دیا لیکن کہا ہمارا یہ شعبہ نہیں ہے اس کے لئے آپ سامنے دفتر میں جا کر معلومات حاصل کریں۔۔۔۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ ورثاء نے اپنے پیاروں کی نشانی قائم کرنے کے لئے یہ طریقہ اپنایا ہے۔

ہم ٹیمپل کی عمارت سے باہر نکلے تو ایک بدھ بھکشو کو ٹمپل سے نکل کر ایک اور کمرے میں جاتے دیکھا۔۔۔ہم نے پہلی بار ہوش و حواس میں اتنے قریب سے کسی بدھ بھکشو کو دیکھا تھا۔۔۔سر پر بال ندارد بدن پر ایک پیلی چادر پڑی ہوئی جثہ ویسا ہی فربہ اندام جیسے پنڈتوں اور ملاؤں کا ہوتا ہے۔۔۔ہم نے کوشش کی ہے کہ اپنے قارئین کو Sleeping Buddha کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کریں۔۔۔خیال رہے کہ یہ گوتم کا دنیا میں چوتھا بڑا مجسمہ ہے۔۔۔تھائی لینڈ۔میانمار میں اس سے زیادہ طویل اور بڑے مجسمے موجود ہیں۔

ہم نے کافی دیر تک دلچسپی کے ساتھ اس ٹیمپل کو دیکھا۔۔۔سیڑھیوں سے نیچے اترے۔۔۔باہر آئے۔۔۔محمد ہمارا منتظر تھا۔۔

گاڑی میں بیٹھ کر ہم ایک ساحل کے قریب پہونچے۔۔۔یہاں ایک قلعہ ہے جو Fort Corwallis کہلاتا ہے۔

☆☆☆

فورٹ کارنیلئس

پہلی نظر میں ایک پرانا اور عام سا قلعہ محسوس ہوا۔۔۔اس قلعہ کو دیکھنے کے لئے ٹکٹ ہے صرف تین رنگٹ کا۔۔۔ہم نے دو ٹکٹ خریدے اور قلعہ میں چلے گئے۔۔۔عملہ کے افراد کے علاوہ چند سیاح یہاں پہلے سے موجود تھے۔۔۔ٹکٹ لینے کے بعد قلعہ میں داخل ہونے کے لئے چرخی والا دروازہ لگا ہوا تھا۔۔۔چند برس تک پہلے ہمارے شہروں کے ریلوے اسٹیشن میں ایسے دروازے لگے ہوتے تھے۔۔

پینانگ، ملائیشیا کا ایک قدیم علاقہ ہے۔۔۔ابتدا میں سماٹرا سے کچھ انگریز تاجر ساؤتھ پینانگ آئے۔۔۔ازاں بعد ایسٹ ساؤتھ کمپنی کی ہدایت پر 1591ء میں سب سے پہلے کیپٹن چمبرلین کاسٹر اپنے سپاہیوں کے ساتھ پینانگ کے ساحل پر اترا اس زمانے میں یہاں کی آبادی زیادہ نہیں تھی۔۔۔کیپٹن چمبرلین کاسٹر چند مہینے یہاں مقیم رہا لیکن پیٹ کی ایک خطرناک بیماری کے نتیجے اس کے بہت سے سپاہی ہلاک ہوگئے اور وہ بیماری کے خوف سے واپس چلا گیا۔۔۔یہ وہ زمانہ تھا جب پینانگ ''کیدہ'' سلطنت کا حصہ تھا۔۔۔ابتدا میں ایسٹ ساؤتھ کمپنی نے تجارتی مشن روانہ کیا تھا۔۔۔ان کے ہمراہ کیپٹن YOYOGA بھی تھا جو پینانگ میں مقیم رہا۔۔۔خیال رہے کہ کیپٹن چمبر کاسٹر پینانگ کے ساحل palau Riman میں اترا تھا۔۔۔اور اسی شخص نے سب سے پہلے پنیانگ دریافت کیا تھا۔۔۔1686 میں کیپٹن فرانسس لائٹ (Francis light) بھاری اسلحہ اور فوج کے ساتھ اسی مقام پر اترا تھا اور اس نے بعد میں ''فورٹ کاروالیس'' تعمیر کرایا جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ یہ علاقہ سلطنت کیدہ کے زیر نگیں تھا۔

اس قلعہ میں اس زمانے کی اشیاء بطور یادگار محفوظ کی گئیں ہیں۔۔۔ایک بھاری توپ یہاں موجود ہے جس کی مدد سے کیپٹن فرانسس لائٹ نے اپنے ناپاک عزائم کے ساتھ اس ساحلی علاقہ پر قبضہ کیا تھا۔۔

ہمارے دائیں جانب دس بارہ کمرے تھے۔۔۔بالکل سادہ اور پرانے وقتوں کی تعمیر کی

علامت۔۔۔پہلے کمرے میں ایک شوکیس کے اندر کالی مرچ۔۔۔باجرہ۔۔۔گندم۔۔۔اور مختلف قسم کے مصالحہ جات اور اجناس کے نمونے رکھے تھے۔۔۔ایک کمرہ میں ٹن کا ایک ٹرنک تھا۔۔۔سپاہیوں کی وردیاں تھیں۔۔۔ایک کمرہ میں شیشے والے شوکیسز میں مختلف وردیاں اور لباس لٹکے ہوئے تھے۔۔۔ان میں سے ایک کرتے نے ہماری توجہ اپنی جانب مبذول کرائی۔۔۔ ہم یہ دیکھ کر حیران رہ گئے۔۔۔کھڑے کالر کا بنگالی ڈیزائن کا کُرتا جس کی لمبائی گھٹنوں کے برابر۔۔۔ویسا ہی کرتا جیسا عام طور پر پاکستان میں استعمال کیا جاتا ہے فرق صرف اتنا تھا کہ اس کرتے میں آستین نہیں تھی اگر یہ زیادہ لمبا نہ ہوتا تو ہم اسے واسکٹ سمجھتے۔۔۔پھر خیال آیا کہ آج کل نکاح کی تقریب میں دولہا ایسے ہی کُرتے استعمال کرتے ہیں۔۔۔یعنی بغیر آستین کے واسکٹ کی طرز پر لیکن اس کی لمبائی کرتے کے برابر ہوتی ہے پہلے شیروانی پہنی جاتی تھی۔۔۔اب شیروانی کی آستینیں غائب ہوگئی ہیں۔۔۔تین سو سال پرانا یہ لباس تھا۔۔۔کبھی انگریز اپنے ساتھ پینانگ میں لائے تھے آج کل ہم تقریباً اسی ڈیزائن کے لباس کو دولہا کے ڈریس کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔۔۳۰۔۴۰ برس پہلے تک شادی کے دن دولہا شیروانی پہنتا تھا۔۔۔کہتے تھے اس میں دولہا کی پریشانی چھپی رہتی تھی اب زمانہ بدل گیا دولہا کو چھوڑیئے دلہن کو بھی کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔۔۔نکاح سے پہلے سیج پر بیٹھے دولہا دلہن بے تکلف دوستوں کی طرح مسکرا مسکرا کر باتیں کرتے رہتے ہیں۔۔۔ہمارا خیال ہے کہ اس پہناوے میں دولہا سنجیدہ، متین اور باوقار نظر آتا تھا۔۔۔پھر دھیرے دھیرے مذکورہ الفاظ اپنی معنویت اور اہمیت کھوتے چلے گئے۔۔۔یہی حال شیروانی کے ساتھ ہوا۔۔۔پہلے شیروانی کی آستین غائب ہوئیں۔۔۔پھر ان کا رنگ تبدیل ہوا۔۔۔اس کے بعد کالر پر سنہری کڑھائی کی جانے لگی اور ازاں بعد اب گریبان اور دامن میں بھی کڑھائی کر کے پھول پتیاں بنائی جانے لگیں۔۔۔۔۔اور اب دولہا کے کرتے کا دامن چاک ہوگیا۔۔۔۔پہلے دلہن کے لباس کے رنگ دولہا نے اپنائے ۔۔۔پھر وہ Slewless ہوگیا اور جیسے جیسے دولہا دلہن کے درمیان نکاح اور ولیمہ کی تقریب میں بے تکلفی بڑھی تو دولہا نے دلہن کے جوڑے سے کچھ پھول پتیاں لے کر اپنی شیروانی نما کرتے کی زینت بنا لئے۔۔۔عورت مرد ایک سے ہوگئے۔۔۔دولہا دلہن لباس اور میک اپ کے حوالے سے بھی ایک دوسرے کے قریب آگئے۔۔۔عام طور پر ہمارے ہاں ان دنوں جو کرتا / شروانی دولہا نکاح کے روز پہنتا ہے۔۔۔ویسا ہی کرتا شیروانی سترہویں صدی میں کیپٹن چمبرلین کاسٹریا

اور اس کی فوج کے سپاہی، عام زندگی میں پہنتے تھے۔۔۔ مجھے خیال آیا کہ اس حساب سے ہم انگریزوں سے چار سو سال پیچھے ہیں۔۔۔۔

ہم نے لکھا تھا کہ قلعہ کے ایک طرف چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں۔۔ان میں فاتح فوج کی چھ پرانی تصویریں بھی شیشے کے فریم میں دیواروں پر ٹنگی ہوئی تھیں ایک اور کمرے میں گئے۔۔۔ وہاں ایک میز پر اور دیوار کے آس پاس پرانے نٹ بولڈ زنگ آلود کیلیں اسکرو اور لوہے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے سجا کر رکھے گئے تھے۔۔۔۔ قلعہ میں استعمال کی گئیں اینٹیں اور انکے ٹکڑے، یہ اینٹیں خاصی تعداد میں تھیں۔۔۔ پرانے قلعہ کی دیواروں میں استعمال کی گئیں تھیں موجودہ دیواریں بعد میں تعمیر کی گئیں ہیں۔

ایک کمرے میں پرانے سکے۔۔۔۔ پرانی بوتلیں۔۔۔ٹوٹی بوتلوں کے ٹکڑے، اسکرو ۔۔۔۔Rings جہاز کے بہت سے چھوٹے چھوٹے پرزے۔۔۔۔ایک سے ڈیڑھ فٹ لمبی زنگ آلود کیلیں سمندری سیپیاں۔۔۔۔ بہت چھوٹے چھوٹے مرتبان۔۔۔۔ایک چھوٹے سے مرتبان یا چوڑی شیشی پر نظر پڑی۔۔۔طالب علمی کا زمانہ یاد آ گیا۔۔۔آپ کو بھی تو یاد ہوگا 40-30 سال پہلے ''تبت سنو'' کی کریم ہر گھر میں استعمال ہوتی تھی۔۔۔۔اس زمانے میں اسے شیشی ہی کہا جاتا تھا۔۔۔بوتل کی طرح اس کی گردن خمدار اور رومانٹک نہیں ہوتی تھی۔۔۔بس سیدھی سی بوتل۔۔۔جس سائز کا پیندا۔۔۔۔اس سائز کا دہانہ۔۔۔ یاد آ گیا نا۔۔۔ بالکل ویسی ہی اور اسی سائز کی تبت سنو کی شیشیاں یہاں عجائب گھر میں رکھی تھیں بس کوہ نور کیمیکل کمپنی کا لیبل نہیں لگا ہوا تھا۔۔۔۔ہم نے غور کیا تو خیال آیا کہ دنیا بھر میں کم و بیش ایک جیسی چیزیں انسان استعمال کرتا ہے بس الگ الگ رنگ روپ ڈیزائن اور معیار سے وہ مختلف قوموں کی شناخت بن جاتی ہیں۔۔

آگے بڑھے دو تین کمروں پر تالے پڑے تھے۔۔۔۔ یہ کبھی عقوبت خانے اور جیل کی کوٹھریاں تھیں۔۔۔مٹی کا فرش۔۔۔۔۔دیواروں پر ادھڑا ہوا پلاسٹر۔۔۔اب تو مکڑیوں نے جالے بنا دیئے تھے۔۔۔۔۔۔۔ایک سیاہ فام دبلا پتلا کمزور نیگرو۔۔۔ایک کمرہ میں بند تھا ۔۔۔ننگے بدن، صرف ایک نیکر پہن رکھی تھی۔۔۔ بدن پر تشدد کے نشانات اور چہرے پر کرب و اذیت کے آثار۔۔۔ یہ مجسمہ تھا۔۔۔ دیکھ کر افسوس اور طبیعت میں موجود گوروں سے نفرت عود کر آئی

8-10 کمرے تھے ان میں سابق حکمرانوں کی جو کچھ چیزیں باقی بچیں تھیں وہ رکھ دی گئیں تھیں ان کے مظالم کو یاد رکھنے کے لئے ۔۔۔ باہر ایک کھلا حصہ تھا۔۔۔ بے ترتیب۔۔۔ بے ڈھنگا۔۔۔ ایک طرف پرانے ڈرم ۔۔ لوہے کی ریلنگ کی پرانی جالیاں ۔۔ خاردار تار کے گچھے ۔۔ جہاز کی ٹوٹی لکڑیاں اور تختے پڑے تھے جن پر بیٹھ کر ایسٹ ساؤتھ کمپنی کے سورما پہلی بار یہاں آئے تھے ۔۔۔ یہاں تین چار درخت تھے ۔۔۔ ملائیشیا کے قدرتی ماحول کے اعتبار سے تو یہاں ہزاروں درخت ہونے چاہیئے ۔۔۔ کہ اس ملک میں سبزہ۔ درخت سمندر کا پانی اور باقی بچی زمین پر عمارتیں اور سڑکیں ہیں ۔۔۔ کہیں بھی آپ کو یہ مٹی نہیں ملے گی ۔۔۔ یہ قلعہ بالکل سمندر سے جڑا ہوا ہے ۔۔۔ بہت سی زمین خالی ہے ۔۔۔ درخت کیوں نہیں ہیں ۔۔۔ یونہی خیال آیا ۔۔ جس جگہ ظلم ڈھائے جائیں ۔۔ ظلم کی منصوبہ بندی کی جائے ۔۔۔ ظلم کے وسائل تیار کئے جائیں اس جگہ کی مٹی انسانوں سے ناراض ہو جاتی ہے ۔۔۔ وہاں مٹی بیج کو قوت نمو ۔۔۔ فراہم نہیں کرتی، بس سمجھو بانجھ ہو جاتی ہے ۔۔۔ ہاں مظلوم لوگوں کا گروہ ۔۔۔ دعاؤں کے لئے اٹھنے والے ہاتھوں میں، کدال اور ہل سنبھال لے اور مٹی کے سینے پر گدگدی کرے تو پھر مٹی راضی ہو جاتی ہے ۔۔۔ ملائیشین قوم نے جان بوجھ کر اس جگہ کو نظر انداز کر دیا ہے ۔۔۔ تاکہ آنیوالے سیاح دیکھیں کہ ظلم کی کھیتی کبھی ہری نہیں ہوتی اور اکڑ کر چلنے والوں کے قدموں کے نیچے کی زمین کبھی سر سبز و شاداب نہیں ہوتی ہاں دو تین درخت موجود تھے جن کی مضبوط شاخوں پر رسی کے جھولے لٹکے ہوئے تھے اس قلعہ میں ان جھولوں کا اور وہ بھی روایتی جھولوں کا مقصد سمجھ میں نہیں آیا ۔۔ اس ملک میں ناساون آتا ہے نا بھادوں جاتا ہے کیونکہ یہاں تو صدیوں سے ایک سا موسم ہے ۔۔۔ ہر روز بارش ہوتی ہے ۔۔۔ اور سدا پھول کھلتے ہیں ۔۔۔ مگر دن میں دھوپ ستاتی ہے اور رات میں اپنے اثرات قائم رکھتی ہے۔

انہی درختوں سے ذرا ہٹ کر ۔۔۔ تین تمبو ۔۔۔ بانسوں کی مدد سے کھڑے کئے گئے تھے آپ پاکستانی تو پہنچاتے ہیں کہ یہاں کے شہروں میں پولیس افسروں ۔۔۔ وزیروں اور اہم سیاستدانوں کے گھروں کے باہر چوکیداروں اور سپاہیوں کے لئے ایک چھولداری سی لگی ہوتی ہے ۔۔۔ اچھا بھلا سا نام ہے ۔۔۔ بس ویسی ہی تین چھولداریاں بنی ہوئی تھیں ۔۔۔ زمین پر کیلیں گاڑ کر رسوں کی مدد سے انہیں کھڑا کیا ہوا تھا ۔۔۔ کہا جاتا ہے یہ وہ Canopies ہیں، اور اسی جگہ پر کھڑی کی گئیں ہیں ۔۔۔ جہاں فاتحین و قابضین نے اپنا پہلا پڑاؤ ڈالا

تھا۔۔۔خیال رہے کہ یہ چیزیں اصل نہیں بلکہ ان کا ہو بہو چربہ ہیں۔۔اور ماڈل کے طور پر محفوظ کی گئیں ہیں۔۔۔ جو'' فاتح پینانگ'' فرانس لائٹ اور اس کے سپاہیوں کے لئے ڈالی گئیں تھیں۔۔۔۔ مجھے تعجب ہوا کہ سترہویں صدی میں انگریزوں کے پاس ایسی چھولداریاں بھی نہیں تھیں۔۔۔جن کے حصول کی خاطر وہ ہزاروں میل کا سمندری سفر طے کر کے۔۔۔۔خطرات مول لیکر۔۔۔جان جوکھم میں ڈال کر یہاں ان تمبوؤں میں رہنے آئے تھے۔۔۔پھر خیال آیا ۔۔۔دوسرے کا علاقہ ہڑپ کرنے۔۔۔اس پر قبضہ کرنے اور ظلم کرنے کے بعد فاتح کو جو جیت نصیب ہوتی ہے۔۔اس کا نشہ انسانی جبلت کو بے حد مرغوب ہے۔۔۔

ان چھولداریوں کے سامنے۔۔۔تین لمبے بانسوں کو اوپر سے باندھ کر ان کی ٹانگیں چوڑی کر کے کھڑا کیا ہوا تھا اور ان بانسوں کے سرے پر ایک رسی بندھی ہوئی تھی اور اس کے نچلے سرے پر ہنڈیا یا پتیلا لٹکا ہوا تھا اور اس کے نیچے چند اینٹوں کے درمیان چولہے میں استعمال ہونے والی لکڑی کے ٹکڑے رکھے تھے۔۔۔پرانے زمانے میں اسی طرح کھانا پکایا جاتا تھا۔۔۔فلموں میں بھی یہ منظر آپ نے اکثر دیکھا ہوگا۔۔۔گمان غالب ہے کہ ساڑھے تین سو سال پہلے برطانیہ اور پینانگ میں کچن اور رسوئی کا تصور نہ تھا۔۔۔اور اگر باورچی خانے کا تصور تھا تو گوروں نے ابتدائی دنوں میں اس قلعہ میں باورچی خانہ بنانے کی ضرورت محسوس نہیں کی وہ اسی طرح اپنے لشکر کے لئے کھانا پکاتے تھے۔۔۔بہر حال اس قلعہ میں، انگریز فاتحین کے سامان حرب میں سے جو کچھ باقی بچا ملائیشین حکومت نے اسے جوں کا توں سجا کر قلعہ کو یادگار بنا دیا۔۔۔تین رنگٹ کا ٹکٹ بھی اس لئے رکھا ہے کہ سیاح آئیں اور ظالموں۔۔۔پر تین حرف بھیجیں

اس قلعہ میں پینانگ کی انتظامیہ نے ایک اوپن ایئر تھیٹر بنایا ہے۔۔۔نیم گول دائرے میں چوڑی سیڑھیوں کی شکل میں تماشائیوں کے لئے نشستیں تعمیر کی گئیں ہیں اور اس کے سامنے ایک اسٹیج ہے جس پر ٹن کی چھت ہے۔۔۔غالب گمان ہے کہ یہاں میوزیکل کنسرٹس ہوتے ہونگے یا قومی ایام میں تقاریب منعقد ہوتی ہونگی۔۔۔ہم اسٹیڈیم کی سیڑھیاں / نشستیں چڑھتے ہوئے اوپر تک گئے۔۔۔یہاں قلعہ کی دیوار پر بہت سی زنگ آلو پرانی توپیں نصب ہیں۔۔۔شہری انتظامیہ نے اس قلعہ میں، بجلی اور ٹیلیفون کے اونچے اونچے ٹاور بھی نصب کئے ہوئے ہیں۔۔۔اور ان اداروں کے ملازمین بھی یہاں موجود رہتے ہیں۔۔۔

موسم گرم تھا۔۔۔بہت زیادہ نہیں لیکن خوشگوار نہیں تھا، ہمیں اور بیگم کو چیزیں دیکھنے کا شروع

سے ہی شوق رہا ہے اس لئے ہم ہر جگہ چیزوں کو جھانک جھانک کر دیکھتے تھے اور آس پاس کے بارے میں راہگیروں سے بھی پوچھتے تھے تاکہ اپنے پڑھنے والوں کو زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کر سکیں۔۔۔

☆☆☆

محمد دروازہ کے قریب کھڑا ہماری واپسی کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔۔۔ہم قلعہ سے باہر نکلے۔۔۔کوسٹر میں بیٹھے۔۔۔کچھ دیر بعد گاڑی کی ٹھنڈی فضا نے ہمیں پھر سے تازہ دم کر دیا۔۔۔میں نے محمد سے پوچھا کہ کیا ملائیشیا میں پینے کے پانی کی قلت ہے۔۔۔۔۔اس نے فوراً! جواب دیا بالکل نہیں پانی بہت!!

ہم نے شکایت کی یہاں کسی ہوٹل۔۔۔شاپنگ سینٹر۔۔۔دکان، تفریحی مقام پر، پینے کے لئے پانی نہیں ملتا۔۔۔پانی کا خیال اس لئے آیا کہ جو بوتل ہم ہوٹل سے لیکر چلے تھے وہ ختم ہوگئی تھی اور پیاس لگ رہی تھی۔

محمد نے کہا کہ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔۔۔یہاں پانی خرید کر پیتے ہیں۔۔۔ویسے ہوٹل میں آپ جو پانی استعمال کرتے ہیں وہ بھی صاف ہے۔۔

ہم نے کہا، وہ تو ٹھیک ہے لیکن باتھ روم کے نلکے سے پانی لیکر پینا کچھ اچھا نہیں لگتا۔

محمد نے کہا کہ میری بیوی ایک بڑے برتن میں پانی ابالتی ہے اور صبح دو بڑی بوتلیں بھر کر مجھے دے دیتی ہے۔۔۔میں اگر ایسا نہ کروں تو میری ایک چوتھائی تنخواہ پانی خرید کر پینے میں صرف ہو جائے۔۔

ہم نے کہا دنیا بھر کے ہوٹلوں کے کمروں میں پانی کا جگ بھر کر رکھ دیا جاتا ہے، اور جتنی بار طلب کرو وہ بغیر معاوضہ کے پانی فراہم کر دیتے ہیں۔۔۔ہمارے ہاں تو کھانے پینے کی ہوٹلوں میں پانی کا جگ پہلے اور آرڈر لینے والا ویٹر بعد میں آتا ہے۔۔۔۔لیکن یہاں ہوٹل والے بھی پینے کا پانی قیمتاً دیتے ہیں۔۔

محمد نے کہا۔۔۔یہ کمرشل سوسائٹی ہے۔۔۔ہر چیز اور خدمت کی قیمت دینی پڑتی ہے مقامی لوگ بھی گھر سے باہر ہوں تو خرید کر ہی پانی پیتے ہیں۔۔

ہم اپنے قارئین کو ایک بات بتانا بھول گئے۔۔۔اس قلعہ میں محافظوں کے چند آدم قد ماڈل بھی کھڑے ہیں ان کے علاوہ دو تین ہماری آپ کی طرح کے لوگ بھی ہیں ان کو وہی قدیم

لباس پہنایا گیا ہے جو ساڑھے تین سو سال پہلے رائج تھا۔۔۔لندن کے بیشتر تاریخی مقامات اور عجائب گھروں کے باہر بھی ایسے محافظ نظر آتے ہیں مگر ان کا لباس، صورت شکل اور چال ڈھال ترقی یافتہ برطانیہ کی عکاسی کرتی ہے۔۔۔یہاں کے محافظوں کا لباس غریبانہ ہے۔۔۔ویسا ہی جیسا تین چار سو صدی پہلے برطانیہ کی فوج کا لباس ہوا کرتا تھا۔۔۔

قلعہ سے گاڑی نکل کر پھر بارونق علاقہ میں آ گئی۔۔۔ایک چورنگی پر ایک گھنٹہ گھر ہے بالکل سکھر کے گھنٹہ گھر کی طرح۔۔گھڑی کی سوئی صحیح وقت بتا رہی تھی۔۔۔ہمیں تعجب ہوا کہ حیدآباد۔۔۔فیصل آباد۔۔میری ویدر ٹاور کراچی۔۔بلدیہ عظمیٰ کراچی اور سکھر کے گھنٹہ گھر میں نصب گھڑیوں کی سوئیاں شاید ہی کبھی وقت کے ساتھ چلتی ہوں۔۔۔اصل میں گھڑی کی سوئی کی رفتار کی اہمیت اس قوم کے لئے ہوتی ہے، جسے وقت کا خیال ہو ہم نے تو گھڑی بھر کو بھی گھڑی کی رفتار پر توجہ نہیں دی۔۔۔وقت تو کسی کا انتظار نہیں کرتا۔۔۔وہ سوئی کی رفتار کا پابند نہیں ہوتا ہمارے لئے وقت تھم گیا ہے گذشتہ ساٹھ سال سے ہم وہیں کھڑے ہیں۔۔۔وقت غیروں کی گھڑیوں میں سفر کرتا ہے۔۔۔وقت نے بڑی بڑی طاقتوں کو اپنا پابند کیا ہے جبکہ وقت ہمارا پابند ہے بس ایک کرکٹ میچ وقت پر ہوتا ہے وہ بھی اس لئے کہ آئی۔سی۔سی کے قوانین بہت سخت ہیں۔۔۔ہاں موذن گھڑی دیکھ کر اذان دیتا ہے۔۔۔سردی ہو یا گرمی ہو۔۔۔برسات ہو کہ اس کی اپنی بیٹی کی بارات۔۔۔بس موذن پانچ بار وقت کی پابندی کرتا ہے۔۔۔ورنہ وقت کے حکمرانوں سے لیکر PIA تک پاکستان ریلویز سے لیکر ایرے غیرے نتھو خیرے تک سب ہی اپنے وقت کے مالک ہیں۔۔۔یہاں آئے تو پتہ چلا کہ لوگ وقت کے پابند نہیں غلام ہیں۔۔۔ہمارا تو AOS سے پالا پڑا۔۔۔ان کی پابندی وقت پر کوئی کلام نہیں، جانے اس قوم نے گھڑی کی سوئی کی رفتار کے ساتھ اپنی رفتار کیوں کر قائم کر رکھی ہے شاید اس لئے کہ ملائیشین نے ساڑھے تین سو سال غلامی میں بسر کئے اور ہم نے 90 برس۔۔۔زیادہ عرصہ غلام رہے ہوتے تو وقت کے غلام ہو گئے ہوتے ہم نے جلدی آزادی حاصل کر لی اس لئے وقت سے بھی آزاد ہو گئے۔۔۔اور ایسے مادر پدر آزاد ہوئے کہ پرکھوں کی روایتوں کو توڑا۔۔۔اسلامی تعلیمات سے منہ موڑا۔۔۔باہمی اخوت کے رشتوں کو چھوڑا۔۔۔علامہ اقبال کہتے رہے کہ ملت میں گم ہو جا لیکن ہم اپنی ذات میں گم ہو گئے نتیجہ یہ نکلا کہ دوسری اقوام کے مقابلے میں ہم بار ہویں کھلاڑی بن کر رہ گئے۔۔۔اب میدان سے باہر بیٹھے اپنے سے کمزور قوموں کو کھیلتے دیکھ رہے ہیں۔۔۔

کہاں گم ہو گئے یہ دیکھیں اپنا طارق روڈ۔۔۔بیگم نے ٹہوکا دیتے ہوئے کہا۔۔

ہم نے دائیں بائیں دیکھا واقعی صدر کے علاقہ میں نکل آئے۔۔۔گاڑی ایک تنگ بازار سے گذر رہی تھی۔۔۔مسجد دیکھی، اس کے برابر مندر دیکھا۔۔۔۔اس کے ساتھ ملا ہوا گرجا۔۔۔اور اس سے ذرا فاصلہ پر بدھ مت کا ٹیمل۔۔۔محمد نے بتایا کہ یہیں کہیں ایک چھوٹا گردوارہ بھی ہے۔۔۔۔گردوارہ تو نہیں دیکھا۔۔۔سکھ دیکھے۔۔۔بھارتی فلموں میں نظر آتے ہیں۔۔۔یہاں بچشم خود دیکھ لئے۔۔۔جی چاہا گاڑی سے اتر کر ان سے کوئی لطیفہ سنیں۔۔۔۔پھر خیال آیا۔۔۔یہ تو سرتا پیر لطیفہ ہیں۔۔۔۔انہیں دیکھ کر ہنسی آرہی ہے، ان سے لطیفہ سن لیا تو پھر قہقہے کون روکے گا۔۔۔یہاں تو اونچی آواز میں بات کرنا شور وغل مچانا بھی منع ہے۔۔۔ہم نے سڑک کے کنارے کئی جگہ بھونپو پر کراس لگا دیکھا ہے۔۔۔۔یقیناً نیچے مقامی زبان میں لکھا ہوگا ہارن بجانا منع ہے۔۔۔۔یہاں اگر لکھا ہے ''منع ہے'' تو اس کا مطلب ہے'' منع ہے''۔۔۔۔برسوں پہلے کراچی شہر میں ہسپتالوں اور اسکولوں کے قریب ایسے سائن بورڈ لگے ہوتے تھے مگر ان پر عمل کبھی کسی نے نہیں کیا۔۔۔

رہی بات سکھوں کی تو خیال آیا یہ قوم تو بڑی کشادہ دل اور محبت کرنے والی ہے، محنت کرنیوالی بھی ہے۔۔۔۔یہی وجہ ہے کہ پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔۔۔اپنے کام کی وجہ سے ہر جگہ عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔۔۔۔ہم سکھوں کے لطیفے گھڑتے رہے اور وہ ترقی کی دوڑ میں آگے بڑھتے رہے۔۔

محمد نے بتایا کہ یہ Harmoney Street ہے۔۔۔تمام مذاہب کے لوگ آس پاس کی گلیوں میں کاروبار کرتے ہیں، ایک دوسرے پر دل نثار کرتے ہیں اور سیاحوں سے پیار کرتے ہیں اور گاہکوں کے لئے مثل خدمت گار ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔

ہم آگے بڑھے۔۔۔تو انڈین اسٹریٹ۔۔۔دکانوں کے شوکیسز، ساڑیوں، چوڑیوں، دولہا دلہن کے روایتی جوڑوں کھلونوں۔جوتوں۔کتابوں۔۔۔۔اور مردانہ وزنانہ کپڑوں سے سجے ہوئے۔۔۔۔یہاں جیولری کی دکانیں بھی تھیں۔۔۔۔لگا ہم اپنے ہی شہر کے گلی بازاروں میں نکل آئے۔۔۔۔ایک چھوٹی سی چورنگی پر ایک ٹھیلہ والا کڑھائی پر تازہ تازہ سموسے تل رہا تھا۔۔۔۔ہم نے گاڑی رکوائی۔۔۔تازہ تازہ پیاز کے پکوڑے۔۔۔نمک پارے۔۔۔جلیبیاں۔۔۔چڑے۔۔۔آلو کے کباب۔۔۔محسوس ہوا برنس روڈ پر آگئے۔۔۔چیزیں زیادہ مہنگی نہیں

تھیں ۔۔۔ بہت ساری خرید لیں ۔۔۔ سموسے بہت گرم تھے ہندو سموسے تھے یا مسلمان سموسے ۔۔۔۔ ہوسکتا ہے عیسائی سموسے ہوں کیونکہ عیسائی ہونے کے لئے گورا ہونا ضروری نہیں ۔۔۔ یہاں پتا تھوڑی چلتا ہے لیکن سموسے کھائے تو بے حد لذیز ۔۔۔۔ بیچنے والا ٹوٹی پھوٹی اردو بول رہا تھا ۔۔۔۔ تامل مسلمان لگتا تھا ۔۔۔۔ ساؤتھ کا مسلمان بھی ہوسکتا ہے ۔۔۔۔ ہمیں اس سے کیا اس علاقہ میں جب ہندو مسلم سکھ عیسائی اور بدھ مل کر رہ سکتے ہیں تو ہم یہاں کے سموسے کیوں نہیں کھا سکتے ۔۔۔۔ ہمیں یہاں کون دیکھ رہا ہے ۔۔۔ اور دیکھ بھی رہا ہے تو پہچانتا کون ہے ۔۔۔۔ ہمارا شہر تھوڑا ہی ہے کہ ایک دن مکی مسجد سے نماز پڑھ کے نکلے ، ایک واقف کار مل گئے ۔۔۔ حیرت سے دیکھا اور کہا ۔۔۔۔ اس مسجد میں نماز پڑھی خیر کوئی بات نہیں ، گھر جا کر دہرا لینا ۔۔۔۔ پچھلے سال کی بات ہے کہ مدنی مسجد کے دروازہ پر گاڑی روک کر جمعہ پڑھنے کے ارادے سے نکلے تو دفتر کے ایک پرانے ساتھی مل گئے ۔۔۔۔ کہنے لگے ۔۔۔۔ اگلی گلی والی مسجد میں آجاؤ ۔۔۔ اپنے مسلک کی مسجد ہے ۔۔۔ یہاں محمد بتا رہا ہے یہ Hormoney street ہے ۔۔ مسلک اور فرقہ چھوڑو ۔۔۔۔ یہ تو مرکز اتحاد ادیان عالم ہے ۔۔۔۔ یہی وجہ ہے کہ ہم سے زیادہ شاد و آباد ہیں ۔۔۔۔ اور ہم ۔۔۔ خیر چھوڑیئے ، کن خیالات میں الجھ گئے ۔۔۔

یہاں ایک طرف گنگری اسٹریٹ ہے ، ایک جانب سہالہا سٹریٹ ۔۔۔ انڈین اسٹریٹ کی طرف محمد نے اشارہ کر کے ہنستے ہوئے کہا یہ ''بالی وڈ'' کے نام سے مشہور ہے ۔۔۔ پھر محمد نے قہقہہ لگایا اور شرماتے ہوئے بولا ۔۔۔ ایشوریہ ۔۔۔ اسے میں پسند کرتا ہوں ۔۔۔۔ ہم بھی ہنسے بیگم نے کہا شاہ رخ کا نام سنا ہے ۔۔۔۔ بولا ہاں ۔۔۔ لیکن مجھے سلمان خان اچھا لگتا ہے ۔۔۔ ہلکی پھلکی گفتگو ہوتی رہی ۔۔۔۔ انڈین اسٹریٹ پر ایک دکان کے باہر فلمسٹار رجنی کانت کی بہت بڑی تصویر لگی ہوئی تھی ۔۔۔۔۔ یہاں زیادہ تر تامل مسلمانوں اور ہندوں کی دکانیں ہیں اس علاقہ کو بمبئی بازار بھی کہا جاتا ہے ۔۔۔۔ یہیں راستے میں Seventh day advintes Hospital & Church پر نظر پڑی ۔۔۔۔ دنیا کتنی چھوٹی ہے ۔۔۔۔ یادیں کیسے اچانک تازہ ہوجاتی ہیں ۔۔۔۔ اس نام کے ہسپتال کے سامنے سے ہم ہزاروں بار گذرے تین برس تک ریڈیو پاکستان کراچی جانے کے لئے اسی سیونتھ ڈے ہسپتال کے سامنے سے گذرنا پڑتا تھا ایم ۔ اے ۔ جناح روڈ پر اب بھی موجود ہے ۔۔۔۔ یہی نہیں بلکہ ایک زمانہ میں ہمیں اپنی بھاوج شاہندہ مظہر کا شناختی کارڈ بنوانے کے لئے اس ہسپتال میں آنا پڑا

کہ میری بھاوج اسی ہسپتال میں پیدا ہوئی تھی۔۔۔مظہر اب اپنے بچوں کے ساتھ ہیوسٹن میں ہے ۔۔۔سات برس سے ملاقات نہیں ہوئی۔۔۔دور کے فاصلے۔۔۔ وسائل اور مسائل کا سامنا۔۔۔لیکن کب۔۔۔کہاں، کس جگہ کس چیز کو دیکھ کر اپنے پیاروں کی یادیں میٹھے میٹھے درد کی طرح رگ وپے میں سرسراتی ہیں۔۔۔اور دل ونگاہ میں تازہ ہو جاتی ہیں ہمیں ماں جایا یاد آ گیا تو فاصلے سمٹ گئے۔۔۔وقت تھم گیا۔۔۔ میں نے منو سے کہا شانی مظہر کے بچوں کے لئے یہاں سے کچھ خرید لیں۔۔۔کہنے لگیں کوالالمپور سے ان کے لئے چیزیں لونگی پھر بچیوں کیلئے بھی چیزیں لینی ہے۔۔۔''ریو'' کے لئے بھی toys لینے ہیں۔۔۔مجھے میرا چھوٹا پوتا یاد آ گیا جوان دنوں، مظہر اور شانی کے ساتھ ہیوسٹن میں ہے۔۔۔۔

اس دوران محمد آس پاس کے علاقہ کے بارے میں بتاتا رہا۔۔۔ہم کھوئے ہوئے تھے یادوں کی ڈوریں ہمیں ہیوسٹن لے گئیں تھیں۔۔۔۔سیل فون کی ایجاد بڑے کام کی سہی لیکن یادوں سے زیادہ برق رفتار اور محفوظ تو موبائل فون بھی نہیں۔۔۔اب ہم چائنا ٹاؤن آ گئے۔۔۔ ایک گلی کے نکڑ پر پگوڈا کی طرز میں رنگ برنگا گیٹ بنا ہوا تھا۔۔۔دکانوں کا سامان فٹ پاتھ پر رکھا ہوا تھا۔۔۔قطار سے ٹھیلے لگے ہوئے تھے اور چھوٹی چھوٹی طرح طرح کی چیزیں ان پر سجی ہوئیں تھیں۔۔۔۔صدر بازار کی گلیوں کی طرح۔۔۔۔اسی دوران نارتھم ٹاؤن کی ایک بہت اونچی عمارت۔۔۔پر نظر پڑی۔۔۔۔ بہت خوبصورت تھی۔۔۔اس لئے یاد رہ گئی۔۔۔ چائنا ٹاؤن میں ایک چھوٹا سا ٹیمپل بھی تھا۔۔۔۔اس بات کی ہم وضاحت کرتے چلیں کہ ان گلیوں کے جو نام ہم نے لکھے ہیں وہ سرکاری نہیں ہیں۔۔۔یہاں کے لوگ ان گلیوں کو اپنی اپنی وابستگی کی وجہ سے اپنی اپنی پسند کے ناموں سے پکارتے ہیں، اور انہی ناموں سے یہ گلیاں مشہور ہیں۔۔

تنگ اور بارونق بازاروں سے گذر کر ہم ایک بار پھر کھلی سڑک پر آ گئے۔۔۔ٹریفک رواں دواں۔۔۔۔دائیں بائیں بلند و بالا عمارتیں اور ان کے قدموں میں صاف ستھرے ٹائلوں اور اینٹوں کے فٹ پاتھ اور ان فٹ پاتھوں میں سیاحوں کا ہجوم۔۔۔۔محمد نے ایک بڑی سی دکان کے سامنے گاڑی روک دی۔۔۔محمد نے بتایا کہ کافی اور چاکلیٹ کی یہ سب سے بڑی دکان ہے۔۔۔۔بیگم نے کہا کہ ہمیں چاکلیٹ نہیں خریدنے۔۔۔محمد نے اصرار کیا کہ آپ دیکھ لیں یہاں دنیا کی بہترین کافی ملتی ہے۔۔۔۔یہ خود بناتے ہیں۔۔۔۔یہاں رکنا ہمارے پروگرام

میں شامل نہیں تھا۔۔۔ لیکن محمد کے پروگرام میں شامل تھا۔۔۔ آپ جانتے ہیں کہ ہائی وے۔۔۔ یا سپر ہائی وے پر سفر کرتے ہوئے ہر بس ڈرائیور کی اپنی پسند کی ڈرائیور ہوٹل ہوتی ہے۔۔۔ جہاں وہ مسافروں کی مرضی معلوم کئے بغیر بس کھڑی کر دیتا ہے۔۔۔ مسافر نہ چاہنے کے باوجود ہوٹل میں چاء پی لیتے ہیں ۔۔۔ محمد نے ہمارے ساتھ بھی یہی کیا۔۔۔ بہت بڑی دکان۔۔۔ جلی لفظوں میں لکھا تھا Fine Coffee & Choclate دکان کا نام Coffee Tree تھا۔۔۔ ہم شیشے کا دروازہ کھول کر اندر گئے۔۔۔ حیران ہوئے ۔۔۔ بڑی کشادہ۔۔۔ اور ٹھنڈی دکان۔۔۔ دیواروں پر۔۔۔ درمیان میں شوکیسز میں کافی اور چاکلیٹ کے چھوٹے بڑے ڈبے۔۔۔ پیکٹس۔۔۔ شیشیاں چھوٹے مرتبان ترتیب سے رکھے ہوئے تھے اور ان کی ملی جلی خوشبو ہر سو پھیلی ہوئی تھی ۔۔۔۔۔۔۔۔ دو قدم چلے کہ ہنستی مسکراتی لڑکیوں نے سواگت کیا۔۔۔ بغیر طلب کئے ۔۔۔ ایک تھرماس اٹھایا اور ایک چھوٹے سے پلاسٹک کے گلاس میں ایک گھونٹ سے ذرا کم کافی انڈیلی اور ہماری طرف بڑھا دی۔۔۔ گرم گرم کافی ہم نے چھکی ۔۔۔ بڑی لذیز ۔۔۔ اتنی دیر میں دوسرے تھرماس سے انڈیل کر ایک نیا پیپر کپ ہماری طرف بڑھا دیا۔۔۔ یہ اور بھی لذیز۔۔۔ ذائقہ میں ذرا مختلف ۔۔۔ ہم ابھی سنبھل بھی نہ پائے تھے کہ تیسرے تھرماس سے ایک اور کپ میں کافی انڈیل کر ہماری طرف بڑھا دی۔۔۔ کافی کی SIP لی تو آنکھیں کھل گئیں۔۔۔ تھکن دور ہوگئی۔۔۔ رگ و پے میں تازگی اور سرور کا احساس اترتا چلا گیا۔۔۔ اب ہمیں اندازہ ہو گیا کہ لوگ پہلی بار شراب کیسے پیتے ہونگے۔۔۔ خوبصورت، گوری چٹی، پیاری سی لڑکی ۔۔۔ جام پہ جام بھرتی رہی اور ہم پیتے رہے۔۔۔ اس لمحہ بیگم کا بھی خوف و خیال نہیں آیا ہم نے کن انکھیوں سے دیکھا کہ بیگم کو ایک خوش اخلاق نوجوان جھک جھک کر جام پیش کر رہا ہے۔۔۔ اور وہ بھی پیے جا رہی ہیں۔۔۔ میں بیگم کے قریب گیا۔۔۔ تو بے نیازانہ انداز میں کہنے لگیں ۔۔۔۔ مجھے تو بہت اچھی لگی آپ کون سی خریدیں گے۔۔۔ یا مظہر العجائب بیگم کب سے اتنی فراخدل ہوگئیں، انداز ایسا تھا کہ جیسے کوفی بیچنے والیوں کی طرف اشارہ کر رہی ہیں پھر بیگم نے ایک ڈبا اٹھا کر کہا مجھے تو یہ پسند ہے۔۔۔ میں دو پیکٹ لے رہی ہوں۔۔۔ آپ بتائیں کون سی پسند ہے ہماری خوش فہمی دور ہوگئی۔۔۔۔۔ ادھر سیلز پرسن کا تقاضہ۔۔

This one ..which one----ok-----this is best in the-

world---- take it --- we make special for you۔

دکان سے باہر نکلے تو بیگم کے ہاتھ میں چاکلیٹ اور کافی سے بھرا ایک شاپنگ بیگ تھا۔۔۔

گاڑی میں بیٹھے۔۔۔ہوٹل کی طرف روانہ ہوئے۔۔۔کچھ دیر خاموشی رہی پھر بیگم کی آواز سنائی دی۔۔۔کمبخت پیچھے ہی پڑ گیا۔۔۔چاکلیٹ تو گھر میں بہت پڑی ہیں۔۔۔ابھی مون امریکہ سے لایا تھا۔۔۔صوفو کو چاکلیٹ پسند بھی نہیں ہیں۔۔۔بیکار میں خرید لیں۔۔۔ٹھیک کہتی ہو۔۔۔کمال کی سیلز گرل ہیں۔۔۔جانے کونسی کافی کی طرف اشارہ کیا تھا۔۔۔

مجھے کیا معلوم آپ نے کہا یہ بھی لیلو۔۔۔یہ بھی لے لو۔۔۔میں نے خرید لیں۔۔۔ سچ پوچھو تو یہ سب اس کی چکر بازی ہے بیگم نے ڈرائیور کی طرف اشارہ کر کے سرگوشی میں کہا۔۔۔ یقیناً یہاں سے اس کو کمیشن ملتا ہوگا۔۔۔

اب ہم تھک گئے تھے۔۔۔تھوڑی دیر بعد ہوٹل آ گیا۔۔۔ڈرائیور ہمیں پورچ میں چھوڑ کر چلا گیا۔۔۔

☆☆☆

کچھ کھا پی کر ہم سو گئے۔۔۔شام ساڑھے پانچ بجے اٹھے۔۔۔شاور لیا۔۔۔دیکھا بیگم

پہلے سے تیار ہیں اور کیتلی میں پانی گرم کر رہی ہیں۔۔۔۔میں نے ڈرائنگ روم کی دیوار پر پڑے ہوئے پردے کو سرکایا تو وہ کھلتا چلا گیا۔۔۔ بھاری اور جالی دار دونوں پردے ایسے کھلے۔۔۔۔ایسے کھلے۔۔۔ہمارے گھر اگر کوئی خاص مہمان آجائے تو ڈرائنگ روم کے پردے کو جھٹکے دے دے کر کھولنے میں وقت لگ جاتا ہے۔۔۔اور مہمانوں کے سامنے شرمندگی الگ ہوتی ہے یہاں یہ عالم کہ دونوں ہاتھوں سے پردہ پکڑ کر سرکایا تو بند قبا کی طرح کھلتا چلا گیا۔۔۔یہ گیلری تھی۔۔۔دو پلاسٹک کی ہلکی کرسیاں اور ایک سوراخوں والی Plastic Table ۔۔۔۔ سامنے خوشگوار منظر۔۔۔کل رات ہم نے بیڈ روم کا پردہ ذرا دیر کے لئے کھولا تھا، باہر اندھیرا تھا بس سمندر کی لہروں کی سرسراہٹ نے یہ خبر دی کہ۔۔۔ہوٹل سمندر کے کنارے واقع ہے۔۔۔ اب جو منظر دیکھا تو دل باغ باغ ہوگیا۔۔۔تا حد نگاہ، نیلگوں سمندر اور اسکی لہریں ہماری ہوٹل کی بیرونی چہار دیواری سے دس بیس قدم دور آجا رہی تھیں۔۔۔ادھر ادھر چند چھوٹی کشتیاں تیر رہی تھیں۔۔۔۔دور ایک فیری بھی نظر آرہی تھی جبکہ Jet Ski پر ایک پرجوش نوجوان ساحل کے قریب چکر لگا رہا تھا۔۔۔اب نویں منزل سے ہم نے نیچے نگاہ ڈالی تو انتہائی خوبصورت اور رومان پرور منظر ہمارا منتظر تھا۔۔۔سورج افق کی طرف سفر کر رہا تھا۔۔۔ٹھنڈے مزاج کا سورج اجالا برسا رہا تھا۔۔۔دھوپ میں تیز چمک اور شدت نہیں تھی۔۔۔ہماری نظروں کے نیچے سوئمنگ پول تھا۔۔۔ہمارے ذہن میں اب تک ہالیڈے ولا لنکاوی کا سوئمنگ پول تازہ تھا لیکن یہ Pool تو اس سے کہیں زیادہ بڑا، نیلگوں سبز مائل شفاف پانی۔۔۔اس کے دائیں جانب ایک اور چھوٹا پول۔۔۔چھوٹے پول میں پانی کہاں سے آرہا تھا یہ تو اندازہ نہیں ہوا لیکن چھوٹے پول سے پانی ایک کشادہ نالی سے گذر کر بڑے پول میں آبشار کی صورت گر رہا تھا اس کشادہ نالی پر کمان کی صورت لکڑی کے تختوں کا پل بنا ہوا تھا جس سے گذر کر آپ پول کے ساتھ انتہائی رومان پرور باغ میں داخل ہو سکتے ہیں۔۔۔

سوئمنگ پول کے دو طرف ناریل کے سینکڑوں بے ترتیب درختوں کا قدرتی حسن۔۔۔۔ ہمارے ہاں ناریل کے درخت مٹیالے اور گرد آلود ہوتے ہیں۔۔۔۔وہاں تو یوں لگتا تھا کہ سب نے ابھی ابھی غسل کیا ہے اور نئی نویلی دلہن کی طرح گیلے بال چھپانے کی کوشش میں کھلے پڑے ہیں شاخوں اور جھکے پتوں پر نظر پڑے تو دل کو تر و تازگی محسوس ہو۔۔۔انہی درختوں کے جھنڈ کے آس پاس سبز اور سفید سیٹوں کی جہازی سائز چھتریاں اور ان کے نیچے سفید رنگ کی سوئمنگ چیرز

اور لمبی کرسیوں پر مدہوش گوریاں اپنے تن کو دو پٹیوں سے ڈھانپیں، آنکھیں موندیں گم سم پڑی ہیں درختوں کے جھنڈ میں کہیں کہیں ایسی بڑی آہنی چھتریاں جن پر گھاس پھوس لگا کر تھرپار کر کی گول جھگیوں کا تاثر دینے کی کوشش کی گئی تھی اور اس میں وہ کامیاب رہے تھے اوپر سے دیکھو تو یہی محسوس ہوتا تھا کہ یہ تھر کے غریب ہاریوں کے گھر ہیں۔۔۔سوئمنگ پول میں خاصے لوگ پیرا کی میں مصروف تھے۔۔مگر ایسے بھی کاہل اور سست تھے جو چھ فٹ کے ربر کے گدے میں ہوا بھر کر پول میں لیٹے ہوئے تھے یہ ایسی ہی پیرا کی تھی جیسے امیر گھرانوں میں واکنگ کے لئے مشین موجود ہوتی ہے۔۔۔وہ کسی کھلی فضا میں سڑک کے کنارے یا کسی پارک کے واکنگ ٹریک پر جوگنگ کرنیکی بجائے اپنے گھر ہی میں یہ کام انجام دے لیتے ہیں، اگر وقت مل جائے تو۔۔۔!!

ہمیں خود یہ طریقہ بہت پسند آیا۔۔۔نا پیر چلاؤ نا ہاتھوں سے چھپاکے مارو۔۔۔ڈوبنے کا خطرہ نا خوف۔۔۔ربر کے بستر پر آنکھیں موندیں لیٹے رہو۔۔۔! سوئمنگ بھی ہو رہی ہے اور پانی کی تراوٹ بھی بدن کو بگھو رہی ہے۔۔۔گویا آپ ''حالت آب'' میں ہیں۔۔۔بدن کے نیچے پانی کی ہلکی ہلکی ٹھنڈک، اوپر سے خوشگوار سورج کی کرنوں کے پولے پولے ہاتھوں سے سکائی ۔۔۔ایک ٹکٹ میں دو مزے۔۔۔ارے جناب یہاں ایک اور چیز دیکھی۔۔۔ہمارے لئے تو نئی تھی۔۔۔یعنی سوئمنگ پول کے بیچ میں ایک گول دائرہ کی کافی شاپ بنی ہوئی تھی۔۔کافی شاپ تو ہم نے محاورتاً لکھا ہے۔۔۔ظاہر ہے یہاں کولڈ ڈرنکس Serve کی جاتی ہونگی۔۔۔ایک گول کمرہ اس کے باہر ایک Round Desk اور اس کے گرد کوئی گز بھر اونچے اونچے اسٹول۔۔۔ کچھ لوگ ان اسٹول پر عریاں بیٹھے مشروبات سے دل بہلا رہے تھے ۔۔۔عریاں ہم نے اس لئے کہا کہ ان کی مختصر سی چڈی اسٹول کی گدی میں چھپ گئی تھی اور سینے کو چھپانے والی کمر میں بندھی ڈوریاں ہمیں دور سے یعنی بلندی سے نظر نہیں آ رہی تھی کیونکہ ان کی پشت ہماری جانب تھی لیکن ہمیں یقین ہے کہ وہ مادر زاد ننگی تھیں۔۔۔اس دوران بیگم ہاتھ میں کافی کا کپ لے کر آ گئیں ہماری طرف کافی کا مگ بڑھا دیا۔۔۔ریلنگ کے قریب آ کر انہوں نے تا حد نگاہ پھیلے ہوئے سمندر کو دیکھا اور خوش ہو گئیں۔پھر سر جھکا کر سوئمنگ پول کو دیکھا اور منہ بنایا

میں نے پوچھا۔۔۔کافی اچھی نہیں ہے۔۔

کہنے لگیں۔۔۔کافی تو بہت مزیدار ہے لیکن یہ ننگی پانڈی کیا اسٹول میں بیٹھی شراب پی رہی ہے؟

میں نے کہا ۔۔۔نہیں بھئی ۔۔۔حالت آب اور غسل آفتاب میں مشغول ہیں ۔۔۔شباب کو شراب دینے سے یہ خود اجتناب کرتے ہیں ۔۔۔اگر شباب پر شراب چڑھ جائے اور اسٹول سے لڑھک کر زیر آب آجائے تو ذرا سی دیر میں یہ شباب، نقش برآب ہو جائے پھر Serve کرنے والا یوں زیر عتاب آئے کہ باقی زندگی عذاب بن جائے یہاں احتساب بیورو نہیں، احتساب ہوتا ہے، پاکستان میں بھی محتسب اعلیٰ ہوتے ہیں ان کے فیصلوں پر عمل درآمد کی خبریں ہم نے کم کم اخبار میں پڑھی ہیں، خود ہمارے دوست اسد اشرف ملک صوبائی محتسب اعلی ہیں، نہایت شائستہ، ایماندار اور شریف افسر رہے ہیں، میرا یقین ہے کہ درست فیصلے کرتے ہونگے لیکن مجھے شبہ ہے کہ ان کے فیصلوں پر سرکاری ادارے من وعن عمل کرتے ہوں۔۔۔ ہم پاکستانیوں کا اس معاشرہ میں گذرا مشکل ہے کہ ہمارے ہاں عذاب وثواب کا صرف تصور ہے لیکن یہاں عملاً حساب کتاب ہوتا ہے۔۔۔۔ ہمارے ہاں قانون کی گرفت سے بچنے کے لئے کوشش اور سفارش کا در کھلا ہے.....مگر ملائیشیز کی رگوں میں پرسش اور سرزنش کا ڈر کھلا ہے..... ہمارے ملک میں تعزیرات کی تعبیریں، تفسیریں اور وضاحتیں اپنی پسند سے بیان کی جاتی ہیں .....لیکن یہاں قانون کی توضیحات، تاویلات اور تشریحات، اپنی ضروریات کی رنگین پنی میں لپیٹ کر منصف کے حضور پیش نہیں کی جاسکتیں.....اور آپ جانتی ہیں یہاں قوانین سخت ہیں۔۔۔ایسے معاشرہ میں بھلا کون جرم کا انتخاب یا ارتکاب کرسکتا ہے۔۔۔۔ ہاشما کو تو چھوڑیئے آپ، جناب کے لئے بھی باب رعایت بند ہے۔۔۔ایسے میں انہیں شراب کون دے گا۔۔۔یہ لوگ تو Juice پی رہے ہیں۔۔۔

دیکھا آپ نے عیاشی کے کیا کیا طریقے اپنائے ہوئے ہیں۔۔نہاتے نہاتے تھک جاؤ تو سوئمنگ پول میں بیٹھے بیٹھے جو چاہو پی لو۔۔۔بیگم نے ناگواری سے کہا

جو چاہے نہیں ۔۔۔۔صرف مشروبات، عصیرات، فواکہات اور لحمیات لیکن ماکولات و مکروہات یہاں اشیاء ممنوعات میں شامل ہیں ۔۔۔میرا مطلب ہے سوئمنگ کے دوران شراب کی اجازت نہیں ہے۔۔

وہ تو ٹھیک ہے مگر یہ ننگ دھڑنگ دھوپ میں بے سدھ پڑی ہیں کم بختوں کو اپنی رنگت کا بھی خیال نہیں۔بیگم نے بات کا رخ بدل کر کہا

لیکن ایک بات ہے، کم بخت کتنی ہی عیب دار ہوں، زیر آب ہوں تو آبدار لگتی ہیں، میں

نے جواب دیا

مردوں کا کیا ہے۔۔۔عورت جتنی گنہ گار۔۔۔عصیاں کار۔۔۔سیاہ کار اور بدکار ہو، آپ لوگوں کو اچھی ہی لگتی ہے۔۔۔بیگم نے منہ بنا کر کہا۔۔۔میں تو ان کی رنگت کی بات کر رہی ہوں۔۔۔بالکل پھیکا شلغم۔۔۔ان گوریوں کا تو رنگ بھی خراب نہیں ہوتا۔۔۔ہم تو کبھی ہاکس بے چلیں جائیں تو کئی روز تک اپنی صورت پہچان میں نہیں آتی۔۔۔بیگم نے کہا

تم لوگوں کا رنگ کچا ہے ذرا دھوپ پڑے تو کمھلا جاتا ہے۔۔۔ان کا رنگ پکا ہے۔۔۔ تمہیں پتا ہے ان کے ملک میں دھوپ نہیں نکلتی دھوپ کے لئے یہ ترستی ہیں۔

اس کے بعد بیگم نے پول کے باہر بے ترتیب درختوں کے جھنڈ۔۔۔۔پھولوں کی کیاریاں اور گملوں کی آرائش دیکھ کر فرمائش کی کہ منی پلانٹ کی ایک بیل لیکر چلیں گے۔۔۔آپ کو تو پتا ہے کہ مجھے منی پلانٹ بے حد پسند ہے۔۔

اب سمندر اور ساحل پر رونق بڑھ گئی تھی۔۔ہم نے اپنے بائیں طرف مڑ کر ساحل کے کنارے دیکھا وہاں بیچ پر ڈھیروں کشتیاں کھڑی تھیں۔۔۔ہم نے بے اختیار کہا یہ تو Bato Farringhi Beach ہے۔

بیگم نے پوچھا۔۔۔آپ کو کیسے پتہ۔۔۔؟؟

میں نے کہا ہوٹل کا نقشہ جو فولڈر میں لگا ہوا ہے اس میں یہی لکھا ہوا ہے۔۔۔آؤ بیڈروم کی طرف سے دیکھتے ہیں، ہم دونوں نے کافی مگ میز پر رکھے اور بیڈروم میں آئے۔۔۔پردے ہٹا کر شیشے کا دروازہ کھولا اور ہم کشادہ گیلری میں آ گئے۔۔۔۔یہاں سے باتو فرنگی بیچ صاف نظر آ رہا تھا۔۔۔یہاں ایک خلقت جمع تھی سڑک کے کنارے متعدد گاڑیاں پارک تھیں، بچے بڑے ساحل کے قریب پانی میں اچھل کود کر رہے تھے۔۔۔جیسے Seaview ڈیفنس میں۔۔۔مگر اتنی بھیڑ نہ تھی۔۔۔ہاں چھوٹی بڑی کشتیاں، کرایہ پر دستیاب تھیں اور سمندر میں کئی کشتیاں دوڑتی پھر رہی تھیں۔۔۔پھر ہم نے دیکھا کہ پیراشوٹ میں لٹکے ہوئے دو تین آدمی فضا میں جھول رہے تھے یہ Para Sailing کہلاتی ہے۔۔۔یہ منظر ہمارے لئے دلچسپ تھا۔۔۔ہم پہلے تو ہوٹل کے خوبصورت ماحول اور حسن انتظام سے متاثر تھے اب اس کی Location دیکھ کر دل ہی دل میں جاوید حسن کا شکریہ ادا کرتے رہے جنہوں نے AOS کے ذریعہ ہمیں Tour دلوایا تھا۔۔۔ہم نے ادھر ادھر جھانک کر بہت غور کیا کہ یہ پیراشوٹ کہاں سے اڑتے ہیں۔۔۔ہاں ہمارے بالکل

سامنے ہوٹل کی چہار دیواری کے ساتھ یہ فضا سے اڑتے ہوئے آتے اور ساحل پر اتر جاتے کبھی کبھی یوں ہوا کہ ہماری نگاہوں سے یہ ''پیراسیلرز'' غائب ہو جاتے ہمیں دھڑکا لگا رہتا کہ کہاں چلے گئے ۔۔۔کہیں ڈوب تو نہیں گئے ۔۔۔لیکن پھر وہ نظروں کے سامنے آتے اور ساحل پر دوڑتے ہوئے کود جاتے ۔۔۔گھر بیٹھے یعنی ہوٹل میں بیٹھے بیٹھے ہم یہ خوبصورت اور انوکھے مناظر دیکھتے رہے۔۔۔

باتو فرنگی بیچ کے ذرا آگے درختوں کے جھنڈ اور پہاڑ کے دامن میں ایک خوبصورت بستی موجود تھی چھوٹے چھوٹے ایک منزلہ مکانات کی قطاریں ۔۔۔سرخ اینٹوں کی ڈھلوان چھتیں۔۔۔دیکھنے میں بے حد خوبصورت۔۔۔

سورج ڈھل رہا تھا۔۔۔ہمارے بالکل سامنے سمندر سے آسمان جڑا ہوا تھا سورج کو اب اسی افق کی طرف جانا ہے جہاں کچھ دیر بعد شفق رنگ اتر آئیں گے۔۔۔

بیگم نے اس دوران آواز دے کر کہا۔۔۔جلدی سے عصر پڑھ لیں ہمیں نکلنا ہے۔۔

کچھ دیر بعد ہم دونوں ہوٹل سے نکل آئے ۔۔۔مین گیٹ سے الٹے ہاتھ کو باتو فرنگی روڈ کے فٹ پاتھ پر ہم پیدل چلتے رہے۔۔۔چند قدم کے بعد فٹ پاتھ کے کنارے ایک ریلوے انجن معہ ڈبے کے کھڑا تھا۔۔۔اس پر لکھا تھا1913 Barmingham Railway Carriage Wacon Co Ltd انجن/ڈبہ کا نمبر D.V-875

اب اس کو Train Shop کا نام دیا گیا ہے۔۔۔ہم نے جب دیکھا اس وقت وہ انجن دکان بند تھی۔۔۔یوں لگتا ہے کہ اس ریلوے انجن ڈبے کو بطور Heritage محفوظ کیا گیا ہے ہم اس انجن کے پاس سے گذرے اس کے ساتھ ہی یہاں ایک چھوٹا سا پل تھا۔۔۔نیچے سے پانی گذر رہا تھا۔۔۔ہمارے خیال میں یہ نکاسی آب کا نالا تھا۔۔یہ راستہ لنکاوی ہوٹل کے ساتھ والے راستہ کی طرح تھا۔۔۔دائیں بائیں چھوٹی چھوٹی دکانیں۔۔۔ہوٹلیں ۔۔۔اور چند لوگ۔۔۔ایک فرلانگ چلے ہونگے کہ جیسمین ہوٹل پر نظر پڑی ہم آگے بڑھ گئے ۔۔۔چند قدم چلے ہونگے تو اللہ اکبر کی صدا فضا میں گونج اٹھی قریب ہی مسجد تھی۔۔۔بلند مینار سے اذان کی آواز آرہی تھی، چار دن میں پہلی بار اذان کی آواز سنائی دی۔۔۔دل خوش ہو گیا۔۔

بیگم سے کہا۔۔۔یہاں نماز پڑھ لیں۔۔۔

پھر کہنے لگیں۔۔۔آپ تو مسجد میں چلے جائیں گے میں کہاں نماز پڑھونگی۔۔۔ہم باتیں

کرتے کرتے آگے بڑھے تو مسجد کے سامنے کشادہ دالان کے سرے پر۔۔۔چند نمازی سیڑھیوں کے ساتھ بچھی ہوئی تختے والی لمبی سی بینچ پر بیٹھے تھے۔۔۔ پہلی نظر میں تو بنگالی لگے۔۔۔ممکن ہے تامل ہوں۔۔۔انہوں نے دھوتی باندھی ہوئی تھی اور لمبا سا کرتہ پہنا ہوا تھا ۔۔میں نے ان سے پوچھا کیا لیڈیز کے لئے نماز کی جگہ ہے۔۔۔انہوں نے خوش دلی سے ایک راہداری کی طرف اشارہ کیا۔۔۔میں بیگم کے پاس آیا اور انہیں مسجد کے عقبی دروازے تک چھوڑا آیا۔۔۔واپس پلٹا تو باہر بیٹھے ہوئے لوگ چند سیڑھیاں طے کر کے مسجد میں داخل ہو رہے تھے۔۔۔میں بھی مسجد میں چلا گیا۔۔۔دروازہ کے اوپر کتبہ پر نظر پڑی لکھا تھا۔

اَللّٰھمّ افتح لی ابواب رحمتك

مغرب کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کی۔۔۔کم تعداد میں نمازی تھے جبکہ مسجد بہت وسیع اور کشادہ۔۔۔مسجد کے اندرونی حصہ میں سینکڑوں آدمی بیک وقت نماز ادا کر سکتے ہیں جبکہ عقبی حصہ میں دالان۔۔۔صحن اور پلیٹ فارم پر بھی نماز ادا کی جا سکتی ہے۔۔۔اندازہ لگایا یہ رہائشی علاقہ نہیں ہے۔۔۔یہ نمازی آس پاس کی دکانوں اور ہوٹلوں میں کام کرنے والے تھے۔۔۔

مسجد کے باہر دروازہ پر۔۔۔اللہ۔۔۔محمدؐ۔۔۔لکھا ہوا تھا۔۔اندر مسجد کی چاروں دیواروں پر قرآنی آیات، خوبصورت کیلوگرافی کے ساتھ نقش کی گئیں تھیں۔۔۔سامنے کی دیوار پر چاروں قل شریف۔۔۔بڑے لفظوں میں تحریر تھیں۔۔۔جبکہ باقی دیواروں پر سورہ یسین اور سورہ رحمٰن کندہ تھیں۔۔۔مسجد کی چھت کے بیچوں بیچ بڑا اور کشادہ گنبد تھا۔۔۔جیسے مسجد بیت المکرّم یونیورسٹی روڈ گلشن اقبال کراچی کا ہے۔۔۔باہر سے ذرا مختلف نظر آرہا تھا۔۔۔چار چھوٹے ستونوں پر گنبد رکھا ہوا تھا مگر اوپر سے گولائی میں نہیں تھا۔۔شاید ابھی زیرِ تعمیر ہو کیونکہ گنبد اندر سے تو گولائی میں تھا لیکن باہر نکل کر دیکھا تو محسوس ہوا کہ جسے کسی نے آدھا تربوز کاٹ کر رکھ دیا ہے مسجد کے باہر Jameak-Al-Rahman ۔۔۔۔۔۔۔۔۔یعنی یہ رحمٰن مسجد یا تو فرنگی تھی۔۔۔اس کا مینار چوکور۔۔۔سادہ سا مگر اونچا تھا تین مقامات پر چھوٹی چھوٹی گیلریاں ہیں اور مینار کے اوپری حصہ میں چھوٹا گنبد نہیں تھا جیسا کہ ہمارے ملک کی مسجدوں کے میناروں پہ ہوتا ہے۔

نماز پڑھ کر باہر آئے۔۔۔کچھ دیر بعد بیگم بھی آ گئیں۔۔۔انہوں نے بتایا کہ چند خواتین نماز میں شریک تھیں۔۔۔سر تا پیر ملبوس۔۔۔مسجد میں ایک طرف لمبے لمبے چغے لٹکے ہوئے تھے

اس لئے کہ اگر آپ ورکنگ وومن ہیں تو مسجد میں آکر اس لباس کو پہن لیں۔۔۔ یہ ضروری ہے۔۔

راستے میں کئی ہوٹلیں تھیں۔۔۔ فٹ پاتھ کے ساتھ ساتھ۔۔۔ سامنے سے کھلی ہوئیں۔۔۔ بغیر دروازے کے۔۔۔ تاکہ آپ ہوٹل کی میز کرسیاں اور سجاوٹ دیکھ سکیں۔۔۔ ہر ہوٹل کے باہر ایک کھمبے پر یا دیوار پر مینو کارڈ آویزاں تھے۔۔۔ کھانوں کے نام اور ان کی قیمتیں درج تھیں۔۔۔ اس کے علاوہ ہر ہوٹل کے باہر ایک ویٹر ہاتھ میں Menu Card لئے آپ کو دعوت طعام دیتا ہے۔۔۔ مسجد میں آنے سے پہلے ہم نے ہوٹل جیسمین کے علاوہ ''ہوٹل کولمبس'' کو بھی پسند کیا تھا۔۔۔ وہ مسجد کے بہت قریب تھی۔۔۔ بیگم کا اصرار تھا کہ ہم تھوڑا اور آگے چلیں۔۔۔ واپسی میں کھانا کھائیں گے کہ ہمارے پاس وقت بہت ہے۔۔

ہم یونہی پیدل چہل قدمی کرتے رہے۔۔۔ فٹ پاتھ کے کنارے ایک چھوٹا سا مندر تھا۔۔۔ ایک دکان جتنا۔۔۔ اندر دیوار کے ساتھ آتش دان کی شکل کا ایک چوکھٹا سا بنا ہوا تھا۔۔۔ پھول پتیاں پڑی تھیں۔۔۔ ایک دو دیئے جل رہے تھے۔۔۔ اس وقت مندر میں شاید کوئی نہیں تھا۔۔۔ ہم آگے بڑھ گئے۔۔۔ بیگم فٹ پاتھ پر لٹکے ہوئے گارمنٹس دیکھتی رہیں اور بعض چھوٹی چھوٹی دکانوں میں جا کر ونڈو شاپنگ کرتی رہیں، ایک فرلانگ چلنے کے بعد ہم واپس پلٹے۔۔۔

''ہوٹل کولمبس'' کے اندر گئے۔۔۔ صاف ستھرا ہوٹل۔۔۔ درجن بھر میزیں اور ان کے گرد بہت سی کرسیاں۔۔۔ ایک طرف Open kitchen۔۔۔ کاؤنٹر پر گئے۔۔۔ قبول صورت لڑکی کھڑی تھی۔۔۔ شکل سے ملائے معلوم ہوتی تھی۔۔۔ Rates وغیرہ تو ہم نے پڑھ لئے تھے بس ایک شبہ کا ازالہ کرنا تھا۔۔۔ اس لڑکی سے جا کر پوچھا۔۔۔ حلال۔۔۔!! لمحہ بھر کو اس نے جواب دینے کے لئے لفظ تلاش کئے پھر بولی Not sure۔۔۔ کوشش کرتے ہیں لیکن ہوسکتا ہے کہ کوئی ایسی چیز استعمال کی گئی ہو جو آپ کے لئے مناسب نہ ہو۔

اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔۔۔ ہوٹل خالی پڑا تھا۔۔۔ بس ایک میز پر ایک مغربی جوڑا کچھ کھانے میں مصروف تھا۔۔۔ ہوٹل سے باہر ایک ویٹر گاہکوں کو بلا رہا تھا۔۔۔ گاہک آئے۔۔۔ مگر عین اسلامی اصول تجارت کے مطابق اس نے سچ بولا۔۔۔ میں حیران رہ گیا۔۔۔ مسکرا کر شکریہ ادا کیا۔۔۔ چند مہینے پہلے کا واقعہ یاد آیا۔۔۔ T.V کے لئے ریموٹ

کنٹرول کی ضرورت تھی بڑی بحث اور حجت کے بعد ایک ریموٹ خریدا۔۔۔اور بتایا کہ پہلے بھی لیکر گیا تھا اس نے کام نہیں کیا دکاندار نے پوری ذمہ داری سے یقین دلایا کہ یہ آپ ہی کے T.V ماڈل کا ریموٹ ہے۔۔۔

گھر لا کر چلایا۔۔۔۔Cell بھی الٹ پلٹ کر بدلے مگر بیکار۔۔۔۔۔۔ریموٹ کنٹرول سے زیادہ کی قیمت کا ہم کھانا کھاتے۔۔۔صرف ایک لفظ کہنا تھا Yes Halal۔۔!!

دل نے کہا اس قوم نے تیس سال کے مختصر عرصہ میں اس لئے ترقی کی کہ تجارت میں جھوٹ نہیں بولا۔۔۔ہم بھی مسلمان ہیں۔۔۔اسلامی تعلیمات سے زیادہ باخبر ہیں۔مگر۔۔۔؟؟

ہوٹل جیسمین ہی گئے۔۔۔کولمبس ہوٹل کی طرح۔۔۔ہمارے سامنے کچن تھا تندور میں تازہ روٹیاں لگ رہی تھیں۔۔۔کھانا کھا کر ہوٹل واپس آگئے۔۔۔کچھ دیر لابی میں بیٹھے ۔۔۔مسافروں کی آمدورفت جاری تھی۔۔۔ہوٹل بہت خوبصورت عملہ بیحد خدمت گزار ۔۔نہایت پرسکون ماحول۔۔۔نہایت آرام دہ۔۔۔نیچے فلور پر ڈائننگ ہال۔۔۔زیادہ تر سیاح اس وقت کھانے کی میزوں پر بیٹھے تھے۔۔۔یا اپنے کمروں میں تھے۔۔۔لابی اور لاؤنج میں زیادہ رونق نہیں تھی۔۔

ہم اپنے کمرے میں آگئے۔۔۔دیر تک ڈرائنگ روم کے ساتھ والی گیلری پر بچھی کرسیوں پر بیٹھے رہے۔۔۔سمندر کی لہروں کی عجب سرسراتی اور گنگناتی آوازیں، کانوں کو بھلی لگ رہی تھیں۔۔۔ساحل کی طرف آتی ہوئی لہریں، جاتی ہوئی لہروں سے الجھتی ہوئیں گذرتیں تو بل کھاتی لہریں دودھیا جھاگ اڑاتی قریب آتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔۔۔آسمان پر چاند تھا۔۔۔ مگر سمندر کی گود میں کس طرف نہا رہا تھا۔۔۔اس کا پتہ نہیں چل رہا تھا کیونکہ چاند اوپر آسمان پر ابھی نہیں آیا تھا۔۔۔شاید ابھی تک اونچے اونچے ناریل کے درختوں کی شاخوں سے الجھ رہا تھا۔۔۔کمرہ بے حد ٹھنڈا تھا۔۔۔دو کمبل جوڑ کر بستر پر لیٹے۔وقت گذاری کے لئے T.V دیکھتے رہے۔۔۔دیکھتے کیا رہے بس Channel بدلتے رہے۔۔۔

صبح جانے سات بجے کیوں آنکھ کھل گئی۔۔۔۔بہت کوشش کی نیند نہیں آئی۔۔۔بیگم کے کہنے پر بستر سے اٹھے۔۔۔منہ پر چھپا کا مارا اور ناشتہ کرنے چلے گئے۔۔۔ناشتہ کی میز کے گرد مسافر سلسلہء کام و دہن میں مصروف تھے۔۔۔ناشتہ میں اتنی ڈھیر چیزیں کہ انتخاب مشکل ۔۔۔چن چن کر چیزیں پسند کی، سچ بات تو یہ ہے کہ اشیاء خردونوش کو منتخب کرنے میں جتنا وقت

صرف ہوتا ہے اس سے کم وقت ناشتہ کرنے میں لگتا ہے۔۔۔۔۔ہوٹل انتظامیہ کا کمال یہ کہ بغیر کسی شوروغل کے 70-60 ڈشیں ہمہ وقت بھری ہوئیں۔۔۔۔۔کوئی ڈش خالی ہونے کے قریب ہوئی کہ ویٹر نے فوری طور پر بھری ہوئی ڈش سے تبدیل کردی۔۔۔ہوٹل کے ساتھ ہی وہی سوئمنگ پول ہے جسے ہم کل شام نویں منزل سے دیکھ رہے تھے ۔۔۔قریب سے اور بھی خوبصورت محسوس ہوتا تھا۔۔۔اس وقت بالکل خالی تھا۔۔۔۔۔ڈائننگ روم میں سگریٹ پینا ممنوع تھا اس لئے ہم کافی پی کر باہر نکل آئے۔۔۔اور سوئمنگ پول کے ساتھ پڑی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

خاموشی کو توڑتے ہوئے بیگم بولیں۔۔۔پانچ دن ہوگئے۔۔۔بارش نہیں ہوئی، ہم نے تو یہی سنا تھا کہ ہر روز بارش ہوتی ہے۔۔۔چھتری ساتھ لیکر جانا۔۔۔ہم تو چھتری بھی ساتھ لے آئے۔

ٹھیک کہتی ہو، واقعی ہمارے سامنے اب تک بارش نہیں ہوئی۔۔۔یاد ہے جیٹی پر جو ڈرائیور ہمیں لینے آیا تھا کہہ رہا تھا کہ راستے میں بہت بارش ہورہی تھی۔۔۔

وہ تو ٹھیک ہے لیکن ہم نے تو آتے ہوئے سڑک یا اس کے آس پاس بارش کے آثار نہیں دیکھے۔۔۔۔

تم بھی کمال کرتی ہو۔۔۔یہ کراچی یا لاہور تھوڑا ہی ہے۔۔۔یہاں تو بارش ہوئی اور چند منٹ بعد بارش کا پانی غائب۔۔یہاں نکاسی ءآب کا نظام کمال کا ہے۔۔۔ہمارے یہاں مصطفےٰ کمال نے کام تو بہت کیا ہے اس سال بارش ہوگی تو پتا چلے گا کہ سڑکوں پر پانی کتنی دیر ٹھہرتا ہے۔۔آپ بارش کو محسوس نہیں کرتیں۔۔۔میں نے بیگم سے پوچھا۔

کیا مطلب۔۔۔۔۔!کہاں ہے بارش؟؟

سامنے درختوں کو دیکھو۔۔۔پودوں کو دیکھو، دیوار پر چڑھی بیلوں کو دیکھو۔۔۔ان کی تازگی ۔۔پتوں کی شادابی۔۔اور لچکتی شاخوں کی ہریالی اور ان پر جھومتے پھولوں کے کھلتے رنگوں میں کیا بارش نظر نہیں آتی۔۔۔کراچی بھی اب بہت گرین ہے ہر طرف درخت، پودے اور بیلیں ہیں مگر مٹیالے۔۔۔گرد آلود اور بے رنگ۔۔۔۔۔۔۔۔اس لئے کہ بارش مہینوں نہیں ہوتی۔۔۔میرا تو خیال ہے کہ ان درختوں نے رات بھر غسل کیا ہے۔۔۔یقیناً رات بارش ہوئی ہے۔

آپ ٹھیک کہتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اتنی ہریالی۔۔۔۔اتنی تازگی۔۔۔۔۔بارش

کے بغیر کیسے ممکن ہے۔۔۔آئیں سامنے ساحل تک چلتے ہیں۔۔۔اس طرف شاید باہر جانے کا راستہ ہو۔

ہم سوئمنگ پول کے گرد راہداریوں پر چہل قدمی کرتے ہوئے درختوں کے جھنڈ میں چلے آئے سورج جو روشن تھا اب ان درختوں سے جھانک رہا تھا۔۔۔کچی پگڈنڈی سے گذر کر ہم آگے بڑھے تو ایک چھوٹا سا دروازہ کھلا ہوا تھا۔۔۔دو تین مالی پودوں کی صفائی کر رہے تھے۔۔۔ہم دروازہ سے گذر کر سمندر کی ریت پر آ گئے۔۔۔۔۔۔۔۔دس بیس قدم دور سمندر کی لہریں باتو فرنگی کے ساحل کو بوسہ دے کر واپس پلٹ رہی تھیں۔۔۔۔۔۔اور یہ ایک ناختم ہونے والا سلسلہ تھا۔۔۔ایک لہر جاتی تھی ایک آتی تھی۔۔۔۔۔۔۔ہمیں دیکھ کر دور کھڑا آدمی اپنے گھوڑے کی لگام پکڑ کر ہمارے قریب آیا۔۔۔اس نے گھڑ سواری کے لئے پوچھا۔۔۔ہم نے معذرت کر لی۔۔۔اول تو ناشتہ کیا تھا۔۔۔دوئم گھوڑا ہم سے بھی زیادہ لاغر اور مریل تھا۔۔۔ سوئم بیگم ایسے کاموں کے لئے کبھی تیار نہیں ہوتیں۔۔۔چہارم یہ کہ چالیس سال سے ہم گھوڑے پر نہیں بیٹھے اس لئے اب عادت نہیں رہی۔۔۔آپ سوچتے ہونگے کہ چالیس سال پہلے ہم گھڑ سواری کرتے تھے۔۔۔آپ نے صحیح سوچا۔۔۔چالیس سال پہلے جب ہم فیملی پلاننگ افسر تھے اور ٹنڈو جام میں ہماری Posting تھی اس زمانے میں بہت سے قصبوں اور گوٹھوں میں جانے کے لئے ہم سواری کے لئے گھوڑا استعمال کرتے تھے۔۔۔اونٹ پر بھی گئے۔۔۔مگر اب یہ نصف صدی سے کچھ کم کا قصہ ہے۔۔۔صبح کے وقت ہمارے علاوہ دو تین اور بھی سیاح تھے۔۔۔جو ہماری طرح تماشبین تھے۔۔۔لیکن الٹے ہاتھ کو چند گز کے فاصلے پر خاصے لوگ موجود تھے۔۔۔کچھ ساحل کے قریب سمندر میں نہا رہے تھے اور لہروں کو قریب آتا دیکھ کر اچھل رہے تھے۔۔۔البتہ بہت سی چھوٹی چھوٹی کشتیاں ساحل پر کھڑی تھیں اور بعض لوگ انہیں کرائے پر لیکر سمندر پر مٹرگشت کر رہے تھے۔۔۔

ساحل پر کھڑے کھڑے دھوپ تیز ہوگئی۔۔۔بنیان بدن پر چپکنے لگا۔۔۔ہمیں بھی ساحل کو بس قریب سے دیکھنا تھا۔۔۔شوق پورا ہوگیا۔۔۔۔اس لئے واپس لوٹ آئے ۔۔سوئمنگ پول کے قریب پہونچے تو پتہ چلا کہ چابی (Key card) تو کمرہ میں ہی رہ گئی ۔۔۔بیگم تو گھبرا گئیں۔۔۔میں نے اطمینان سے جواب دیا کہ آپ پریشان نہ ہوں۔۔۔ابھی استقبالیہ کاؤنٹر پر چلتے ہیں۔۔۔Master key انتظامیہ کے پاس ہوتی ہے۔۔۔

ہم واپس لابی میں آئے ۔۔۔کاؤنٹر پر جا کر اپنا مسئلہ بیان کیا۔۔۔خوش اخلاق نوجوان تھا۔۔۔پوچھا کمرہ نمبر

Nine Eleven ۔۔۔۔۔۔۔میں مسکرایا اور مزید کہا ۔۔۔ Number is not so good

وہ لمحہ بھر کو رکا۔۔۔پھر ہنس دیا۔OK-but room is good

میں نے اثبات میں جواب دیا۔۔۔اس دوران اس نے کسی کو فون پر مقامی زبان میں کچھ کہا اس کے بعد مجھ سے مخاطب ہوا۔

آپ کمرے تک پہنچے۔۔۔کمرہ کھل جائے گا۔۔۔کوئی اور خدمت

بہت شکریہ۔۔۔میں بیگم کے پاس آیا۔۔۔لفٹ تیز مگر بے حد سبک رفتار لمحوں میں ہم نویں منزل تک پہنچ گئے۔۔۔۔راہداری طے کر کے ہم کمرے کے قریب گئے تو ایک پورٹر ہمارا منتظر تھا

اس نے کارڈ سے کمرہ کھولا۔۔۔۔۔۔۔ہم اپنے کمرے میں آئے تو ہر چیز سلیقہ سے اپنی اپنی جگہ رکھی تھی ۔۔۔باتھ روم صاف ۔۔۔۔ نئے اجلے تولیے۔۔۔۔ باتھ روم کا فرش خشک۔۔۔باقی چیزیں قرینے سے رکھی ہوئی تھیں۔۔۔میں ہر بار نئے اجلے تولیوں میں لگے اسٹیکر کو ضرور دیکھتا۔۔۔اس امید پر کہ شاید مہتاب الدین چاؤلہ کی فیکٹری کا بنا ہو۔۔۔مگر مایوسی ہوئی۔۔۔Towels بنانے والے ہمارے بہت سے دوست جانے کن ملکوں میں اپنی مصنوعات export کرتے ہیں

یہ لوگ کیا تمام دن کمروں کی صفائی ہی کرتے رہتے ہیں، ابھی تو ہمیں شاور لینا ہے، کپڑوں پر استری کرنا ہے۔۔۔کمرہ تو پھر بے ترتیب ہو جائے گا۔۔۔

کوئی بات نہیں جب ہم واپس لوٹیں گے تو کمرہ پھر صاف ۔۔۔۔ یہ قوم بڑی Service Oriented ہے تب ہی تو دنیا بھر سے لوگ یہاں آتے ہیں۔۔۔معلوم ہے، اس ملک کی جتنی آبادی ہے اتنی ہی تعداد میں سیاح ہر سال یہاں آتے ہیں ہم واپس کراچی پہنچ کر Bayview Beach Hotel کی اپنے دوستوں سے تعریف ہی کریں گے۔۔۔دنیا میں سب سے بڑی تشہیری مہم by mouth ہوتی ہے۔۔۔

اچھا جناب آپ نے اگر کپڑے استری کرانے ہیں تو دے دیں بیگم نے پوچھا۔۔

نہیں، میں تو کل والے کپڑے ہی پہنونگا یہاں ہمیں کون دیکھ رہا ہے۔۔۔ ویسے بھی جینز بہت آرام دہ ہے۔۔۔ یہ کہہ کر میں شاور لینے چلا گیا۔۔

رات ہی پروگرام بنالیا تھا کہ ہم بس کے ذریعہ سٹی سینٹر جائیں گے۔۔۔ ہوٹل کے سامنے سے بس ملتی ہے۔۔۔ اور سیدھی کومتار ٹاور پہنچا دیتی ہے۔۔ محمد سے ہم نے یہ معلومات پہلے ہی حاصل کرلیں تھیں۔۔

بس کے انتظار میں ہم اسٹاپ پر کھڑے رہے تقریباً پندرہ منٹ بعد ایک بس آئی۔۔ ہر مسافر چڑھتے وقت بس کا کرایہ ڈرائیور کے قریب رکھے ایک ڈبہ میں ڈال دیتا تھا۔۔۔ بس سبک روی سے سفر طے کرتی رہی راستہ بہت خوبصورت ہمارے بائیں ہاتھ سمندر اور دائیں ہاتھ پستی سے بلندی کی طرف اٹھتی ہوئیں، درختوں سے ڈھکی پہاڑیاں۔۔۔ ذرا آگے بڑھے تو سمندر بائیں ہاتھ کو درختوں کی اوٹ میں دور چلا گیا۔۔۔ مگر ہمارے ساتھ ساتھ سفر کرتا رہا۔۔۔ ایک ہی سڑک پر دورویہ ٹریفک چل رہا تھا۔۔۔ بہت زیادہ گاڑیاں سڑک پر نہیں تھیں پھر یوں ہوا کہ ہم بلندی کی طرف سفر کرتے رہے کچھ دیر بعد سڑک نشیب کی طرف اترنے لگی۔۔ پھر سڑک کشادہ ہوگئی۔۔، شاہراہ کے دونوں جانب درختوں کی قطاریں۔۔۔ مری کے راستے کی طرح ۔۔۔ لیکن مری کے راستے میں نشیب و فراز زیادہ ہیں جبکہ سڑک بھی سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔۔۔ لیکن یہاں سڑک تقریباً سیدھی تھی۔۔ اب سمندر ہم سے دور ہو گیا۔۔۔ اور سڑک کے کنارے عمارتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔۔۔ 20 منٹ کے بعد ہم شہر کے بارونق علاقہ میں داخل ہوگئے جہاں دونوں طرف بلند و بالا عمارتیں ایک دوسرے سے جڑی ہوئیں آسمان سے باتیں کررہی تھیں۔۔۔ یہ سٹی سینٹر کہلاتا ہے یعنی ڈاؤن ٹاؤن۔۔۔ بس، ایک چورنگی سے گذر کر الٹے ہاتھ کو مڑ گئی۔۔۔ اور ایک اسٹاپ پر جا کر کھڑی ہوگئی یہ کومتار کا بس اسٹاپ کہلاتا ہے۔۔۔ ہم بس سے اترے، ہمارے بالکل سامنے پینانگ کی سب سے بلند عمارت ''کومتار ٹاور'' موجود تھی۔۔۔ عمارت اتنی بلند کہ نگاہوں میں سماتی نہیں۔۔۔ نیچے سے اوپر تک پوری عمارت کو دیکھنے کے لئے کہ گردن دھیمے دھیمے اٹھائی پڑتی ہے۔۔۔ تب اس کی آخری منزل نظر آتی ہے۔۔۔ پہلے تو آٹھ دس منزلہ عمارت کو دیکھتے ہوئے ٹوپی گر جاتی تھی 65 منزلہ عمارت کو دیکھتے وقت گردن دکھنے لگتی ہے

☆☆☆

کومتار ٹاور

کومتار ٹاور۔۔۔!!

پینانگ کی پہچان۔۔۔۔۔!!

پینانگ کی شناخت۔۔۔۔!!!

پینانگ کا اعزاز۔۔۔۔۔۔!!!اس کا ایک دروازہ Macalisler Rood پر ہے جبکہ دوسرا عقبی حصہ Jalan Maxwell پر ہے۔۔۔

پینانگ کی ہر سونیر شاپ پر ''کومتار ٹاور'' کا ماڈل مختلف انداز میں بیچا جاتا ہے۔۔۔پکچر کارڈ پر۔۔۔ٹی شرٹ پر۔۔۔کی چین کی صورت۔۔۔۔چھوٹے بڑے درمیانی سائز کے ماڈل کے روپ میں اور نجانے کس کس شکل میں کومتار ٹاور کو فروخت کیا جاتا ہے اور سیاح کسی نا کسی صورت ''کومتار ٹاور'' کو یادگار کے طور پر اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔۔۔۔بس روانہ ہوگئی ہم زیبرا کراسنگ سے سڑک پار کر کے کومتار کے دامن میں پہونچ گئے۔۔۔۔اتنی اونچی اور بلند عمارت مگر اس کا بیرونی چہرہ متاثر نہ کر سکا نیچے کی منزل میں چند دکانیں۔۔۔۔فرسٹ فلور پر جانے کے لئے چند سیڑھیاں۔۔۔فٹ پاتھ سے عمارت کے بیرونی دروازہ تک بہت کم فاصلہ، اگر ہنگامی حالت'' میں چار پانچ منزل سے لوگ نیچے اتر آئیں تو انہیں عمارت کے دامن میں کھڑے ہونے کی جگہ میسر نہ ہوگی۔۔۔۔

بس سے اترتے ہوئے ہم نے ظہر کی اذان سنی تھی۔۔۔۔۔کومتار ٹاور کی پہلی منزل پر پہنچے ۔۔۔۔دائیں بائیں۔۔۔کئی قطاروں میں دور تک کشادہ دکانیں۔۔۔۔ہم نے بیگم سے کہا موقع غنیمت ہے آپ ان دکانوں کا چکر لگائیں میں نماز پڑھ لوں۔۔۔بیگم کو خبر ہے کہ shopping میں میری کوئی دلچسپی نہیں۔۔۔۔۔اس لئے کہنے لگی۔۔۔۔میں آپ کو سیکنڈ فلور پر انہی سیڑھیوں کے قریب مل جاؤنگی۔۔

میں الٹے پیر واپس نیچے اترا۔۔۔۔۔سڑک پار کرنے کے لئے انتظار کرنا پڑا اسکے بعد مسجد کا پتہ پوچھا۔۔۔۔ہم نے پہلے بتایا تھا کہ چورنگی سے الٹے ہاتھ کو مڑ کر بس ٹھہر گئی تھی دراصل

اسی راستے میں جاتے ہوئے چورنگی کے داہنے ہاتھ کو ذرا فاصلہ پر ایک مسجد تھی ہم تیز تیز قدموں سے مسجد پہنچے اور۔۔۔ وضو خانے کی تلاش شروع کی تو امام سلام پھیر رہے تھے'' حاجی عبدالوہاب مسجد'' چھوٹی مسجد تھی مگر نمازی خاصے تھے۔۔۔ مسجد سے باہر آیا تو مسجد کے سامنے کھانے کی ہوٹلوں پر نظر پڑی۔۔۔ دراصل وہ ہوٹلیں نہیں بلکہ Take away قسم کی دکانیں تھیں یعنی آپ کھانے کی چیزیں خرید سکتے ہیں۔۔۔ ویسے اندر چند لوگوں کی نشستوں کا انتظام بھی تھا۔۔۔ ایسی ہوٹلیں کراچی میں عام ہیں۔۔۔ ہم نے جس دکان کا ذکر کیا اس پر جلی حروف میں ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' لکھا ہوا تھا۔

چورنگی پر ٹریفک سبک روی کے ساتھ رواں دواں تھا۔۔۔ گاڑیوں کا شور وغل ۔۔۔ سماعت شل کر دینے والے ہارن۔۔۔ دھواں چھوڑتیں بسیں یا رکشہ یہاں ناپید تھے۔۔۔ ہر چیز اور ہر فرد اطمینان اور سکون میں تھا۔۔۔ نمائشی عجلت کہیں نظر نہیں آئی ۔۔۔ ہم اسی راستے سے واپس آئے ۔۔۔ سڑک پار کرنے سے پہلے ذرا آگے بڑھ گئے تو کومتار ٹاور کی سیڑھیوں کے بالمقابل یعنی ہمارے بہت قریب ایک خوبصورت چینی ٹیمپل۔۔۔ پوری عمارت لگتا تھا سونے سے پوتی گئی ہے۔۔۔ روایتی پگوڈا۔۔۔ بیل بوٹے۔۔۔ نقش ونگار۔۔۔ بیحد دلکش اور نظر فریب۔۔۔ لیکن عمارت کے باہر ایک سادہ سا راستہ تھا اور ایک طرف کھلے پلاٹ پر پارکنگ کی جگہ مخصوص تھی۔۔۔ یہاں سات آٹھ گاڑیاں کھڑی تھیں۔۔۔ عبادت گاہ اس وقت بند تھی ہم نے بند دروازے کی جالیوں سے جھانک کر دیکھا۔۔۔ دروازہ پر دستک دی۔۔۔ لیکن شاید کوئی اندر موجود نہ تھا۔۔۔ عمارت بیحد بڑی اور کشادہ نہ تھی لیکن متوجہ کر دینے والا حسن رکھتی تھیں۔۔۔ تین کم عمر لڑکیاں ہاتھ میں پینا نگ کا نقشہ لئے ہماری طرح اس عمارت کو دیکھنا چاہتی تھیں۔۔۔ انہوں نے ہم سے عمارت کے بارے میں۔۔۔ اس کے اندر جانے کے راستے کے بارے میں پوچھا ۔۔۔ ہمیں بہت اچھا لگا کم از کم اس لمحہء موجود میں کوئی ہم سے بھی زیادہ بے خبر تھا۔۔۔ ہم نے مایوسی سے انکار کیا۔۔۔ وہ بھی ادھر ادھر جھانک کر آگے بڑھ گئیں۔۔۔ اس وقت خواہش ہوئی ۔۔۔ کاش ہمیں اس ٹیمپل کے بارے میں کچھ معلومات ہوتیں تو ہم کچھ دیر ان سے باتیں کر لیتے، کم از کم ان کا نام ہی پوچھ لیتے پھر اس مختصر سی ملاقات کو اپنے سفر نامے کے صفحات پر شائع کرتے۔۔۔ رومانوی انداز میں داستان بیان کرتے۔۔ ایک موقع ہاتھ آیا تھا مگر اپنی کم علمی کے سبب گنوا دیا۔۔۔ ہم نے اپنے پڑھنے والوں کو بتاتے کہ ہم بھی مقبول سیاح ہیں ہر گلی کے موڑ اور

ہوٹل کی راہداری میں ہمیں بھی بار بار کوئی مہ جبیں، کوئی چاند چہرہ، ۔۔۔کوئی حسینہ اور کوئی نازنین مل جاتی تھی مگر صرف بیگم کے خوف سے ہم نے ان کی دعوت ۔۔۔قبول نہیں کی ۔۔۔ہم ''عبادت گاہ'' سے مایوس لوٹے ۔۔۔۔

باہر نکل کر آس پاس گذرتے ہوئے لوگوں سے اس ٹیمپل کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔۔۔ باہر ایک ٹین کے بورڈ پر اتنا لکھا تھا Ongsi Thyeauaane Tong اس کا تلفظ کیا ہے۔۔۔اس کا مطلب کیا ہے؟۔۔۔۔۔یہ ہمیں معلوم نہیں کہ ہم جو دیکھیں گے جو سنیں گے اور جو سمجھیں گے وہ سچ سچ لکھیں گے ۔۔۔۔

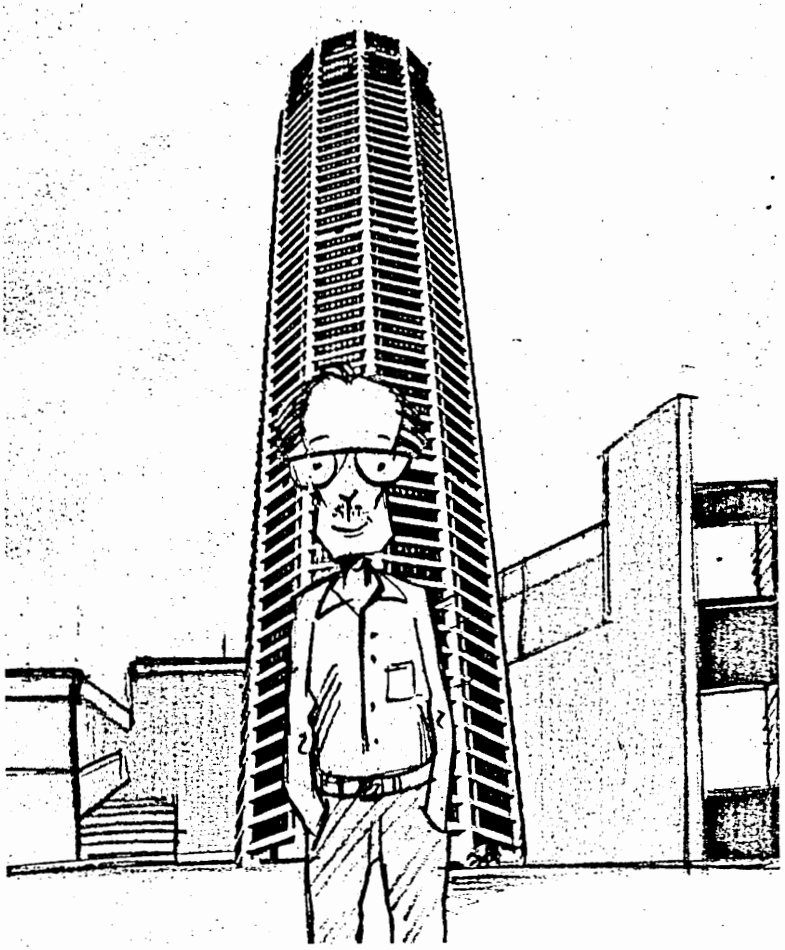

سڑک پار کر کے ہم پھر کومتار ٹاور کے قدموں میں پہونچ گئے۔۔۔۔دوسری منزل پر پہونچ کر۔۔۔ہم نے بیگم کو ہر عورت کے چہرے پر تلاش کرنے کی کوشش کی، اس کے نتیجہ میں بعض خواتین مسکرائیں۔۔۔اور دو ایک نے ہیلو بھی کہا۔۔۔لیکن اکثر خواتین نے منہ پھیر لیا۔۔۔آخر الذکر زیادہ حقیقت پسند تھیں اس لئے ہمیں برا نہیں لگا۔۔۔اس تاک جھانک میں بیگم سامنے آ گئیں۔۔۔بیگم یہاں آ کر بہت خوش تھیں۔۔۔۔۔کچھ چیزیں انہوں نے خرید بھی لی تھیں۔۔۔معلومات کرنے پر پتہ چلا کہ "کومتار" کی چار منزلوں میں شاپنگ سینٹرز ہیں۔ یہاں پر ہر تیسری چوتھی دکان کافی شاپ، Fast foods۔۔۔ہوٹل یا کولڈ ڈرنک شاپ تھی۔۔۔بعض بڑے بڑے ریستوران بھی تھے جن میں سوسوا سو آدمی بیٹھ کر اپنی پسند کے کھانے کھا سکتے تھے۔۔۔ہم نے بیگم سے کہا کافی پیو گی۔۔۔کہنے لگیں آپ کہیں آرام سے بیٹھ کر کافی پئیں میں اوپر ہو آؤں۔۔۔جواب میں ہم نے کہا کہ میں 60 ویں منزل تک ہو کر آتا ہوں۔۔۔وہاں سے سارا شہر نظر آئے گا۔۔۔

ضرور جائیں۔۔۔مگر آپ کو کیسے پتہ کہ 60 ویں منزل تک lift جاتی ہے۔۔۔۔

ہم نے بتایا کہ فرسٹ فلور پر ایک بورڈ پر لکھا ہے اس کی تفصیل کسی سے پوچھ لیں گے۔۔۔

بیگم نے کہا یہ ٹھیک ہے، آپ میرے ساتھ بور ہونگے اس سے بہتر ہے کہ آپ اوپر جا کر شہر کا نظارہ کریں۔۔۔ اور ہاں آدھ گھنٹہ بعد آپ فورتھ فلور پر انہی سیڑھیوں کے قریب آ جائیں۔۔۔۔ میں نے دو تین دکان داروں سے معلوم کیا اور ایک دفتر نما حصہ میں داخل ہوا۔۔۔وہاں لفٹ کے باہر ایک باوردی Lift operator کھڑا تھا۔۔۔میں نے ان سے اپنا مدعا بیان کیا۔۔۔کہنے لگا۔۔۔پندرہ رنگٹ اوپر جانے کے ہونگے۔۔۔پندرہ رنگٹ کو میں نے پاکستانی روپے میں Convert کیا تو تقریباً 300 روپے۔ بہت ناگوار گذرا۔۔۔کس قدر کمرشل لوگ ہیں اور سیاحوں سے نت نئے طریقوں سے زر مبادلہ کماتے ہیں۔۔۔پھر میں نے سوچا کہ چلو ایک ہی بار اوپر سے پورا شہر پیناانگ دیکھ لیں گے۔۔۔میں آمادہ ہو گیا۔۔۔لفٹ مین نے مجھے اندر بلایا اور 60 کے بٹن پر ہاتھ لگایا۔۔۔ہلکا سا جھٹکا۔۔۔محسوس ہوا کہ میں اوپر کی طرف جا رہا ہوں، لمحوں بعد لفٹ رک گئی۔۔۔وہ مجھے اپنے ساتھ لیکر ایک کاؤنٹر پر آیا جہاں ایک عمر رسیدہ چینی خاتون کھڑی تھیں۔۔۔لفٹ سے نکلتے ہی راہداری پر بہت سے ہینگرز پر ملبوسات ٹنگے ہوئے تھے۔۔۔ایک اسٹینڈ پر متعدد پکچر کارڈ لگے ہوئے تھے۔۔۔عمر رسیدہ خاتون نے کہا پندرہ رنگٹ۔۔۔ہم نے رقم ادا کی۔۔۔

کہنے لگیں ۔۔۔آپ کو ہم کوفی کا مگ اور دو پکچر کارڈز مفت دیں گے۔۔۔ ہم خوش ہو گئے۔۔۔اس کے بعد انہوں نے عقبی دروازہ کی طرف اشارہ کیا۔۔۔ہم دروازہ کھول کر اندر گئے تو وسیع اور کشادہ گیلری۔۔۔۔ریلنگ کی جگہ شیشوں کی دیواریں۔۔۔۔آگے بڑھے سامنے سمندر اور اس کے دامن میں سینکڑوں عمارتیں۔۔۔

یہ ایک گیلری ہے۔۔۔جہاں بے ترتیب ڈیکوریشن کا سامان پڑا تھا۔کارپیٹ لپٹے ہوئے تھے اور کرسیاں ایک دوسرے کی گود میں بیٹھیں چھت کو چھو رہی تھیں۔۔۔۔اسٹیج کا تخت بے لباس تھا۔۔۔اور Sound system کے کچھ آلات دیوار کیساتھ رکھے ہوئے تھے جبکہ کھانے کی بڑی بڑی ڈشیں لڑھکتی ہوئیں بے ترتیب پڑی تھیں۔۔۔۔رات شاید کوئی تقریب تھی

'' آنکھوں میں اڑ رہی تھی لٹی محفلوں کی دھول''

آگے ڈھائی فٹ کی دیوار تھی اور اس پر چھت تک شیشے لگے ہوئے تھے۔۔۔۔۔اب پورا شہر میرے سامنے تھا۔۔۔پہلے تو میں نے نیچے جھانک کر دیکھا۔۔۔اور لاشعوری طور پر اپنی عینک پر ہاتھ رکھا۔۔ نیچے، کاریں، بسیں۔۔۔۔ بالکل Dinkies کی طرح دکھائی دیتی تھی، کسی چھت پر چڑھ کر میں پہلی بار نیچے کا ٹھہرا ہوا منظر دیکھ رہا تھا یوں تو متعدد بار ہیلی کوپٹر اور Cessana طیارہ سے گورنر سندھ کے ساتھ سفر کرنے کے مواقع ملے تھے۔۔۔نیچے کے مناظر دیکھے تھے۔۔۔مگر اس وقت ہم فضا میں اڑ رہے تھے۔۔یہاں میں اپنی جگہ کھڑا تھا۔۔۔اور منظر بھی مجھے ٹھہرا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔۔

میرے سامنے پینانگ شہر کھلی ہتھیلی پر رکھے کھلونے کی طرح تھا۔

سیدھے ہاتھ کو تو سمندر اور اس کے کنارے کنارے بلند و بالا عمارتیں، نظر اٹھا کر دیکھا تو سامنے پہاڑیاں اور ان کے دامن میں سرخ چھتوں کے چھوٹے چھوٹے قرینے اور ترتیب سے بنے ہوئے مکانات۔۔۔۔یہ رہائشی بستیاں تھیں۔۔۔پینانگ سمندر کے کنارے کنارے پہاڑ تک ایک خشک اور سکڑے ہوئے پتے کی طرح ہے۔۔۔سینکڑوں عمارتوں میں سے صرف ایک عمارت پر جلی حروف سے ''گرانڈ کانٹی نینٹل ہوٹل'' لکھا نظر آ رہا تھا۔۔۔حالانکہ سمندر کے کنارے کنارے متعدد عمارتیں ہیں

ہم ٹہلتے ہوئے دوسرے حصے کی طرف چلے گئے۔۔یہاں بھی عمارتیں اور رہائشی بستیاں ہیں اس طرف سے ہم نے نظر اٹھا دیکھا تو سمندر کے اس پار ایک اور جزیرے پر شہر آباد ہے۔۔۔

جانے یہ پینانگ کا حصہ ہے یا کوئی علیحدہ شہر ہے۔۔۔لیکن گمان غالب ہے کہ اس دوسرے شہر میں کشتی، فیری یا جہاز ہی سے جایا جاسکتا ہے۔۔۔کسی نے بتایا تھا کہ پینانگ جانے کے لئے سمندر پر ایک طویل پل بنایا گیا ہے۔۔لیکن دور سے دیکھنے کے سبب ہمیں اس جزیرے تک جانے کے لئے کوئی پل یا سڑک نظر نہیں آئی۔۔۔گیلری کی اس سمت ٹیبل ٹینس موجود تھی، اب ہم چلتے ہوئے گیلری کی تیسری سمت بھی جا پہونچے۔۔۔یہ پینانگ کا تیسرا حصہ تھا۔۔۔یہاں بھی وہی مناظر تھے۔یعنی ہر طرف سمندر اور بیچ میں ایک لمبوترا جزیرہ۔۔۔اب ہمیں خیال آیا کہ کافی پینی چاہیئے۔۔ہم واپس لوٹے دروازہ کھول کر کاؤنٹر پر گئے اور بوڑھی خاتون کو ان کا وعدہ یاد دلایا۔۔انہوں نے اسٹول پر بیٹھے بیٹھے بتایا کہ الٹے ہاتھ کو سیڑھیاں اتر جائیں وہاں کافی کی کیتلی رکھی ہے۔۔۔ہم دوبارہ گیلری میں آگئے۔۔۔چند قدم کے فاصلے پر سیڑھیاں اتر رہی تھیں یہ غالباً ۵۹ ویں منزل تھی۔۔۔یہاں ایک ریستوران تھا۔۔۔میزوں کے گرد کرسیاں قرینے سے سجی ہوئی تھیں اور ایک طرف میز پر جوس کا اوندھا Pot رکھا ہوا تھا اور اس کے ساتھ کافی کی کیتلی۔۔۔ہم نے سوچا کہ اس وقت ہم تنہا ان کے مہمان ہیں۔۔جوس اگر یوں ہی رکھا رہا تو شام تک خراب ہو جائے گا اس لئے کیوں نہ ہم پہلے جوس پیئں۔۔ہم نے ایک پیپر کپ اٹھایا، پاکستان میں استعمال ہونے والے Paper cup کے مقابلے میں کافی چھوٹا تھا۔۔۔دو تین گھونٹ سے زیادہ اورنج جوس اس میں نہیں آسکتا تھا ہم نے صرف ایک کپ جوس پینے پر ہی اکتفا کیا حالانکہ پندرہ رنگٹ کے بدلے میں تو کئی گلاس پی سکتے تھے اس کے بعد دوسرے پیپر کپ میں ہم نے کافی انڈیلی۔۔۔اور واپس اوپر چڑھ کر گیلری کے قریب آ کھڑے ہوئے یہاں بھی بیٹھنے کے لئے کرسیاں تھیں۔۔ہم نے کسی کرسی کو زحمت نہ دی بلکہ کھڑے ہو کر کافی پینے لگے بہت گرم اور اچھی کافی تھی۔۔۔۔۔اب تک دو تین سیاح اور آچکے تھے۔۔۔یہاں تین دوربین نصب تھیں۔۔۔آدھے رنگٹ کا سکہ ڈال کر ہم دوربین استعمال کر سکتے تھے۔۔۔ہم نے سکہ ڈال کر دوربین پر آنکھیں لگائیں یہ دوربین خراب تھی۔۔۔دوسری دوربین کے قریب گئے سکہ ڈالا۔۔۔یہ مشین ٹھیک کام کر رہی تھی۔۔۔۔ہم نے ایک ایک عمارت کو فوکس کر کے دیکھا۔۔۔پہاڑ کے دامن میں رہائشی بستیوں کی گلیوں میں جھانکے، کوشش کی کہ کسی گھر کی کھڑکی تک رسائی ہو جائے۔۔۔مگر کھڑکیاں بند تھیں۔۔۔یا ان کے اندر پردے لٹکے ہوئے تھے۔۔۔زیادہ کوشش نہیں کی کسی کے گھر تاک جھانک کرنا شریفوں کا شیوہ نہیں۔۔۔!!

ہم چاہتے تھے کہ پینانگ شہر کو جی بھر کے دیکھ لیں۔۔ہم نے کئی لوگوں سے کومتار ٹاور کی اونچائی معلوم کی مگر کسی نے راہنمائی نہیں کی بعد میں ہم نے بلند عمارتوں کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔۔۔ہم اس موقع پر اپنے قارئین کو دنیا کے بلند ٹاورز اور عمارتوں کی اونچائی بتاتے چلیں۔۔۔

1. Burj Khalifa Dubai	2010	828 Meters
2. Willis Tower Chicago, USA	1974	527 Meters
3. Taipae 101 Taiwan	201	508 Meters
4. World Financial Tower Shinghai China	2008	492 Meters
5. International Commerce Center Hongkong China	2010	484 Meters
6. Patroman Tower, Kuala Lampur China	1998	451.9 Meters
7. Nanjung Greenland Financial Complex China	2010	450 Meters
8. Trump Internatinoal Hotel & Tower, Chicago Il, USA	2009	423 Meters
9. Jin Mao Tower, Shinghai, China	1998	420 Meters

ہمیں یقین ہے کہ یہ فہرست مکمل نہیں۔کیونکہ نیویارک کا ٹون ٹاور اور ایمپائر بلڈنگ جو ہم نے دیکھی ہیں وہ بھی بہت بلند ہیں،''ٹون ٹاور نیویارک'' اب قصہ پارینہ ہے لیکن اس کے اثرات دنیا بھر کے مسلمانوں کے چہروں پر دیکھے جاسکتے ہیں،اس موضوع پر سوچ کر ہم غمزدہ ہوگئے اس لئے اس کا خیال ذہن سے نکال دیا، ہاں کوالالمپور کے رہنے والے اپنی بلڈنگ Twin Tower کو دنیا کی بلند ترین عمارت خیال کرتے ہیں یہ درست نہیں اور اس کی بلندی 452 میٹر ہے۔۔دنیا کی بلند ترین عمارت اور دنیا کا بلند ترین structure میں فرق ہے اس کے علاوہ بعض عمارتوں کی پیائش ground floor سے کی گئی ہے جبکہ بعض عمارتوں کی پیائش

ان کی بنیادوں سے کی گئی اس کی مثال Taipai بلڈنگ تائیوان کی ہے۔۔جس کی 6 منزلیں زیر زمین ہیں، مذکورہ تمام عمارتوں کی اہمیت اپنی جگہ لیکن اب دنیا کی بلند ترین عمارت ''برج خلیفہ'' دبئی ہے یہ عمارت زیر تعمیر ہے اور اب تک 780 میٹر بلند تعمیر ہ چکی۔۔۔۔لیکن چونکہ تعمیراتی کام جاری ہے اس لئے '' برج '' دبئی خلیفہ کا شمار بین الاقوامی ریکارڈ میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔۔۔خیال رہے کہ دبئی ہی میں ایک اور عمارت ''البرج'' کے نام سے مشہور تعمیراتی کمپنی '' EMAAR '' تعمیر کرنے کا منصوبہ بنا رہی ہے۔۔۔ہماری معلومات کے مطابق ''البرج'' دبئی 1400 میٹر بلند ہوگی۔۔

کافی دیر ہو چکی تھی۔۔۔اس لئے ہم نے تحفہ میں دو پکچر کارڈز لئے اور لفٹ میں سوار ہو گئے۔۔۔لفٹ آپریٹر سے ہم نے پوچھا کہ دو تین منٹ میں کیا ہم نیچے پہونچ جائیں گے۔۔۔ وہ مسکرایا اور کہنے لگا Only 40 seconds اور اس کے بعد Lift کا دروازہ کھل گیا، ہم جہاں سے اوپر گئے تھے وہیں آ گئے۔ پروگرام کے مطابق ہم چوتھے فلور کی سیڑھیوں کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے، یہ بہت بڑا اور وسیع شاپنگ سینٹر تھا۔۔۔ایسے شاپنگ سینٹرز پاکستان کے بڑے شہروں میں بھی تعمیر ہو گئے ہیں لیکن رقبہ کے اعتبار سے چھوٹے ہیں۔۔۔کئی منٹ گذر گئے۔۔۔ہم سیڑھی کی ریلنگ سے ٹیک لگائے آتے جاتے لوگوں کو دیکھ رہے تھے۔۔۔اچانک خیال آیا کہ آتے جاتے تمام لوگ ہمیں گھوگھور کر دیکھ رہے ہیں۔۔۔ہم نے اپنے حلیہ پر نظر ڈالی، عام سا پرانا قمیض۔۔۔ہمارے ناپ سے بہت زیادہ ڈھیلی جینز، پائنچے اس کے بے ترتیبی سے اڑ سے ہوئے جتنے بھی بال ہیں وہ بکھرے ہوئے اور بے ترتیب۔۔۔سدا سے روؤنی صورت۔۔۔ شیشے کھلی ہوئی پرانی بس کے سفر کی تکان چہرے پر نمایاں ۔۔۔ہم چشم تصور میں اپنا لٹکا ہوا منہ دیکھ کر محسوس کرنے لگے۔۔۔کہ ایسی ہی صورتیں بنائے کراچی کے ٹریفک سگنل پر گداگر کار کا بند شیشہ بجا کر فریاد کرتے ہیں۔۔۔۔

ایسے عالم میں اگر کسی نے ترس کھا کر ہماری ہتھیلی پر ایک رنگٹ کا سکہ رکھ دیا۔۔۔اور یہاں کسی پولیس والے نے دیکھ لیا تو اصل واقعہ کی تحقیق تو وہ بعد میں کرے گا، سعودی عرب کے شہر کی طرح ہمیں جیل میں پہلے بند کر دے گا میرے پاس نہ پاسپورٹ نہ ہوائی ٹکٹ۔۔۔نہ موبائل اور نہ جیب میں مناسب رقم۔۔۔مذکورہ تمام اشیاء تو بیگم کے پرس میں ہیں۔۔۔حسرت موہانی۔۔۔۔ منٹو اور فیض کی طرح پسِ زنداں ہونے کا شوق تو ہمیں زمانہ طالب علمی سے رہا ہے۔۔۔لیکن

پردیس میں بھیک مانگنے کے جرم میں پابہ زنجیر ہونا ہمیں بالکل پسند نہیں یہ خیال آتے ہی خوف کی لہر ہماری گدی سے کمر تک اتر گئی۔۔۔ہم ایک جھٹکے سے سیڑھیوں کی ریلنگ سے ہٹے۔۔۔اور سامنے شاپنگ اسٹورز میں تاک جھانک کرنے لگے لیکن اس اہتمام سے کہ ہر پانچ منٹ بعد واپس آکر اس ریلنگ کے قرب وجوار پر ایک نگاہ ڈال لیتے تھے۔۔۔اس عمل میں آدھ گھنٹہ مزید گذر گیا ہم اتنے پریشان ہوئے کہ ایک دو بار سیڑھیوں کا رستہ تک بھول گئے کہ ہمارے چاروں طرف ملتے جلتے متعدد اسٹورز تھے۔۔۔کافی دیر بعد بیگم نے ہمیں ڈھونڈ لیا کہنے لگیں کہاں رہ گئے تھے آپ ۔۔۔میں آدھ گھنٹے سے آپ کو تلاش کر رہی ہوں۔۔۔ہر پانچ منٹ کے بعد ادھر آکر آپ کو تلاش کرتی ہوں۔۔آپ نے تو شاپنگ کا مزہ کرکرا کر دیا۔۔اب آئیں میرے ساتھ ایک دو چیزیں اس دکان پر پسند کی ہیں آپ بھی ذرا دیکھ لیں ۔۔بیگم نے ایک سانس میں ایک طویل مکالمہ ادا کیا۔۔ٹیلیویژن کے کسی ڈرامے میں اتنا طویل مکالمہ طلعت حسین کو دیا، جاتا تو وہ پانچ منٹ میں ادا کرتے اور درجنوں ری ٹیک دینے پڑتے۔۔۔اب ہم پردیس میں بیگم سے کیا الجھتے اور چپ چاپ ''حکم بیگم مرگِ مفاجات'' کی تصویر بنے پیچھے پیچھے چل پڑے۔۔

خود کار سیڑھیوں سے اتر کر ہم فرسٹ فلور پر آئے تو بیگم یہاں پھر ایک دکان پر رک گئیں ۔۔میں نے کہا کہ میں باہر دروازہ پر کھڑا ہوں۔۔۔کیونکہ مجھے اب سگریٹ کی طلب محسوس ہو رہی تھی۔۔۔جیسا کہ ہم نے پہلے بتایا کہ کومتار ٹاور کا صدر دروازہ بہت عام سا تھا۔۔۔ اس کے سامنے یعنی فٹ پاتھ کے قریب بیٹھنے کے لئے ایک فٹ اونچی دیوار سی بنا دی گئی تھی اس کے ساتھ ہی دو تین اونچے اونچے۔۔۔ایش ٹرے رکھے تھے۔۔۔اور مجھ سے پہلے کئی لوگ بڑی بے صبری سے سگریٹ پی رہے تھے، یوں لگ رہا تھا جیسے انہوں نے ابھی ابھی روزہ افطار کیا ہے۔۔ہم بھی ان میں شامل ہو گئے۔۔۔ہمارے سامنے ایک ستون کے پاس ایک ''فنکار'' چند کاغذوں پر پنسل سے لکیریں کھینچ کر ڈرائنگ کر رہا تھا۔۔۔بالکل دوسری تیسری کلاس کے بچے کی طرح۔۔۔کئی رنگین چاک بھی اس کے سامنے بچھی ہوئی ایک چادر پر پڑے ہوئے تھے۔۔۔اس چادر میں بہت سے سکے پڑے تھے۔۔۔ہم نے دیکھا کہ آتے جاتے راہگیر اس کی بچھی ہوئی چادر پر سکہ ڈالتے اور آگے بڑھ جاتے۔۔۔مگر وہ فنکار۔۔۔اپنے حلیہ سے نیم دیوانہ۔۔۔ صورت سے ہونق۔۔۔اور رویہ سے مصور دکھائی دیتا تھا۔اس قدر بے نیاز تھا کہ اس نے سکہ گرنے کی آواز پر دھیان دیا نہ آتے جاتے لوگوں پر توجہ دی وہ اپنے کام میں مگن تھا۔۔۔اسے

آپ گداگر سمجھیں تو یہ واحد شخص تھا جسے ہم نے دس روز کے دوران ملائیشیا میں بھیک مانگتے دیکھا۔۔۔ ہمارے خیال میں وہ کوئی غریب مصور تھا۔۔۔اور اس بہانے رزق کماتا تھا۔

ہم ایک بات بتاتے چلیں کہ 60ویں منزل پہ کھڑے ہوکر ہم نے تین طرف سے تقریباً پورے پینانگ کو دیکھا۔۔۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ ہمیں کوئی کچی بستی۔۔۔ کوئی جھونپڑپٹی۔۔۔کوئی گندہ نالا۔۔۔کوئی خالی پلاٹ۔۔۔کچرے کا ڈھیر۔۔۔ کچے مکانات۔۔۔مخدوش عمارتیں۔۔۔یعنی مذکورہ تمام لفظوں کی عملی تصویر کہیں نظر نہیں آئی۔۔۔کہا جاتا ہے کہ پورے ملائیشیا میں کوئی شخص بے گھر نہیں۔۔۔کوئی شخص بے روزگار نہیں ہے۔۔۔یہ ٹھیک ہے کہ تمام لوگ امیر نہیں ہیں۔۔۔خوشحال بھی نہیں ہیں۔۔۔لیکن یہ بات درست ہے کہ یہاں کوئی بھوکا نہیں سوتا۔۔۔کوئی بھیک نہیں مانگتا، کوئی ہاتھ نہیں پھیلاتا۔۔۔کوئی شخص آپ کو الگ لے جاکر اپنی جھوٹی سچی دکھ بھری داستان نہیں سناتا۔۔۔یہاں تو بھیک دینا جرم ہے۔۔۔اس کی تصدیق اس خبر سے ہوئی جو کراچی کے ایک روزنامہ میں شائع ہوئی تھی کہ ملائیشیا میں ایک شخص کو بھیک دینے کے جرم میں جیل بھیج دیا گیا۔۔۔ظاہر ہے کہ بھیک مانگنے والا تو پہلے ہی جیل بھیج دیا گیا ہوگا۔۔۔اس چھوٹے سے ملک میں یہ نظام کیسے قائم ہوگیا۔۔۔ ہر شخص کو بنیادی ضروریات کی فراہمی حکومت کی ذمہ داری ہے۔۔۔ہمارے ملک میں تو کہا جاتا ہے کہ امیری غریبی اللہ کی طرف سے ہے۔۔۔اور اس وقت سے ہے جب سے یہ دنیا وجود میں آئی۔۔۔اللہ تعالیٰ کی یہی حکمت ہے۔۔۔کہ کچھ لوگ حاکم ہوں اور باقی محکوم۔۔۔کچھ لوگ پیدائشی مخدوم ہوتے ہیں اور باقی لوگ خادم ہوتے ہیں۔۔۔کچھ لوگوں کو اللہ تعالیٰ امیر پیدا کرتا ہے اور باقی لوگوں کو غریب۔۔۔۔ قدرت یہی چاہتی ہے کہ کچھ لوگ عیش وعشرت میں زندگی بسر کریں اور باقی لوگ نانِ جویں کو ترسیں۔۔۔حکمراں بھی یہی کہتے ہیں۔۔۔سیاست دان بھی اسی پر یقین رکھتے ہیں۔۔۔علماء کرام بھی اس کی تصدیق کرتے ہیں۔۔۔اگر کوئی سرپھرا لکھاری یا شاعر اس فرمان کے خلاف قلم اٹھائے تو اسے ناپسند کیا جاتا ہے۔۔۔اگر یہ سچ ہے۔۔۔اگر یہی منشائے ربانی ہے۔۔۔اگر یہی تقدیر انسانی ہے۔۔

تو پھر قانون قدرت، ملائیشیا میں کیوں نہیں۔۔۔اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے قوانین پر یہاں عمل درآمد کیوں نہیں کرواتا۔۔۔اس کا۔۔۔فرمان یہاں کیوں جاری نہیں ہے؟۔۔۔۔یہاں آکر میری سمجھ میں آیا کہ میرا رب تو سب کا پروردگار۔۔۔سب کا پالن ہار ہے۔۔۔میرے رب

نے تو قیامت تک آنے والے انسانوں کے لئے وافر وسائل فراہم کئے ہیں اور اس کے محبوب ﷺ نے قیامت تک آنے والے انسانوں کو بتا دیا تھا کہ جس کے پاس اس کی ضرورت سے زیادہ پہونچے وہ اپنے قرابت داروں ضرورت مندوں اور حاجت مندوں میں تقسیم کردے۔۔ ملائیشیا کے حکمرانوں نے اس سنت پر عمل کیا اور وہی نظام اختیار کیا جس سے ہر شخص کو پیٹ بھر روٹی۔۔۔ تن ڈھانپنے کو کپڑا اور رہنے کو چھت میسر آجائے اسے علاج کرانے کی سہولت حاصل ہو۔۔۔ اسے تعلیم کا حق حاصل ہو اور اسے اپنے مزاج اور صلاحیت کے مطابق کام کرنے کی آزادی ہو۔۔۔ ملائیشیا کے حکمرانوں نے ایسا کر دکھایا۔۔۔ مجھے اپنے رب کے رزاق ہونے پر مزید یقین ہو گیا۔۔۔ میں نے اپنے رب کے حضور شرمندگی سے گردن جھکالی، کہ میں بھی انہی لوگوں کا حاشیہ بردار رہا ہوں جو خود کو پیدائشی مخدوم اور باقی لوگوں کو اپنا غلام سمجھتے ہیں۔

بیگم جانے کب میرے قریب آکر کھڑی ہو گئیں۔۔ پھر انہوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا میں نے نظریں اوپر اٹھائیں، لیکن یہ بھی سچ ہے کہ میری آنکھوں میں ندامت کا ایک بھی آنسو نہیں تھا۔۔۔ اٹھنے سے پہلے میں نے ایک بار پھر اپنے سامنے بیٹھے ہوئے مصور کو دیکھا وہ سیاحوں کی آمد و رفت اور لوگوں کے آنے جانے سے لاتعلق اپنے کام میں مصروف تھا، میں نے غور کیا وہ آڑھی ٹیڑھی لکیریں نہیں کھینچ رہا تھا بلکہ اپنے خیالات و محسوسات کو کاغذ کے کینوس پر منتقل کر رہا تھا۔۔۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ Committment کے مفہوم کی زندہ تصویر ہے۔۔۔ اپنے کام سے محبت۔۔۔ اپنے فن سے دلچسپی اور اپنے ہنر سے لگن۔۔۔ شدید دھوپ ہے۔۔۔ وہ پسینہ میں شرابور ہے مگر تصویر بنانے میں مگن ہے۔۔۔ دل نے کہا یہ گداگر نہیں ہو سکتا۔۔۔ یہ بھک منگا نہیں ہو سکتا۔۔۔ یہ فقیر بھی نہیں ہو سکتا۔۔۔ لیکن پھر خیال آیا یہی تو ''فقیر'' ہے۔۔۔ یہ تو درویش ہے۔ اس کی چوکھٹ کو سلام کرنا چاہیئے اس کے انہماک نے تو مجھے ''محنت کی عظمت'' کے معنی سمجھائے ہیں۔۔۔ میں اٹھا اپنی جیب سے ایک نوٹ نکالا اور ادب سے درویش کی خدمت میں پیش کر دیا، یعنی اس کی گدڑی پہ رکھ دیا۔۔۔ اس نے نہ سر اٹھایا۔۔۔ نہ مجھے دیکھا۔۔۔ نہ میری طرف دھیان دیا، نہ نوٹ کو چور نظروں سے دیکھا۔۔۔ وہ اپنے فن کی تکمیل میں مصروف رہا میری نگاہوں نے محنت کرنے والے ہاتھوں کو چوما۔۔۔ عقیدت سے، اپنے کام میں منہمک مصور کو دیکھا اور الٹے قدموں پلٹ کر بیگم کے پاس چلا آیا۔

☆☆☆

نیگری مسجد

نیگری مسجد ریاست کی سب سے بڑی مسجد ہے۔۔کومتار سے پانچ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے کومتار ٹاور سے بس جاتی ہے، جس راستے سے ہم کومتار ٹاور میں داخل ہوئے تھے وُہ یکطرفہ سڑک تھی واپسی کے لئے ہمیں کومتار کی عقبی سڑک پر جانا تھا۔ لاعلمی کی وجہ سے ہم نیچے اتر آئے ورنہ کسی بھی فلور پر قائم کمرشل زون سے دوسری طرف جاسکتے تھے کہ کومتار ٹاور کونے کی بلڈنگ ہے اور اس کے تین طرف سڑکیں ہیں۔۔۔اب ہمیں کومتار ٹاور کے ساتھ U-Turn کی صورت عقبی سڑک پر جانا تھا۔۔چند منٹ کے بعد ہم اسی کشادہ سڑک پر پہونچے جس کی چھت پر کومتار ٹاور قائم ہے بلڈنگ کے نیچے شہر کا مرکزی بس اسٹاپ ہے مختلف Lane پر بہت سی بسیں کھڑی تھیں۔۔۔ہم نے نیگری مسجد جانے والی بس تلاش کی اور اس پر بیٹھ گئے۔۔۔اپنے مقررہ وقت پر بس کے خودکار دروازے ڈرائیور نے بند کئے اور ہم روانہ ہوگئے۔۔کھڑکی کے شیشوں سے ہم گذرتی عمارتوں کو دیکھتے رہے ایک جگہ لکھا تھا DHOBI GHAT۔۔۔۔۔ہم تو دھوبی گھاٹ ہی سمجھے لیکن اس کی علامتیں نظر نہیں آئیں۔۔۔دھوبی گھاٹ پر نہ تو دھوبی نظر آیا اور نہ ہی دھوبی گھاٹ۔۔۔۔ہم نے چلتی بس سے مڑکر دیکھا تو دھوبی کا کتا بھی نظر نہیں آیا۔۔۔۔سچ پوچھو تو وہاں دھوبی گھاٹ بھی نہ تھا۔۔۔۔ہوسکتا ہے کہ کسی زمانے میں یہاں دھوبی گھاٹ ہوتا ہو، مگر شہر کے پھیلاؤ کی وجہ سے اب اس جگہ کا نام دھوبی گھاٹ رکھ دیا گیا ہو۔۔۔۔یقیناً دھوبیوں نے ڈرائی کلینرز کی دکانیں کھول لی ہونگی۔۔۔۔رہی کتے کی بات تو وہ بے چارہ نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔۔۔کتے پر ہمیں یاد آیا کہ ہم نے ابتک ملا ایشیاء میں کہیں کتا نہیں دیکھا۔۔۔۔گلی کوچوں، سڑکوں بازاروں حتیٰ کہ ساحلوں اور جزیروں کے جنگلات میں بھی دکھائی نہیں دیا۔۔۔۔ملا ایشیاء بھی اس روئے زمین پر ہے جہاں اور ممالک موجود ہیں۔۔۔۔بے شک یہاں کے لوگ بہت سادہ اور مہمان نواز ہیں لیکن کتے تو یہاں بھی ہونے چاہئیں۔۔۔۔چلئے کتے نہ سہی، مگر ہم نے تو یہاں کسی میں ''کتا پن'' بھی محسوس نہیں کیا۔

اب ہم نے یہاں گذارے ہوئے چند دنوں کے معمولات پر غور کیا تو اندازہ ہوا کہ کوئی

''سگ گزیدہ'' بھی نہیں دیکھا۔۔۔سگ گزیدہ پر یاد آیا کہ دنیا میں یہ واحد مرض ہے جس میں مریض، مرض سے زیادہ اس کے علاج سے ڈرتا ہے کہ سگ گزیدہ مریض کو پیٹ میں انجکشن لگتے ہیں۔۔۔کسی محلّہ میں کتے کے پاگل ہونے کی خبر پھیل جائے تو گھروں سے لوگ نہیں نکلتے۔۔۔پاگل کتے کے خوف سے نہیں، انجکشن لگوانے کے ڈر سے۔۔۔ہمارا تو یقین ہے کہ ملائیشین قوم نے ''سگ باش برادر خورد مباش'' والا محاورہ بھی نہیں سنا ہوگا۔۔۔کیونکہ یہاں کتے ہیں نا برادر خورد۔۔۔ہر مرد و زن اور جوان و بوڑھا، محنت کر کے اپنا رزق تلاش کرتا ہے۔

کتے یہاں بھی کہیں نا کہیں تو ہوتے ہونگے۔۔۔مگر جانے یہ لوگ کتوں کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔۔۔امریکہ اور مغربی ممالک میں تو کتوں سے لوگ بہت پیار کرتے ہیں ان کی قدر و منزلت ایشیائی اور افریقی ممالک کے عوام سے کہیں زیادہ ہوتی ہے امریکی کتے صاف پانی پیتے ہیں۔۔۔ڈبوں میں محفوظ کھانا کھاتے ہیں اور رات۔۔۔اپنے مالکوں کے ساتھ نرم گرم بستروں پر سوتے ہیں۔۔۔خوبصورت، صاف ستھرے اور دلفریب ہوتے ہیں۔۔۔مغرب میں لوگ کتوں کو اپنے بچوں سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں ان کا یقین اور تجربہ یہ ہے کہ ''سگ حضور بہہ از برادرِ دور'' مذکورہ ممالک میں کتوں کی اتنی قسمیں ہیں کہ یاد رکھنا مشکل۔۔۔حسینائیں گود میں لئے پھرتی ہیں، دیکھو تو احساس محرومی ہوتی ہے۔۔۔برسوں پہلے ہم واشنگٹن سے ہرنڈن جانے کے لئے ٹرین میں سفر کر رہے تھے کہ گز بھر کپڑے میں ملبوس ایک بی بی کسی اسٹیشن سے ٹرین میں سوار ہوئیں اور کندھے میں لٹکے پرس کو ہمارے اور اپنے درمیان خالی جگہ پر رکھ کر سیٹ پر بیٹھ گئیں۔۔۔ہم نے پرس کو دیکھا تو اس میں سے کتا جھانک رہا تھا ہم سمجھے پرس کا ڈیزائن ہے۔۔۔پھر نظر پڑی تو وہ آنکھیں جھپکا رہا تھا۔۔۔خیال آیا کہ چابی والا کتا ہے۔۔۔کچھ دیر بعد بی بی نے ہم سے زیادہ اپنے پرس کو پیار سے دیکھا اور کتے کے سر پر دست شفقت پھیرا تب پتہ چلا کہ وہ سچ مچ کا کتا ہے۔۔۔کتا کیا کتے کا پلا تھا۔۔۔بی بی نے پرس کو کتے کا گہوارہ بنایا ہوا تھا۔۔۔امریکی کتے ہمیں اس لئے گوارہ ہیں کہ وہ اندھوں کا سہارا ہوتے ہیں۔۔۔لیکن پاکستانی کتے آوارہ پھرتے ہیں۔۔۔گندے، مریل اور ملنگے ہوتے ہیں اس کے باوجود اپنی مرضی سے بغیر کسی معاوضہ کے گلی محلوں میں چوکیداری کرتے ہیں۔۔۔گھر دیر سے آنیوالوں پر نہ صرف بھونکتے ہیں بلکہ ان کا پیچھا کرتے ہیں کہ گلی سے گھر تک فاصلہ منٹوں میں طے کرا دیتے ہیں۔

گلی، محلّہ اور گاؤں میں رہنے والے کتے گنواروں سے ہوتے ہیں۔۔۔لیکن پاکستان کے

Posh Areas میں کتے سڑکوں پر نہیں کوٹھیوں اور بنگلوں میں رہتے ہیں۔۔۔گھر سے باہر پیدل نہیں کار میں بیٹھ کر نکلتے ہیں۔۔۔۔دور پرے کی جان پہچان تو دور کی بات ہے یہاں کے کتے تو اپنے پڑوسیوں تک سے نہیں ملتے۔۔۔۔ان علاقوں میں رہنے والی کتیوں کی عصمت و عفت کی بڑی حفاظت کی جاتی ہے۔۔۔۔نچلی ذات کے کتوں کو تو چھوڑیئے۔۔۔حسب نسب معلوم کئے بغیر تو اپنے کتوں کو کسی کتیا سے ملنے بھی نہیں دیتے۔۔۔۔ہاں اپنے معاملات میں ذات پات کی پرواہ نہیں کرتے۔۔۔۔کہ جہاں، جب جیسی ملے کی بنیاد پر استعمال میں لے آتے ہیں۔

Posh Area کے بنگلوں اور کوٹھیوں میں سگ خانہ۔۔۔۔سگ جاں (رکھوالی کرنیوالا) کے طور پر رہتا ہے اور کوٹھیوں کے صدر دروازہ پر مکینوں سے زیادہ تعداد میں ''سگانِ آستاں'' کندھوں پر کلاشنکوف لٹکائے ٹہلتے رہتے ہیں۔۔۔یوں تو ان صاحبان اختیار کے آس پاس ''سگان حضوری'' بھی بہت ہوتے ہیں۔۔۔۔تاہم ان میں بیشتر سگ خوئی (لالچی آدمی) کی خوبی سے مکلّف ہوتے ہیں اور ضرورت پڑنے پر کتے کی طرح دم ہلانے میں بھی تکلف نہیں کرتے۔۔۔۔کتوں پر سوچتے سوچتے جب اپنے آپ پر نظر پڑی تو محسوس ہوا کہ ہم تو ''سگِ زمانہ'' ہیں۔۔ہمیں نا تو کوئی آستانہ ملا۔۔اور نا حضوری نصیب ہوئی۔۔۔ہم تو وہ مردم ناسپاس ہیں کہ سگ حق شناس بھی نا بن سکے۔۔۔سگ مدینہ بننے کی آرزو تھی۔۔۔مگر آرزو اس قدر کمزور کہ کبھی دعا میں نہ ڈھل سکی۔۔۔بس دنیاداری اور سگ بازاری ہو کر رہ گئے۔۔۔گردن موڑے اتنی دیر سے آپ کیا دیکھ رہے ہیں۔۔۔۔بیگم نے شانہ ہلاتے ہوئے پوچھا۔۔۔۔خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔۔۔میں دھوبی گھاٹ دیکھ رہا تھا۔۔۔مگر اب تو وہ بہت پیچھے رہ گیا۔۔۔اور ذہن میں دھوبی کا کتا سوار تھا۔۔۔وہ بھی اتر گیا۔

کیا مطلب۔۔۔! آپ ٹھیک تو ہیں۔۔۔بیگم پریشان ہو گئیں

ہاں میں بالکل ٹھیک ہوں

لیکن کتے کا خیال کیوں آیا۔۔۔ہم نے یہاں اب تک کوئی کتا بھی نہیں دیکھا۔۔۔بیگم نے پوچھا

بس یہی خیال مجھے آیا تھا کہ ہم نے اب تک کوئی کتا نہیں دیکھا۔۔۔خیر چھوڑیئے۔۔۔ہم پھر گذرتی عمارتیں دیکھنے میں محو ہو گئے۔

ہاں اس کے بالکل قریب ایک چھوٹی سی مسجد پر نظر پڑی جس کی ڈھلواں چھت کو گھاس پھونس سے سجایا گیا تھا۔۔۔ مسجد کا نام ''حاجی یوسف مسجد'' تھا۔ بس کا سفر جاری رہا۔۔۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر خوبصورت اور آرام دہ بس اسٹاپ۔۔۔ کراچی شہر کی اہم شاہراہوں پر سٹی ڈسٹرکٹ گورنمنٹ نے حال ہی میں ایسے ہی بس اسٹاپ تعمیر کئے ہیں۔۔۔ سید مصطفیٰ کمال نے ملائیشیا سے تعلیم حاصل کی ہے اور کچھ عرصہ یہاں ملازمت بھی کی ہے۔ یقیناً اس قسم کے بس اسٹاپ کا تصور سٹی ناظم ملائیشیا ہی سے لائے ہونگے۔

بس ایک ویران سی سڑک پر رک گئی۔۔۔ یہی ہماری منزل تھی۔۔۔ سڑک کو ویران ہم نے اس لئے کہا کہ یہاں اکا دکا گاڑیوں کے علاوہ ہمیں کچھ اور نظر نہیں آیا۔۔۔ اصل میں یہ کمرشل ایریا نہیں تھا۔۔۔ شاید یہ رہائشی علاقہ بھی نہیں، ہم جس اسٹاپ پر اترے تھے اس کے قریب ہی ایک راستہ مسجد کے لئے جاتا تھا۔۔۔ پہلی ہی نظر میں اندازہ ہو گیا کہ مسجد سینکڑوں مربع ایکٹر پر پھیلی ہوئی ہے، یقیناً بہت سے دروازے ہونگے ہم جس دروازے سے داخل ہوئے وہ بہت کشادہ تھا۔۔۔ اندر دائیں بائیں سبزہ زار۔۔۔ بے ترتیب لیکن لاتعداد پام کے درخت اور اس کے ساتھ قطار بنائے ان گنت سرو کے پیڑ۔۔۔ اتنے پیڑ تو تاج محل کی تصویر میں بھی نہیں دیکھے۔۔۔ مسجد کے گنبد اور مینار کو دیکھ کر بے اختیار ایک عام سا لفظ ذہن میں آیا ''عظیم الشان''۔۔۔ لیکن ہم نے اس لفظ کو شعوری طور پر استعمال کیا۔۔۔ مسجد کا ڈیزائن عام مسجدوں سے مختلف تھا، مرکزی گنبد، گیندے کے پھول کی طرح لاتعداد مگر ترتیب وار پنکھڑیوں کی گود میں رکھا ہوا تھا رنگ بھی گیندے کے پھول ہی کی طرح۔۔۔ اس کے چاروں طرف بڑی بڑی کمان نما محرابوں نے انہیں گھیرا ہوا تھا۔۔۔ لگتا تھا جیسے درجنوں دلہنوں کے جڑاؤ ہار الٹے کر کے مسجد کی گردن میں پہنا دیئے گئے ہوں۔۔ مسجد کی منڈیر بھی سفید جڑاؤ پٹیوں سے سجی ہوئی تھی۔۔۔ مسجد کے ساتھ بہت سی خوبصورت عمارتیں۔۔۔ یہاں کالج بھی ہے۔۔۔ دارالعلوم بھی ہے۔۔۔ مدرسہ بھی اور طلباء کی رہائش کے لئے ہاسٹل بھی ہے۔۔۔ ایک تین منزلہ عمارت مری کے ''فیڈرل لاج'' کی طرز پر تھی۔۔۔ چمکتی ہوئی چھتوں کی اینٹوں پر نیلے رنگ کی پالش سے پچی کاری کا کام کیا ہوا تھا۔

سیڑھیاں چڑھ کر مسجد کے دالان میں پہونچے۔۔۔ جوتے اتار کر مقررہ جگہ پر رکھ دیئے دو تین سمت شاندار اور صاف ستھرے وضو خانے بنے ہوئے تھے دالان پر قیمتی پتھروں کے ٹائل لگے ہوئے تھے۔۔۔ مسجد کی عمارت کے منقش دروازے اعلیٰ درجہ کی لکڑی سے بنائے گئے تھے۔۔۔

ایک دروازہ کے باہر نوٹس بورڈ پر لکھا تھا کہ اسلامی لباس میں داخل ہوں۔۔دشواری ہو تو دفتر سے رابطہ کر کے لباس حاصل کرلیں۔۔۔۔ یہاں تمام مساجد میں یہ سہولت ہے کیونکہ ہر مرد و زن یہاں کام کرتے ہیں اگر آپ نے اونچی جینز پہنی ہوئی ہے۔۔۔Short پہنی ہوئی ہے۔۔۔ اور سر ڈھانپنے کے لئے چادر یا دوپٹہ نہیں ہے تب بھی آپ مسجد میں آئیں استقبالیہ کاؤنٹر سے مطلوبہ لباس حاصل کریں اور نماز ادا کریں۔۔۔اب ہم مسجد کے اندر داخل ہوئے۔۔بہت کشادہ اور بڑا کمرہ۔۔۔اعلیٰ درجہ کے قیمتی غالیچوں کی طویل صفیں۔۔۔۔بالکل درمیان میں ڈیفنس مسجد کراچی کی طرح بہت چوڑا گنبد۔۔۔گنبد کے ساتھ لٹکا ہوا قیمتی اور دیدہ زیب جھاڑ فانوس۔۔۔۔ خطبہ کے لئے گول منبر۔۔۔یعنی خطیب دو سیڑھیاں چڑھ کر منبر پر کھڑا ہو تو گول دروازہ بند ہو جائے۔۔۔دوسری جانب درس دینے کے لئے میز کرسی۔۔۔درودیوار منقش۔۔۔چاروں طرف آیات قرآنی عمدہ کتابت سے دیواروں پر کندہ کی گئیں تھیں۔۔مصلے کے اوپر دائیں بائیں ۔۔۔اللہ۔۔۔محمدؐ۔۔۔لکھا ہوا۔۔۔مسجد کے تین طرف دوسری منزل کی گیلری اتنی کشادہ کہ سینکڑوں لوگ نماز ادا کر سکیں۔۔۔تینوں طرف گیلری 20 خوبصورت ستونوں پر قائم ۔۔۔۔ستون ابتدا میں چوڑے لیکن اوپر جاتے جاتے ان کا دائرہ چھوٹا ہو جاتا ہے۔۔۔۔خواتین کے لئے ایک حصہ مختص۔۔۔خوبصورت لکڑی کے تختوں سے جگہ بنا دی گئی تھی Wood carving کی مدد سے انتہائی دیدہ زیب Partitions بنائے گئے تھے۔۔۔۔داخلے کے لئے دروازہ بھی بلند اور باوقار لاہور کی بادشاہی مسجد سے ذرا چھوٹا ہوگا۔۔۔باہر نکلیں تو چاروں طرف دو چھتی۔۔۔پھر صحن۔۔۔اور اس کے بعد سبزہ زار۔۔۔پھولوں کے قطعے۔۔۔پودوں کے تختے ۔۔۔تین طرف پانی کے حوض۔۔۔داخلے کے کئی دروازے۔۔۔مسجد بہت ہی شاندار۔۔۔آس پاس پارک۔۔۔پارک میں بچوں کے کھیلنے ان کے جھولنے۔۔۔۔پھسلنے اور دلچسپی کی مختلف جدید چیزیں۔۔۔!!

1977 میں مسجد کا سنگ بنیاد حاجی سعود بن حاج زبیر کے ہاتھوں رکھا گیا 1980 میں مسجد کا کچھ حصہ تعمیر ہو گیا۔۔۔ہم جب پہونچے تو کسی نماز کا وقت نہیں تھا۔۔۔لیکن سیاحوں کی بڑی تعداد اس مسجد کو دیکھنے آتی ہے۔۔۔بہت بڑا حصہ گاڑیوں کی پارکنگ کے لئے مخصوص تھا۔

مسجد چونکہ شہری آباد اور تجارتی علاقہ سے دور ہے اس لئے۔۔۔۔۔مدرسہ اور کالج کے طلباء ہی عام نمازوں میں شریک ہوتے ہونگے لیکن سنا ہے کہ جمعہ کی نماز میں اندر جگہ مشکل سے

ملتی ہے۔عیدین کی نماز میں اس سے بھی زیادہ نمازی ہوتے ہیں مسجد کا بیرونی حصہ خوبصورت باغ کی طرح ہے۔۔۔ہم تھک گئے تھے اس لئے باہر آئے۔۔۔سیڑھیوں کے ساتھ سڑک کے کنارے ایکTUC shop بھی ہے چاء کافی کولڈ ڈرنکس اور کھانے کی دیگر اشیاء موجود ہوتی ہیں۔۔۔ایک درخت کے سایے کے نیچے بیٹھ کر ہم نے بسکٹ اور نمکیاں کھائیں۔۔۔اور کافی دیر تک ستاتے رہے اب ہمیں واپس جانے کے لئے۔۔۔سڑک پار کرنا تھی اس کے لئے ایک خوبصورتPadestarian Brige بنا ہوا تھا۔۔۔سڑک پر ٹریفک کم تھا اس لئے ہم نے دوڑ کر سڑک پار کی۔۔۔سامنے دیکھا تو ایک بہت ہی بڑا اور خوبصورت ٹمپل۔۔۔پگوڈا کی طرز پر تعمیر کیا ہوا۔۔۔اس قدر منقش کہ ہم نے پہلے کبھی اتنے رنگوں سے مزین چینیوں کی عبادت گاہ نہیں دیکھی تھی۔۔۔کومتار ٹاور کے سامنے جسTemple کو ہم دیکھ کر آئے تھے وہ تو بہت چھوٹی عمارت تھی۔۔۔لیکن یہ ٹمپل بڑا اور بہت کشادہ تھا۔۔۔جبکہ اس آہنی دروازہ بھی باوقار اور منقش تھا لیکن اس ٹیمپل کا دروازہ بھی بند تھا۔۔۔ہم نے جھانک کر بھی دیکھا کوئی نظر نہیں آیا۔۔۔عمارت کا بیرونی حصہ بے حد دیدہ زیب۔۔۔۔TONGRIMSI Temple ہے۔

بس اسٹاپ پر چند لوگ کھڑے تھے۔۔۔معلوم کرنے پر پتہ چلا ہے کہ پہلے ہمیں کومتار بس اسٹاپ واپس جانا ہوگا اور وہیں سےBay view hotel کے لئے دوسری بس لینا ہوگی ذرا دیر بعد بس آ گئی۔۔۔ہم کومتار ٹاور اترے۔۔۔بس تبدیل کی اور شام سے پہلے اپنے ہوٹل واپس پہنچ گئے۔

کمرے میں پہنچے تو صاف ستھرے اجلے بستر پر پھلوں کی ایک ٹوکری رنگین پنی میں لپٹی ہوئی رکھی تھی اس کے اوپر تین چھوٹے چھوٹے پھولوں کی ایک شاخFruit Basket پر سجی ہوئی تھی۔۔۔دل بے حد خوش ہوا۔۔۔چند پھلوں کی کوئی اہمیت نہیں لیکن جس طرح ہوٹل کی انتظامیہ اپنے مہمانوں کی پذیرائی کرتی ہے وہ لائق تحسین ہے۔۔۔پھل رخصتی کے موقع پر ہمیں بجھوائے گئے تھے کیونکہ کل ہم اس ہوٹل اور اس شہر سے چلے جائیں گے۔۔

کمرہ میں آ کر ہم سو گئے۔۔۔دیر تک آرام کیا۔۔۔رات کا کھانا ہوٹل کے ڈائننگ روم میں کھایا۔۔۔پھر لابی میں آ کر بیٹھ گئے۔۔۔یہاں کی لابی بے حد روشن ہے کیونکہ نویں منزل پر چھت نہیں ہے بلکہ فائبر گلاس کی مدد سے گول دائرہ میں چھت بنائی گئی ہے فائبر گلاس Transparint ہے اس لئے دن میں سورج کی روشنی آتی ہے۔۔۔کشادگی کا احساس ہوتا ہے

اور اگر چاند اوپر آسمان پر ہو تو وہ لابی میں جھانکنے لگتا ہے۔۔۔ کشادہ لابی میں مختلف جگہوں پر مسافروں کے بیٹھنے کے لئے آرام دہ صوفوں اور کرسیوں کے کارنر بنا دیئے گئے ہیں سہ پہر کو جب ہم ہوٹل میں واپس آئے تھے تو سیڑھیوں سے لفٹ تک اور سامنے اوپر کی منزل پر جانے کے لئے سرخ غالیچے بچھے ہوئے تھے، ہمیں اندازہ ہو گیا کہ آج رات یہاں کوئی تقریب ہے اور اہم شخصیات کے آنے کی توقع ہے۔۔۔

کمرے سے نیچے اترے تو ہمارا اندازہ درست ثابت ہوا۔۔۔ ہوٹل میں کوئی اہم تقریب تھی مختلف انداز کی یونیفارم میں ملبوس بہت سے سیکیورٹی گارڈز موجود تھے۔۔۔ سیڑھیوں کے قریب منتظمین ریڈ کارپیٹ کے دونوں طرف استقبالیہ قطار بنائے کھڑے تھے۔۔ پہلے ہمیں گمان ہوا کہ شادی کی تقریب ہے اور لڑکی والے بارات کی پیش وائی کے لئے کھڑے ہیں۔۔۔ کیونکہ خواتین نے روایتی زرق برق لباس پہنے ہوئے تھے چھوٹے چھوٹے بچے ادھر ادھر شرارتیں کرتے پھر رہے تھے۔۔۔ اور مردوں نے تقریب کا لباس پہنا ہوا تھا ۔۔۔۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے۔۔۔ سیکیورٹی افسران کی تعداد بڑھتی گئی۔۔۔ بہت سی اہم شخصیات کا بڑے احترام اور اعزاز کے ساتھ استقبال کیا گیا۔۔۔ باہر بڑی بڑی سفید موٹر سائیکلیں ہر گاڑی کے ساتھ سائرن بجاتی ہوئی آتی ہیں۔۔۔ ہم بھی ایک صوفے پر بیٹھ گئے تاکہ ان اہم شخصیات کو قریب سے دیکھ سکیں کسی نے منع بھی نہیں کیا پہلے خیال گزرا کہ شاید ہمیں اپنے کمرے میں جانے کے لئے کہا جائے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کر استقبال کرنے والوں میں شامل ہو گیا۔۔۔ آخر میں کوئی دس بارہ موٹر سائیکل سوار سائرن بجاتے اور سرخ بتی چمکاتے آئے پورچ میں کار رکی میزبانوں نے کسی اہم شخصیت کا استقبال کیا۔۔۔ بہت خوبصورت پھولوں کے بکے اور گلدستہ انہیں پیش کئے گئے۔۔۔ پھر ایک ہجوم کے ساتھ وہ شخصیت لفٹ کے دروازہ تک گئی۔۔ باقی مہمان سیڑھی کی مدد سے اوپر کی منزل پر چلے گئے جہاں گیلری کی ریلنگ کو پھولوں اور بجلی کے قمقموں سے سجایا گیا تھا۔

ہم نے ایک صاحب سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ گورنر صاحب تشریف لائے ہیں اور ان کا نام غالباً ''صباح ملاکا'' تھا۔۔۔ ان کے ساتھ ان کی بیگم بھی تھیں، سرتاپیر اپنے قومی روایتی لباس میں ملبوس۔

لابی میں کھڑے تمام مہمان و میزبان اوپر تقریب میں چلے گئے ہم ہوٹل سے باہر نکلے ۔۔۔ تو دیکھا سڑک پر کم و بیش چالیس موٹر سائیکلیں کھڑی تھیں اور ان کے ڈرائیور ادھر ادھر ٹہل

رہے تھے۔۔۔ہماری ہوٹل کے سامنے ایک چھوٹا سا ہوٹل تھا۔۔ہم وہاں چلے گئے ۔۔۔بہت سے سفید یونیفارم میں ملبوس ڈرائیوراس ہوٹل میں موجود تھے یہاں T.V اسکرین پر فٹ بال کا میچ دکھایا جارہا تھا جو ملائیشیا کی مقامی ٹیموں کے درمیان تھا،لیکن ہوٹل میں موجود لوگ اس میچ کو بالکل اسی جوش وجذبہ سے دیکھ رہے تھے جس طرح ہمارے ہاں ہندوستان پاکستان کے درمیان کرکٹ میچ دیکھا جاتا ہے۔

ہوٹل سے باہر موسم بہت اچھا تھا۔۔۔مٹی کی خوشبو،پودوں کی مہک اور درختوں کی باس ہرسو پھیلی ہوئی تھی اور ماحول بے حد خوشگوار تھا۔۔۔ہم کچھ دیر فٹ پاتھ پر ٹہلتے رہے اور پھر ہوٹل واپس آگئے۔۔۔کمرے کے پردے ہٹا کر دیکھا،سمندر چاند کی پیلی چاندنی میں بہت خوبصورت لگ رہ تھا۔۔۔۔لہروں کی سرسراہٹ اور سمندر کی سطح پر ابھرنے والی دودھیا لہروں کی آوازیں سماعت کو بھلی لگ رہی تھیں۔۔۔۔۔پھر پردے کھینچ کر برابر کردئے گئے۔۔۔کمرے میں نومبر کا موسم تھا۔۔بستر پر لیٹ گئے اور یونہی T.V کے چینل بدلتے رہے اور جانے کب سوگئے۔۔۔۔۔

صبح آرام سے اٹھے۔۔۔تیار ہونے سے پہلے ناشتہ کرنے چلے گئے Bay view resort کا ناشتہ شاید زندگی میں کبھی نہ بھلا سکیں۔۔۔۔۔کھانے کی ان گنت اشیاء۔۔۔تفصیل درج کریں تو کئی صفحات درکار ہوں گے۔۔۔۔ناشتہ کرکے کچھ دیر سوئمنگ پول کے قریب ایک پام کے درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔۔۔۔خوبصورت مناظر۔۔۔۔رومان پرور ماحول خوشگوار یادوں کی صورت ذہن میں محفوظ ہوتا رہا۔۔۔وقت گذرتا رہا ہم چپ چاپ بیٹھے سوئمنگ پول میں سورج کی کرنوں کو نہاتے دیکھتے رہے۔۔۔کچھ دیر بعد،بیگم نے خامشی کو توڑتے ہوئے کہا مجھے یہ بیل لیکر جانی ہے۔۔انداز بالکل بچوں کا سا تھا۔۔۔۔

کوالالمپور میں بھی ایسی بیلیں ضرور ہونگی۔۔۔کسی سے معلوم کریں گے کہ ہم ان بیلوں کو لے جاسکتے ہیں یا نہیں۔۔

لنکاوی میں بھی آپ نے یہی کہا تھا،بیگم ناراض ہوگئیں۔۔۔۔

کوالالمپور میں بھی شاید یہی کہوں۔۔کیوں کہ انسان کو اپنی بات پر قائم رہنا چاہیئے۔۔۔چلو اٹھو نئے سفر کی تیاری کرنا ہے۔۔۔ہم کمرے میں آگئے۔۔۔شاور لیا۔۔کپڑے تبدیل کئے۔۔۔مختصر سا سامان سمیٹا۔۔۔

روانگی سے پہلے کافی پلادو۔۔۔ہم نے بیگم سے کہا اور پردہ کھینچ کر گیلری میں پڑی کرسی پر

بیٹھ گئے۔۔۔ہوٹل کے اس کمرے میں یہ ہمارے آخری لمحات ہیں۔الوداعی نظروں سے ان تمام مناظر کو دیکھا جنہیں کھوج کھوج کر ہم پچھلے تین دنوں سے دیکھ رہے تھے۔۔۔سمندر کے کنارے کئی ستاروں والی ہوٹل کے Executive Suite میں شاید ہمیں پھر وقت گذارنے کا موقع نہ ملے۔۔۔ہم دونوں گم سم کافی دیر تک بیٹھے کافی کی Sip لیتے رہے۔۔۔پھر اٹھ کھڑے ہوئے کیونکہ ہم جانتے تھے AOS والے کبھی تاخیر نہیں کرتے۔۔۔بیگم نے ایک خوش سلیقہ خاتون خانہ کی حیثیت سے تمام الماریاں۔۔۔۔میزوں کی درازیں مسہری کے آس پاس، ہر چیز کا جائزہ لیا کہ کہیں کوئی چیز رہ نہ جائے۔۔۔ہوائی سفر کے ٹکٹ پاسپورٹ۔۔۔بکنگ کے ضروری کاغذات چیک کئے اور کہنے لگی۔۔۔چلیں، وقت ہوگیا۔۔۔

میں کاؤنٹر پر گیا۔۔۔ڈپٹی مینیجر کو Key Cards دیئے۔۔۔اس نے مسکرا کر دوبارہ آنے کی خواہش کا اظہار کیا۔۔۔پینانگ سے رخصت ہونے کا وقت آگیا۔۔

پینانگ ملائیشیا کا پرانا شہر ہے۔۔۔لیکن اب یہاں سے تمام پرانی چیزوں کی جگہ جدید اشیاء آگئیں ہیں۔۔۔پرانی عمارتوں کی بنیاد پر بڑی بڑی عمارتیں تعمیر ہوگئیں ہیں۔۔۔۔ 30-35 سال کے دوران یہ شہر بالکل بدل گیا ہے جدید اور ترقی یافتہ۔۔۔۔دنیا کا شاید یہ واحد شہر ہے جہاں چار اہم مذاہب کے لوگ باہم شیر وشکر ہیں۔۔۔ایسے بہت سے مقامات اور بازار ہیں جہاں مسجد، مندر، گرجا۔ٹیمپل اور بدھسٹ چینیوں کی عبادت گاہیں ہیں۔۔۔بفضل تعالیٰ ہمیں کئی مساجد دیکھنے کا اتفاق ہوا۔۔۔کئی چھوٹے چھوٹے مندر دیکھے۔۔۔ Temples کے اندر گئے۔۔۔پگوڈا دیکھے۔۔۔لیکن ان تمام عبادت گاہوں میں لوگ نہیں تھے۔۔۔مساجد میں بھی نمازیوں کی تعداد محدود تھی ہاں مسلم خواتین باقاعدگی سے مسجد میں آکر باجماعت نماز ادا کرتی ہیں۔۔۔ یہاں 40 فیصد بدھسٹ ہیں، 50 فیصد مسلمان ہیں ہندوؤں کی تعداد 10 فیصد ہے۔۔۔عیسائی کم ہیں۔۔۔۔سکھ بھی بہت کم ہیں، یہاں کے لوگ بلا کے مہمان نواز۔۔۔خوش اخلاق۔۔۔قوانین پر سختی سے عمل کرنے والے۔۔۔مسلم خواتین، روایتی لباس پہنتی ہیں۔۔۔ کہیں ساریاں اور شلواریں بھی نظر آئیں لیکن نئی نسل جینز اور اپر استعمال کرتی ہے۔۔۔بازاروں، مارکیٹوں، پارکوں، سڑکوں، گلیوں، بازاروں اور دیگر Public Places پر کوئی غیر اخلاقی سرگرمیاں نظر نہیں آئیں۔۔۔عورت اور مرد، لڑکے اور لڑکیاں، ان سب کے درمیان ایک فاصلہ ہے۔۔۔یورپ امریکہ کی طرح مادر پدر آزادی نہیں ہے۔۔۔۔یہاں کے مسلمان داڑھی نہیں

رکھتے ،اول تو ان کے چہرے پر بال بہت کم آتے ہیں اور جن کے چند بال آتے ہیں وہ شیو کرتے ہیں۔۔۔ یہاں ہم نے کسی کو بھی داڑھی میں نہیں دیکھا۔۔۔ مسجد کے پیش امام کو بھی نہیں سوائے سکھوں کے۔۔۔!!

AOS کی گاڑی وقت مقررہ پر آ گئی۔۔۔ کوسٹر ہمارے لئے تیار کھڑی تھی، اس بار ڈرائیور تھا ڈیرک انتھونی۔۔۔ ڈیرک انتھونی بہت دلچسپ آدمی تھا۔ اس کی سب سے اچھی بات یہ لگی کہ وہ اچھا گائیڈ بھی تھا سوال نہ بھی کرو تو وہ آس پاس کے بارے میں معلومات فراہم کرتا رہا۔۔۔ ڈرائیور محمد نے ہمیں تین دن پہلے بتایا تھا کہ آپ کے ہوٹل کے قریب ایک ایسی مسجد ہے جو سمندر میں ہے۔۔۔ آپ چاہیں تو بس کے ذریعہ بھی ہوٹل سے مسجد تک جا سکتے ہیں، زیادہ دور نہیں ہے۔ دو دن پہلے تو ہم نے پیدل ہی اس مسجد کو دیکھنے کا ارادہ کیا تھا مگر جیسمین ہوٹل سے آگے جا کر بھی معلوم کیا تو پتہ چلا۔۔۔ ذرا اور آگے ہے۔۔۔ اس وقت ہم نہ دیکھ سکے بہر حال اس مسجد کو دیکھنے کی خواہش تھی

کوسٹر میں بیٹھنے کے بعد ہم نے اپنے گائیڈ ڈیرک انتھونی سے مسجد کا پتہ پوچھا تو اس نے بتایا کہ ہمارے راستے ہی میں Over sea Mosque ہے۔۔۔ ہم نے درخواست کی کہ اس مسجد میں دس منٹ رکنا ہے، اس نے پوچھا آپ Pray کریں گے۔۔۔ میں نے کہا نماز کا وقت نہیں ہے ہم صرف دیکھنا چاہتے ہیں۔

اس نے بڑی خوش دلی سے کہا No problem

ہمیں اس کا انداز بہت اچھا لگا دل نے کہا واقعی یہ Harmony City ہے۔

بات چیت جاری رکھنے کے لئے پوچھا انتھونی! آپ کب سے یہاں ہیں۔۔۔!

ان نے بتایا کہ میری پیدائش ملائیشیا کی ہے میری دادی بھارت سے یہاں آئی تھیں، وہ بہت Chairty بھارت بھجواتی تھیں۔۔۔ میرا بچپن، دادی کے ساتھ ڈاکخانے آنے جانے میں گذرا ہے۔۔۔ بڑا ہو گیا تو اپنی دادی کو Post office لے کر جاتا تھا۔۔۔ انڈیا میں بہت لوگ ہیں جنہیں دادی Charity بھیجتی تھی اب ہم لوگ دادی کی طرف سے بھیجتے ہیں

میں بے حد متاثر ہوا۔۔۔ ڈیرک انتھونی نے بتایا کہ وہ پانچ سال سے AOS سے وابستہ ہے۔

اس کام کو تم کیسا محسوس کرتے ہو، کوئی Problem تو نہیں۔

انتھونی نے بڑی سادگی سے کہا۔Problem تو ہوتے ہیں، لیکن میں جب صبح اپنے گھر سے نکلتا ہوں۔۔۔تو تمام Problems گھر چھوڑ آتا ہوں، میں مسکراتا ہوں، ہنستا ہوں، خوش ہوتا ہوں اور اپنے Passangers میں خوشیاں بانٹتا ہوں۔۔یہی میری Job ہے۔۔ مجھے ابھی کوئی پرابلم نہیں۔۔۔ یہ کہکر وہ زور سے ہنسا اور گاڑی آہستہ کر کے سڑک کے ساتھ ایک پل پر چڑھ گیا۔۔۔۔ یہ Mosque ہے۔۔۔اس نے پارکنگ کی جگہ کو سٹر روکی۔۔ہم نے دروازہ کھینچ کر کھولا اور باہر نکل آئے۔۔

سڑک کے ساتھ سمندر کے پانی پر ایک چھوٹا سا پل بنا ہوا تھا، یہ سمندر سڑک کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔۔۔مسجد پر پہلی نظر ڈالی تو طبیعت خوش ہوگئی، ایک بڑی عمارت، اس کے اوپر ایک بڑا اور پھیلا ہوا سرخ رنگ کا گنبد۔۔۔مسجد کے درمیان تین حصوں پر مشتمل چوکور مینار ۔۔۔مسجد کے بیرونی حصہ میں بہت زیادہ تزئین وآرائش نہیں تھی۔۔۔بیل بوٹے اور جنڈی کاشی کا زیادہ کام نہیں تھا، مسجد کی مکمل عمارت سمندر میں نصب موٹے موٹے ستونوں پر کھڑی تھی اور سمندر کا پانی ستونوں سے ٹکرا کر دو حصوں میں تقسیم ہوتا ہوا ساحل کے قریب آتا اور چلا جاتا، لہریں بہت پرسکون تھیں، محسوس ہوتا تھا کہ مسجد کی بنیادوں کو بوسہ دینے آتی ہیں۔۔۔احترام کرتے ہوئے دھیمے دھیمے سمندر کا پانی سبک روی سے چل رہا تھا۔

مسجد کے دروازہ پر جلی حرف میں" اللہ اکبر" لکھا ہوا تھا اور سیڑھیوں کے اوپر دالان کے ساتھ ایک بڑے دروازہ پر مسجد میں داخلہ کی دعا تحریر تھی۔ مسجد کا محراب نما دروازہ۔۔۔کھڑکیوں پر تزئین کاری کمال کی تھی۔۔سڑک اور مسجد کے درمیان کا حصہ بے حد کشادہ۔۔۔کچھ حصہ پارکنگ کے لئے مخصوص تھا۔۔۔ دو علیحدہ علیحدہ وضو خانے تھے اور ان پر خوبصورت گنبد بنے ہوئے تھے۔۔ایک وضو خانہ خواتین کے لئے مخصوص تھا۔۔۔جوتیاں اتار کر ہم اوپر صحن پر پہونچے مسجد کی بیرونی چہار دیوار کے بعد سمندر ہی سمندر تھا۔۔۔تین طرف دالانوں پر نہایت خوبصورت ٹائلز لگے ہوئے تھے۔۔مسجد کے کئی دروازے تھے مگر سب بند تھے، کسی نماز کا وقت نہیں تھا یہاں پر بھی ایک بورڈ پر ایسی ہی اطلاع درج تھی جیسے ہم نے نیگری مسجد میں دیکھی تھی یعنی آپ مسلم لباس میں داخل ہوں۔۔۔میسر نہ ہو تو دفتر سے حاصل کر لیں۔ مسجد بہت بڑی تھی۔۔۔ہم نے کشادہ دروازہ سے جھانک کر دیکھا تو اندر سے بے حد خوبصورت، قیمتی قالین بچھے ہوئے تھے۔۔۔یہ مسجد بھی ویسی ہی تھی جیسی دیگر مساجد ہم نے دیکھی تھیں ہم نے مسجدوں کا بہت ذکر کیا ہے۔۔۔کیونکہ مسجد مسلم

تہذیب اور طرز تعمیر کی علامت ہوتی ہے یہاں مسجدیں بہت ہیں۔۔۔خوبصورت، عظیم الشان اور کشادہ۔۔۔مگر نمازیوں کی تعداد بہت کم دیکھنے میں آئی ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان مسجدوں کو آباد کرے اور انہیں قائم رکھے۔۔۔آمین

ہم نے مسجد کی چند تصویریں بنالیں اور ائیر پورٹ کے لئے روانہ ہوگئے۔

انتھونی نے بتایا کہ یہاں چینیوں کی آبادی زیادہ ہے، ان کے بہت سے Temples ہیں، ان میں بدھسٹ بھی ہیں اور دوسرے مذہب والے بھی۔ یہاں دس فیصد ہندو ہیں۔

ہم نے پوچھا کہ یہاں سکھوں کا کوئی گردوارہ نہیں ہے۔۔۔؟

انتھونی نے بتایا کہ شہر سے ذرا دور سکھوں کا گردوارہ ہے کوئی Tourist وہاں جانا چاہتا ہے تو ہم لے جاتے ہیں یوں بھی پینانگ میں سکھوں کی تعداد کم ہے۔۔۔

انتھونی کی باتیں جاری رہیں۔۔۔گاڑی چلتی رہی سڑک کے دونوں طرف کے مناظر ہم دیکھتے رہے۔۔ پھر ہم بارونق جگہ سے گذرے۔۔۔بڑی بڑی عمارتیں ان میں سے بعض عمارتوں میں ''پکچر ہاؤسز'' ہیں کسی کسی عمارت میں تو دس دس سنیما گھر ہیں۔۔۔لیکن چھوٹے ہیں۔۔۔اسی دوران ایک بڑے Temple کو ہم نے گذرتے دیکھا۔۔۔انتھونی نے بتایا کہ Maria Man Temple ہے ایک عورت کے نام پر اس کا نام رکھا گیا ہے۔۔۔ہم نے پہلے بھی اسے دور سے دیکھا تھا۔

اب ہم رہائشی عمارتوں کے درمیان سے گذر رہے تھے، 20-15 منزلہ سادہ سی عمارتیں۔۔۔قطار اندر قطار۔۔۔اس کے بعد صنعتی علاقہ شروع ہوگیا ہم نے کورنگی انڈسٹریل ایریا دیکھا ہے۔۔۔S.I.T.E کا ایریا دیکھا، نارتھ کراچی انڈسٹری ایریا دیکھا ہے۔۔۔جہاں ٹوٹی پھوٹی سڑکیں (سید مصطفیٰ کمال کے زمانے میں کورنگی اور نارتھ کراچی انڈسٹریل ایریا میں مرکزی سڑکیں بنادی گئیں ہیں)۔۔۔صنعتی فضلے کے بدبودار نالے۔۔۔ٹوٹی پھوٹی چہار دیواری کے اندر دھواں اگلتے کارخانے آنے جانے کے لئے موٹر سائیکل سوار بھی مشکل سے راستہ بناتا ہے، بارش ہو جائے تو ہفتوں زمین کے اندر دبے ہوئے کچرے کے ڈھیر کی بدبو فضا کو ناگوار بنائے رکھتی ہے۔۔۔حالانکہ KATI کے چیئرمین میاں زاہد حسین نے ہمیں ایک بار بتایا تھا کہ کورنگی کے صنعتی علاقہ سے حکومت کو روزانہ ۳۰ کروڑ کی آمدنی ہوتی ہے۔۔۔کورنگی روڈ پر Pearl Fabrics۔۔۔عبدالحسیب خان کی Brooks۔۔۔انگلش بسکٹس فیکٹری۔۔۔اور ایسی ہی چند فیکٹریاں

صاف ستھری اور خوبصورت نظر آتی ہیں۔۔۔ باقی اس لائق نہیں کہ انہیں دیکھا جائے حالانکہ اس گندے صنعتی علاقہ سے حکومت کو روزانہ ۳۰ کروڑ روپے ٹیکس ملتا ہے۔

اب ہم پینانگ جیسے چھوٹے شہر کے صنعتی علاقے سے گذر رہے تھے اگر انتھونی نہ بتاتا کہ یہ فیکٹریاں ہیں تو ہم اس علاقہ کو بڑی بڑی کوٹھیوں اور بنگلوں کی کوئی Posh آبادی سمجھتے۔۔۔ اس سے ذرا ہٹ کر بڑی بڑی عمارتیں۔۔۔ ان کے ساتھ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ورکرز اور لیبرز کے لئے رہائشی فلیٹوں کی قطاریں

ہم نے انتھونی سے پوچھا، یہاں کارخانے، فیکٹری یا مشینیں نظر نہیں آرہی ہیں۔۔۔ اور نہ ہی کارخانوں کی چمنیاں دھواں اگل رہی ہیں۔۔۔ نہ مشینوں کی آوازیں آرہی ہیں یہ کیسا صنعتی زون ہے۔۔

تمام مشینیں شیڈز کے اندر ہیں، یہاں بڑی بڑی فیکٹریاں ہیں۔۔ ان بلڈنگز میں دفاتر ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ Shades ہیں، ان میں جدید مشینیں ہیں، ان کا شور زیادہ نہیں ہوتا اس کے ساتھ ہی ورکرز کے لئے رہائشی فلیٹس بنے ہوئے ہیں۔۔۔ یہیں ضرورت کی تمام چیزیں مل جاتی ہیں۔۔۔ یہ لوگ کبھی کبھی شہر آتے ہیں۔۔۔ انتھونی تفصیلات بتانے لگا۔۔ ہم خاموشی سے سنتے رہے۔۔۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بین الاقوامی کمپنیوں کے نام کے بورڈ لگے ہوئے تھے جس کی مدد سے ہم اندازہ لگا سکتے تھے کہ یہ کس چیز کی فیکٹری ہے۔

رواں سڑک، سبک رفتار کوسٹر۔۔۔ کھلی اور کشادہ فضا۔۔۔ ذرا دور درختوں کی قطاریں۔۔۔ کہیں پہاڑیاں۔۔۔ کہیں نخلستان۔۔۔ راستے میں کئی مساجد بھی نظر آئیں۔۔۔ ملائے زبان میں دیوان کا مطلب Hall۔۔۔ اور ''سورہ'' کا مطلب نماز پڑھنے کی جگہ۔۔۔ ائیر پورٹ آنے والا ہے۔۔۔ انتھونی نے بتایا۔۔۔۔ کسی جگہ دوست یا رشتے دار سے آپ رخصت ہونے لگتے ہیں تو طبیعت میں اداسی اور فضا میں خاموشی چھا جاتی ہے۔۔۔ اب ہم پینانگ کو خیر باد کہہ رہے تھے اس لئے کوسٹر میں خاموشی چھا گئی۔۔

کچھ دیر بعد انتھونی نے کوسٹر روک دی۔

یہ پینانگ ائیر پورٹ ہے۔۔۔ ہم نے انتھونی کا شکریہ ادا کیا اور اپنا مختصر سا سامان لئے ائیر پورٹ میں داخل ہوئے۔۔۔ چھوٹا سا ائیر پورٹ ہے۔۔۔ داخلی حصہ بہت سادہ ہے لیکن اندر لاؤنج میں ان گنت دکانیں۔۔۔ شو رومز۔۔ کافی شاپس۔۔۔۔ ریستوران اور کیفے ہیں

۔۔۔۔خاصی رونق تھی۔۔۔لاؤنج خاصا طویل۔۔۔جہاز جانے میں ابھی وقت تھا اس لئے ہم نے بیگم سے کہا کہ وہ سامان کے ساتھ بیٹھیں۔۔۔میں نماز پڑھ لوں۔۔۔لاؤنج کے آخر میں ایک جگہ لکھا تھا ''سورہ''۔۔۔یعنی نماز پڑھنے کی جگہ۔۔۔ہم وہاں چلے گئے۔۔۔چند اور مسافر بھی اپنے رب کے حضور سجدہ ریز تھے۔۔۔

نماز ادا کر کے بیگم کے پاس آئے کچھ دیر انتظار کیا جب check in شروع ہوئی تو ہم متعلقہ کاؤنٹر پر گئے۔۔۔AOS نے ہماری نشستیں Book کرائی ہوئیں تھیں ہم نے ٹکٹ دیئے۔۔۔ رسمی طور پر ۔۔۔ہمارے پاسپورٹ چیک کئے گئے۔۔۔ سوال بھی کوئی نہیں پوچھا۔۔۔مسکراتے ہوئے نہایت بے نیازی سے ہماری خواہش پر Window Seat کا بورڈنگ کارڈ دے دیا۔Laugage Card چپکا کر ٹکٹ واپس کر دیئے۔۔۔اس قدر Cold Response حیرت ہوئی ۔۔۔موصوف نے شاید غور سے بھی نہیں دیکھا کہ ہم پاکستان کے شہری ہیں ہمارے گرین پاسپورٹ کو تو ہر ائیر پورٹ پر خاص طور پر دیکھا جاتا ہے کہ پاکستانی مسافروں پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے، ہم تو خیر عام شہری ہیں ہمارے ملک کے نامور سیاستدانوں اور وزیروں کے ساتھ تو وہ سلوک ہوتا ہے کہ وہ گھر آ کر اپنی بیگم کو بتانے سے بھی گریز کرتے ہیں۔۔۔اور بیگم ساتھ ہوں تو اس واقعہ کو دونوں فریقین ذہن سے حرف غلط کی طرح مٹا دیتے ہیں۔۔۔وہ تو اخبار اور ٹی وی کیمرے بدمعاشی کرتے ہیں ورنہ سچ بات تو یہ ہے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔۔۔ہمیں خیر وزیروں کے ساتھ کئے جانے والے رویہ کی تو توقع نہ تھی ۔۔۔۔لیکن اس قدر بے اعتنائی ۔۔۔اس قدر لاتعلقی ۔۔۔۔ بہت تعجب ہوا۔۔۔کچھ نہیں کرتے ۔۔۔بیلٹ اتروا لیتے۔۔۔۔سگریٹ لائیٹر لے لیتے۔۔۔ بیگ میں رکھی ہوئی گھر کی بنی ہوئی ٹکیوں ہی کو ضبط کر کے لیبارٹری ٹیسٹ کے لئے بھجوا دیتے۔۔۔پاکستانی سمجھ کر کم از کم جوتا تو اتروا لیتے۔۔۔ مگر یہ ملائیشین عجیب مٹی کے بنے ہوئے ہیں کہ ہمیں ذرا لفٹ نہیں کرائی۔۔۔''مسلم برادر'' کے تعلق کے حوالے سے کوئی سوال پوچھ لیتے۔۔۔بیگم کی طرف تو انہوں نے دیکھا ہی نہیں۔۔۔وہ دور کھڑی تھیں

ہم نے پاسپورٹ ۔ٹکٹ اور بورڈنگ کارڈز بیگم کو دیئے۔۔۔کہنے لگی کوئی پرابلم تو نہیں ہوا۔

ہم نے مایوسی سے کہا کہ بس یہی پرابلم ہے کہ کوئی پرابلم نہیں ہوا۔

بیگم نے اللہ کا شکر ادا کیا۔۔۔تمام چیزیں اپنے بیگ میں رکھیں۔۔۔اب ہم لاؤنج میں آ گئے۔۔ایک طویل راہداری ایک طرف دکانیں اور دوسری طرف شیشوں کی دیوار۔۔۔ اس کے پار بہت سے چھوٹے چھوٹے جہاز کھڑے تھے۔۔۔رن وے کے چاروں طرف پہاڑ۔۔۔ہمیں تو ان پہاڑوں سے نکلنے کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دیا۔۔۔ضرور کوئی راستہ ہوگا ۔۔۔اور پھر ہم نے ہیلی کوپٹر سے تو سفر نہیں کرنا۔۔۔بیگم کی نظریں سامنے دکانوں پر سجی چیزوں کو شوق سے دیکھتی رہیں۔۔۔کہنے لگیں، آپ سامان کے ساتھ بیٹھیں۔۔میں سنی۔۔۔مون کے لئے کوئی چیز دیکھ لوں۔۔ہم بیٹھ گئے۔۔۔مسافر آ جا رہے تھے۔۔۔ہم نے اس دوران جین مت کے بھکشوؤں کو دیکھا 25-20 افراد پر مشتمل ان کا گروپ تھا۔۔۔تمام لوگ ننگے پیر تھے، ان کے سر تازہ تازہ منڈھے ہوئے تھے۔۔۔مگر اولے گرنے کے نشانات ہمیں نظر نہیں آئے۔۔۔سفید رنگ کا اجلا سا لمبا کرتا۔۔عربی ثوب سے زیادہ مشابہ تھا، چھوٹے چھوٹے بیگ ہاتھوں میں کلین شیو۔۔۔رنگ گندمی۔۔۔بہت نرم نرم قدموں سے ''حفاظتی گیٹ'' سے ایک ایک کر کے لاؤنج میں داخل ہوئے۔۔۔۔جب سب ایک جگہ جمع ہو گئے تو جتھہ کی صورت ہمارے سیدھے ہاتھ کی جانب چلے گئے۔۔۔جین مت کے ماننے والے بڑے حیوان دوست ہوتے ہیں۔۔۔کسی کو تکلیف دینا ان کے مشرب میں کفر ہے ننگے پیر رہتے ہیں صرف اس خوف سے کہ زمین پر رینگنے والا کوئی کیڑہ یا چیونٹی لاعلمی میں ان کے پیروں تلے نہ کچل جائے۔۔۔جانے یہ لوگ دنیا میں اب بہت کم کیوں ہو گئے۔۔۔شاید اس لئے کہ عصر حاضر میں یہ Miss fit ہیں۔۔۔دور جدید میں ترقی کے لئے انسان دشمن ہونا ضروری ہے۔۔۔اور یہ انسان دوست ہی نہیں حیوان دوست بھی ہیں، سفید کپڑا اس لئے استعمال کرتے ہیں کہ دامن پہ کوئی داغ نہ لگ جائے۔۔۔۔لگ جائے تو فوراً نظر آ جائے۔۔۔اب جینز کا زمانہ ہے کتنے ہی داغ دھبے لگ جائیں۔۔۔۔پہنے رہو۔۔۔ ہفتوں، مہینوں۔۔۔بلکہ سالوں داغ لگیں تو دھونے یا ڈائی کلین کی ضرورت نہیں کہ۔۔۔۔اب دنیا بھر کے ترقی یافتہ معاشرہ میں داغ دھبوں کی کوئی اہمیت نہیں، وہ زمانے گئے جب ذرا ذرا سی غلطی پر پورے خاندان کی ناک کٹ جاتی تھی۔۔۔پرانے زمانے میں، بات بات پر خاندان کی ناک کٹتی تھی۔۔۔۔اس دور جدید میں خاندان کا تصور ہی ختم ہو رہا ہے۔

نہ رہے بانس نہ بجے بانسری

ایک بار نیرو نے کیا بانسری بجائی۔۔۔بانسری ہی کی عزت و آبرو خطرے میں پڑ گئی

ہمارے ملک میں تو ایک استاد سلامت حسین رہ گئے ہیں جنہوں نے 60 سال بانسری سے دوستی میں گذار دیئے۔۔۔حیرت ہوتی ہے پوری زندگی ایک چھوٹے سے ساز کو بجانے میں گذار دی۔۔۔

دس بارہ برس پہلے تک حکومت پاکستان انہیں ثقافتی طائفہ کے ساتھ مختلف ملکوں میں بھجوادیا کرتی تھی جہاں وہ لوگوں کے سامنے بانسری بجاتے اور داد سمیٹتے۔۔۔اب لوگ بھی بھینس کی طرح بے حس ہوگئے ہیں، ان کے سامنے بین بجاؤ۔۔۔بانسری بجاؤ۔۔۔یا طبل جنگ بجاؤ۔۔۔ان پر کوئی اثر ہی نہیں ہوتا۔۔۔اب تو صرف لوگوں پر ڈالر کے بڑھنے اور اسٹاک ایکسچینج کے ریٹ گرنے کا اثر ہوتا ہے۔۔۔ایسے میں جین مت والوں کا کہاں گذر۔۔۔؟؟ یہ بے چارے اب جتنے بھی بچے ہیں اپنے دھرم کو بچائے ہوئے زندگی گذار رہے ہیں۔۔۔ہم نے پہلی بار جین مت کے ماننے والوں کو دیکھا۔۔۔بیشک اسلام کا کوئی ٹھیکیدار ہم پر خفا ہوجائے مگر سچی بات تو یہ ہے کہ ہمیں وہ اچھے لگے۔

کچھ دیر بعد بیگم واپس آئیں۔۔۔کہنے لگیں، بہت مہنگی چیزیں ہیں پھر خوشی سے ایک پیکٹ کھولا اور مجھے دکھاتے ہوئے کہنے لگیں۔۔۔میں نے سنی کے لئے ''کومتار ٹاور'' خرید لیا حالانکہ وہ کل بھی فون پر منع کررہا تھا کہ امی! آپ میرے لئے کوئی چیز نہ لائیں۔

میں نے کہا پینانگ والوں کے پاس بس یہی تو ایک شناخت ہے تم اسے بھی خرید لائیں۔۔۔۔کہنے لگیں یہ بڑے ہوشیار اور کمرشل لوگ ہیں ان کے پاس تو کومتار ٹاور کے سینکڑوں سانچے ہیں جہاں یہ ہزاروں کومتار ڈھالتے ہیں، ہماری طرح تھوڑی ہیں کہ شناخت کے سارے سانچے توڑ ڈالے۔۔۔۔'' مون صحیح کہتا ہے اب وہ سانچے ہی نہیں رہے جن میں علامہ اقبال، حسرت موہانی اور قائداعظم جیسے لوگ ڈھلتے تھے۔۔۔اب تو خالد علیگ جیسے لوگ بھی نہیں رہے۔۔۔بیگم کے لہجہ میں اداسی تھی۔

تم تو دانشوروں کی سی باتیں کررہی ہو۔

نہیں میں نے تو آپ کی بات کا جواب دیا ہے۔۔۔اور ہاں ان کے پاس تو ابھی مہاتیر محمد ہے جس نے تیس چالیس برسوں میں ربڑ اور گرم مصالحے پیدا کرنے والے برما کو، ترقی یافتہ ملائیشیا بنادیا ہے۔۔جو بقول آپ کے دنیا میں بجلی پیدا کرنے والا تیسرا بڑا ملک ہے۔۔۔

ہونہہ اب سمجھ میں آیا کہ تم صبح سویرے اٹھ کر اشتہارات سمیت سارا اخبار کیوں چاٹتی

ہو۔۔۔تم بڑی لائق ہوگئیں۔۔۔اب تم یہاں بیٹھو اور مجھ نالائق کو اجازت دو کہ ذرا لاؤنج کا چکر لگا کر آؤں۔۔

صاف کیوں نہیں کہتے کہ سگریٹ پینا ہے۔۔۔لیکن ہر جگہ No smoking کے بورڈ لگے ہوئے ہیں۔

جہاز کی روانگی میں ابھی دیر ہے۔۔۔کوشش کرتا ہوں شاید کہیں سگریٹ پینے کی جگہ مل جائے۔۔۔میں اٹھ کھڑا ہوا۔۔۔کئی لوگوں سے معلوم کیا مگر مایوسی ہوئی۔۔۔اس عادت بد کے لئے ائیر پورٹ سے باہر جانا ضروری تھا۔۔۔گھوم پھر کر چلے آئے۔۔

جہاں ہم بیٹھے تھے۔۔۔اس کے ساتھ ہی۔۔۔۔Gucci کمپنی کی دکان تھی ہماری بیگم کو جو پرس سنی نے لے کر دیا تھا وہ اسی کمپنی کا تھا۔۔۔بیگم نے بالکل اپنے جیسے پرس کی قیمت معلوم کی تو وہ 700 رنگٹ کا تھا۔۔۔بیگم اداس ہوگئیں اور بڑی ناراضگی سے کہنے لگیں۔۔۔سنی نے اتنا قیمتی پرس کیوں خریدا۔۔۔اتنا تو مجھے پتا تھا کہ مہنگا ہے لیکن اس قدر مہنگا ہے اس کا اندازہ نہ تھا پھر گود میں رکھے پرس کو کلیجہ سے لگا کر ممتا بھرے ہاتھوں سے ایسے ہی تھپکی دی جیسے 25 سال پہلے سنی کو گود میں لئے پیار کرتی تھیں۔۔۔بہت اچھا ہے، بہت پیارا ہے میری ڈھیروں چیزیں اس میں آجاتی ہیں۔۔

اسی دوران اعلان ہوا کہ کوالالمپور جانے والے مسافر گیٹ نمبر ۱۴ پر آجائیں لاؤنج میں ایک دم ہلچل مچ گئی۔۔۔لوگ نشستوں سے اٹھ کھڑے ہوئے گیٹ نمبر ۱۴ آخری سرے پر تھا۔ہم

جہاز میں سوار ہو گئے ۔۔۔ چڑھتے وقت عادت کے مطابق اخبار اٹھالیا ۔۔۔ چھوٹا جہاز تھا ۔۔۔ جہاز کی روانگی میں ذرا تاخیر ہوئی ۔۔۔ پہلے مونگ پھلی کے پیکٹ بھر جوس اور کافی Serve کی ۔۔۔ 40 منٹ کی فلائٹ تھی۔

وقت مقررہ پر جہاز نے ہمیں کوالالمپور کے بین الاقوامی ہوائی اڈے پر اتار دیا لاؤنج کو ہم نے پہچان لیا ۔۔۔ ''یہ تو وہی جگہ ہے گذرے تھے ہم جہاں سے'' ۔۔۔۔ سامان لے کر خاصی دور چلنا پڑا ۔۔۔ باہر نکلے ۔۔۔ ہمارے نام کی تختی لئے باہر ایک نوجوان کھڑا تھا ۔۔۔ ہم اس کے قریب گئے ۔۔۔ ہیلو ہائے کیا اس نے ہمارا ایک بیگ اٹھالیا ۔۔۔ ہم اس کے پیچھے پیچھے ۔۔۔ کوسٹر ہم نے پہچان لی کہ اس پر بڑے بڑے لفظوں میں Asian Overlan Service لکھا ہوا تھا۔ ڈرائیور نے سامان سامنے رکھ کر کوسٹر کی اگلی نشست کا دروازہ کھولا اور ایک بہت بڑا پھولوں کا گلدستہ ہماری جانب بڑھا دیا ۔۔۔ میں نے بیگم کی طرف اشارہ کیا اس قدر خوبصورت اور بڑا گلدستہ سچی بات یہ ہے کہ ہم نے اس سے پہلے نہیں دیکھا ۔۔۔ پاکستان میں تو اب لمبے بکوں کا رواج ہو گیا ہے جس میں ٹہنیاں زیادہ اور پھول کم ہوتے ہیں ۔۔۔ یہ بکے نہیں گلدستہ تھا ۔۔۔ بیگم نے شکریہ کہکر پھولوں کا گلدستہ اٹھایا تو سنبھالنے میں کندھے سے پرس لٹک گیا ۔۔۔ یقیناً وزنی ہوگا ۔۔۔ گلدستہ پر With Complements کے ساتھ جاوید حسن اور رضوان مرچنٹ کا نام لکھا ہوا تھا ۔۔۔ بے حد خوشی ہوئی ۔۔۔ دونوں دوستوں کے لئے ہونٹوں پر دعاؤں کے پھول کھل اٹھے ۔۔۔ کوسٹر میں بیٹھ کر ہم نے خود اس گلدستہ کو اٹھا کر دیکھا ۔۔۔ بھاری تھا ۔۔۔ پھر بیگم سے کہا تمہاری کلائیوں کی شاخوں میں اب پھول اٹھانے کی سکت بھی نہیں رہی ۔۔۔

مسکرائی ۔۔۔ برسوں بعد پیار بھری نظروں سے دیکھا ۔۔۔ اور کہنے لگیں ۔۔۔ نگہبان ساتھ ہو تو عورت کی کلائیاں چوڑیوں کا بوجھ بھی مشکل سے اٹھا پاتی ہیں آپ ساتھ تھے اس لئے ذرا سی دشواری ہوئی ۔۔۔ ویسے ایک بات بتاؤں، عورت غیر محفوظ ہو تو اس کی کلائیوں میں بڑی طاقت ہوتی ہے ۔۔۔ کیا آپ کو یاد نہیں بی بی زینبؓ نے دربار شاہی میں زنجیر بدست ہو کر بھی حاکم وقت کو کس طرح للکارا تھا۔ چاند بی بی نے اپنی کمزور کلائیوں میں تلوار لیکر دشمنوں کے منہ پھیر دیئے تھے کیونکہ ان کا بھی کوئی نگہبان نہ تھا ۔۔۔ کل کی بات ہے بے نظیر نے کم عمری میں آمریت کے خلاف کس جرات سے آواز اٹھائی تھی ۔۔۔ آپ کو تو یاد ہوگا اس زمانے میں آپ تو پرائم منسٹر ہاؤس میں ہوتے تھے ۔۔۔ جب عورت کی کوئی پناہ نہ ہو تو وہ بہت طاقتور ہو جاتی ہے

لیکن بعد میں بے نظیر کو کیا ہوا۔۔۔؟

بعد میں کیا ہوا۔۔۔ بعد میں تو اس کو نگہبان مل گیا تھا نا۔۔۔ اب سب تو آپ جیسے نہیں ہوتے۔۔۔! بیگم پھر مسکرائیں۔۔

منو! مجھے یاد آ رہا ہے۔۔۔ ناران، کاغان اور شوگران کے سفر کے دوران بھی تم نے ایسے ہی مکالمے ادا کئے تھے۔

☆☆☆

جنیٹنگ ہائی لینڈ

کوسٹر روانہ ہوئی تھوڑی دیر بعد ہی ہم موٹروے پر آ گئے۔۔۔تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کا راستہ ہے۔۔۔موٹروے بہت خوبصورت آرام دہ اور رواں۔۔۔۔۔40 برس پہلے جب حیدرآباد کراچی کے درمیان سپر ہائی وے تعمیر ہوا تھا تو مثل مشہور تھی کہ پانی کا لبالب گلاس بھر کر رکھ دو تو پانی چھلکے گا نہیں، اب یہ حال ہے کہ بس میں بیٹھ کر آدمی اچھلتا ہوا جاتا ہے، ڈرائیور کو جلدی ہو اور وہ بس کی رفتار تیز کر لے تو لوگ ایک دوسرے کی گود میں گرے جاتے ہیں۔۔۔یہاں موٹروے ایسا کہ آپ گرم گرم کافی کا مگ لیکر اطمینان سے پیتے چلے جائیں چھلکنے کا کوئی امکان نہیں ہاں صبر کے پیمانے کی یہاں بھی کوئی ضمانت نہیں۔۔۔ظرف کا پیمانہ تو مدت ہوئی ٹوٹ گیا۔۔۔راستہ بے حد کھلا اور کشادہ۔۔۔کراچی حیدرآباد سپر ہائی وے کے ابتدائی حصہ میں جس طرح نئے نئے فلیٹ تعمیر کئے جا رہے ہیں بالکل اسی طرح یہاں بھی تعمیرات کا سلسلہ جاری ہے۔۔۔آدھ گھنٹے کے بعد سڑک شروع جیسے اسلام آباد ائیر پورٹ سے زیرو پوائنٹ تک جاتے ہوئے آپ کو نظر آتی ہے بالکل اسی طرح یہاں بھی سڑک کے کنارے کنارے ترچھے انداز میں اوپر جاتی ہوئی تروتازہ گھاس لگائی گئی ہے۔۔۔کہیں ایک دو منزلہ مکانات پر نئی رہائشی بستیاں۔۔۔چند کلومیٹر کے بعد سڑک کے کبھی داہنے، کبھی بائیں ہاتھ خوبصورت مساجد۔۔۔ابھی سورج چمک رہا ہے، ہر شے نکھری ہوئی ہے، ڈرائیور نے بتایا کہ گھنٹہ بھر پہلے یہاں بارش ہو رہی تھی۔یقین نہیں آیا۔۔۔ہوئی ہوگی مگر ہم نے اب تک یعنی اپنے قیام کے دوران بارش نہیں پائی۔

شاید آدھ سفر طے کیا ہوگا ''پتر ہائٹس'' سے ذرا آگے سڑک سے ذرا فاصلہ پر ہندوؤں کا ایک بڑا مندر۔۔۔پہاڑ کے دامن میں۔۔۔روایتی عمارت۔۔۔دور سے لگتا ہے کہ سارے مندر پر سونے کا پانی چڑھایا ہوا ہے۔۔۔ہوسکتا ہے چڑھایا ہوا ہو۔مندر کے باہر لائف سائز سے تین گنا بڑے رام کے دو مجسمے۔۔۔۔۔رام بہت خوبصورت تھے مجسمے بھی اتنے ہی خوبصورت تھے۔۔۔عقیدتمندوں کی ایک بڑی تعداد مندر کے باہر موجود، ظاہر ہے کہ اندر بھی لوگ ہونگے۔۔۔لگتا ہے کہ ہندوؤں کا کوئی تہوار ہے۔۔۔ہم چاہتے تھے کہ کچھ دیر یہاں رکیں لیکن

بروقت فیصلہ نہ کر سکے۔۔۔۔۔افسوس ہوا کہ اس کے بعد ہم نے کوالالمپور میں بھی اتنا بڑا مندر نہیں دیکھا۔۔۔یہ Kumbah ٹاؤن ہے۔۔۔گاڑی آگے نکل گئی۔۔۔مندر اور اسے دیکھنے کی خواہش پیچھے رہ گئی۔۔۔اس سے پہلے ہم صنعتی علاقے سے گذرے تھے۔۔۔۔ویسا ہی صاف ستھرا جیسا پینانگ کا صنعتی علاقہ تھا۔

اب سڑک بلندی کی طرف جا رہی تھی۔۔۔راستے میں کئی فلائی اوورز آئے۔۔۔ سڑک پر متعدد ٹریفک نشانات ۔۔۔Road Singn نئے راستوں کے لئے تیر کے نشانات ۔۔۔سڑک پر لین مارکنگ بہت جدید اور ساتھ ساتھ ''Cat eyes''، اب کراچی میں بھی بہت سی اہم سڑکوں پر ٹریفک نشانات بڑی کثرت سے آویزاں کئے گئے ہیں۔اور ازسرنو ''بلی آنکھیں'' لگائی گئیں ہیں۔

باہر کا موسم ابر آلود ہو رہا تھا۔۔۔دھوپ کی چمک دھندلا گئی تھی۔۔۔گاڑی میں ڈرائیور کے علاوہ صرف ہم دونوں میاں بیوی تھے۔۔۔۔سگریٹ بہت دیر سے نہیں پی تھی۔۔۔۔طلب نے شدت اختیار کی تو میں نے احتیاطاً ڈرائیور سے کہا کہ میں سگریٹ پینا چاہتا ہوں۔۔۔کہنے لگا Sorry sir۔۔۔۔گاڑی میں سگریٹ پینا منع ہے۔۔۔۔آپ چاہیں تو میں سڑک کے کنارے کسی جگہ گاڑی روک لیتا ہوں، آپ گاڑی سے اتر کر سگریٹ پی سکتے ہیں۔

ڈرائیور کے جواب پر مجھے ناگواری کا احساس نہیں ہوا۔ بلکہ خوشی ہوئی۔حالانکہ گاڑی میں ہمارے علاوہ کوئی نہ تھا۔۔۔بڑی گاڑی تھی۔۔۔موٹروے پر دور و نزدیک کوئی ٹریفک سپاہی یا ان کی گاڑی اب تک ہم نے نہیں دیکھی تھی۔۔۔اگر قانون ہے بھی تو موٹروے پر اس تیزی سے دوڑتی ہوئی کوسٹر میں کون ہمیں سگریٹ پیتے دیکھے گا۔لیکن قانون کی سختی کے ساتھ عملداری نے ایک عام شہری کو بھی قانون کا احترام کرنا سکھا دیا قانون تو ہمارے ملک میں بھی ہے۔۔۔۔قدم قدم پر ٹریفک پولیس بھی موجود ہوتی ہے لیکن سب قانون توڑتے ہیں۔۔۔تعلیم یافتہ ہوں۔۔۔یا غیر تعلیم یافتہ۔۔۔۔حکمراں ہو کہ عوام۔۔۔جوان ہو کہ بزرگ۔۔۔ہم سب قانون توڑ کر۔۔۔ قانون کا مذاق اڑا کر۔۔۔قانون کی دھجیاں بکھیر کر ایک عجیب سی فرحت اور فخر محسوس کرتے ہیں۔۔۔انہیں آزادی حاصل کئے ہوئے 50 سال اور ہمیں 50 سال ہو گئے۔۔۔۔ہم تو 95 فیصد مسلمان ہیں یہاں صرف 60 فیصد ہیں۔۔۔یہاں تو بدھسٹ۔۔۔ہندو۔۔۔عیسائی کثیر تعداد میں رہتے ہیں 40 فیصد لوگ غیر ملائیے ہیں۔۔۔انہیں کس نے تہذیب سکھائی؟ کس نے

قانون کا احترام کرنا سکھایا۔۔۔؟؟

راستہ میں ایک ٹول پلازہ آیا تو گاڑی مدھم ہوگئی۔۔۔ ہمارے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا ۔۔۔اب تک کوئی ٹریفک سگنل نہیں آیا تھا۔۔۔ ہم تیز رفتاری سے چلے جارہے تھے، ہمیں تو اس موٹروے پر بھی جہاز کے سفر کا مزہ آرہا تھا۔۔۔ ہم نے بتایا تھا کہ ہم اب بلندی کی طرف جارہے ہیں ۔۔۔۔ اب پہاڑی علاقہ شروع ہوگیا۔۔۔ موسم نے ایک دم رنگ بدلا، ہمارے سامنے پہاڑوں کے اوپر درختوں میں بادل الجھے ہوئے تھے۔۔۔ وہی موسم، جو ہمارے شمالی علاقہ جات کا ہے۔۔۔ بادل بہت بڑھ گئے۔۔۔ سورج شرما کر بادلوں میں چھپ گیا ہے۔۔۔ اب گاڑی بل کھاتی ہوئی سڑک پر چل رہی تھی۔۔۔ ہواؤں کی چھیڑ چھاڑ سے درخت جھوم رہے تھے۔۔۔۔ دونوں طرف پہاڑی سلسلہ ۔۔۔ ہمارے ہاں پہاڑی راستوں سے گذرتے ہوئے لینڈ سلائنڈنگ کا خطرہ ہوتا ہے۔۔۔ یہاں بھی پہاڑوں پر ایسی جگہ ہیں جہاں سے ''لینڈ سلائیڈنگ'' کا خطرہ ہوسکتا ہے لیکن ان مقامات پر اتنی مضبوطی سے وزن برداشت کرنے کی پختہ دیواریں تعمیر کی گئیں ہیں کہ خطرہ کا کوئی امکان نہیں۔۔۔۔ یہاں بھی سڑک کے کنارے ایسے مقامات آئے جہاں چھوٹی چھوٹی دکانوں پر ضرورت کی چیزیں موجود تھیں۔۔۔ دکانیں بھی ٹھیلوں کی طرح تھیں اور ان کے اطراف ایسے ہی لوگ موجود تھے۔۔۔ ان مقامات پر لوگ اپنی سواری روک کر پسند کی چیزیں خریدتے ہیں یا منظر سے لطف لینے کے لئے دم بھر کو ٹھہر جاتے ہیں۔۔۔۔ اب آگے کا راستہ مکمل طور پر پہاڑی راستہ تھا۔۔۔ دورویہ کشادہ سڑک بلندی کی طرف جاتی ہوئی۔۔۔

موسم نے ایک عجیب لطف دیا۔۔۔ کئی برس کے بعد ہم نے اس موسم کو دیکھا تھا۔۔۔ اپنا علاقہ یاد آیا۔۔۔ موسم اور منظر یہاں سے زیادہ دلفریب اور حسین۔۔۔۔ لیکن سڑک اور اس کے اطراف کا حصہ ہمارے علاقوں سے بہتر۔۔۔ اب ہمیں ایک اور اچنبھا ہوا۔۔۔ اس پہاڑی علاقہ میں بھی بلند و بالا عمارتیں۔۔۔۔ دس، بیس منزلہ عمارتیں یہ تمام ہوٹلیں تھیں۔۔۔۔ پہاڑ کے دامن میں جب مری کے مال روڈ پر چار منزلہ ہوٹل تعمیر ہوئی تو لوگوں کو تعجب ہوا تھا۔۔۔ یہاں 30-20 منزلہ عمارتیں، حیرانگی کی بات تو تھی۔۔۔ اور پھر ڈیزائن۔۔۔ طرز تعمیر۔۔۔ نت نیا اور جدید محسوس ہوتا تھا ہم اپنی منزل تک پہونچنے والے تھے AOS کا یہ ڈرائیور کم گو تھا اس کی جگہ انتھونی ہوتا تو سفر کا لطف دو بالا ہوجاتا۔۔۔۔ راستے میں ایک قلعہ نما عمارت دیکھی یہ پولس ٹریننگ سینٹر ہے۔۔۔۔ اب دائیں بائیں راستے نکل رہے تھے مختلف مقامات پر جانے کے لئے۔۔۔ اس

کے بعد ہم نے ایک بہت ہی خوبصورت اور بلند عمارت دیکھی۔۔۔یہ Aiwana Hotel ہے۔۔۔اس نام کی ہوٹل پینانگ میں بھی تھی۔۔۔ڈرائیور نے بتایا کہ ملک کے دیگر شہروں میں بھی ہے۔۔۔یہ ہوٹل ''جینٹنگ ہائی لینڈ'' کی سب سے بلند ترین عمارت ہے۔۔۔ہمیں ابھی آگے جانا تھا۔۔۔مزید بلندی کی طرف، تقریباً سات کلومیٹر آگے۔۔۔پہاڑی راستہ اپنی روایات اور قدرتی حسن کے ساتھ اور بہتر ہوتا جا رہا تھا۔۔۔ذرا آگے بڑھے چینیوں کا ایک Temple دیکھا۔۔۔ویسا ہی جیسے ہم پہلے دیکھ چکے تھے مگر عمارت چھوٹی تھی۔۔۔گاڑی آگے بڑھتی رہی۔۔۔اب بادل درختوں کی چوٹیوں سے اتر کر شاخوں پر جھولا جھولنے لگے۔۔۔اور پھر اتنے نیچے اتر آئے کہ آگے جانے والی گاڑیوں کی بریک لائٹس دھندلی دھندلی نظر آ رہی تھیں۔۔۔قدرتی مناظر نے بادلوں کا گھونگٹ اوڑھ لیا۔۔۔ہم جس ماحول اور فضا کی تلاش میں آئے تھے وہ اب دیکھنے کو مل رہے ہیں۔۔۔گاڑی کی رفتار سست ہوگئی۔۔

کاش اس وقت ہم گاڑی کی بجائے باہر کھلی فضا میں ہوتے، میں ان بادلوں کو اپنے دوپٹے میں سمیٹ لیتی۔۔۔بیگم نے مسرور ہو کر کہا۔۔

ٹھیک کہتی ہو، پہلی بار ایسا موسم دیکھنے کو ملا ہے ورنہ اب تک تو اتنی گرمی رہی ہے کہ میرا بنیان پسینہ سے خشک نہیں ہوا۔

دھند بڑھ گئی۔۔۔کوسٹر کی ہیڈ لائیٹس روشن کر دی گئیں۔۔۔ڈرائیور، سڑک پر بچھی ہوئی سفید لین اور بلی آنکھوں پر اندازے کے مطابق گاڑی چلا رہا تھا۔۔۔ابھی شام کے سوا چھ بجے تھے مگر جانے مجھے اپنا شہر کراچی اور اس کی راتیں یاد آ گئیں وہاں لوڈ شیڈنگ کی وجہ سے بستیوں اور گلیوں میں ایسا ہی اندھیرا ہوتا ہے کہیں کہیں کسی کھڑکی سے جنریٹر کی آواز کے ساتھ ہی روشنی پھوٹتی دکھائی دیتی ہے یہاں بھی تھوڑے تھوڑے فاصلے سے کوئی بلڈنگ گذرتی ہے تو ہمیں روشنی نظر آ جاتی ہے۔۔۔کوسٹر نے کئی موڑ کاٹے۔۔۔اور پھر اچانک ایک جگہ گاڑی روک دی گئی۔

☆☆☆

فرسٹ ورلڈ ریزورٹ

ڈرائیور اپنی نشست سے اترا۔۔۔اس نے ہمارا دروازہ کھینچ کر کھولا۔۔۔
First World Resort۔۔۔۔۔Sir۔۔یہ آپ کا ہوٹل ہے۔۔۔اس کے بعد اس نے ایک کاغذ جیب سے نکالا۔۔۔Please یہاں دستخط کر دیجئے۔۔۔۔
کل آپ کو پروگرام کے مطابق گاڑی لینے آجائے گی۔۔۔
ابھی آپ واپس کوالالمپور جاؤ گے۔۔۔میں نے ڈرائیور سے پوچھا
Sir۔۔۔۔ڈرائیور نے اثبات میں جواب دیا۔۔۔۔۔ہم نے ڈرائیور کا شکریہ ادا کیا اس نے بھی دعا دی کہ ہم یہاں اچھا وقت گذاریں اور خوش رہیں۔۔۔

بیگم سامان کے ساتھ باہر آگئیں، کوسٹر روانہ ہو گئی، اور ہم سڑک سے فٹ پاتھ پر آگئے۔۔۔آس پاس کا جائزہ لیا۔۔۔یہ تو ایک نئی دنیا تھی۔۔۔ہزاروں نہیں تو سینکڑوں بھانت بھانت کے لوگ ہنستے مسکراتے چہلیں کرتے ادھر ادھر پھر رہے تھے۔۔۔چند ہماری طرح کے بھی تھے جو اس حیرت کدہ میں اپنی منزل تلاش کر رہے تھے۔ سر اٹھا کر اوپر دیکھا تو ہمیں پتا چلا کہ ہم تو ایک چھت کے نیچے ہیں۔۔۔۔یہ بالکل ویسا ہی بس اسٹاپ تھا، جیسا کہ کومتار ٹاور کی چھت کے نیچے تھا۔۔۔مگر یہ جگہ بارونق اور روشنیوں میں نہائی ہوئی تھی۔۔۔اگر یہ ہوٹل ہے تو اس کا دروازہ کہاں ہے۔۔کیونکہ اس عمارت کے بہت سے دروازے تھے۔۔۔اور لوگ اندر باہر آجا رہے تھے ہم چونکہ کوسٹر کی بائیں جانب سے اترے تھے اس لئے ہمارے سامنے کا علاقہ کھلا ہوا اور زیادہ روشن تھا۔۔۔ہم نے سڑک پار کر کے سیدھے ہاتھ کو دیکھا تو ایک ریستوران پر نظر پڑی بہت سے لوگ اندر کافی اور کولڈ ڈرنکس وغیرہ پینے میں مصروف تھے۔

ہمیں پہلے یہاں کمرہ حاصل کرنا تھا۔۔گو ہماری پہلے سے بکنگ تھی، لیکن کس سے معلوم کریں یہاں سینکڑوں لوگوں کا ہجوم ہے، بہر حال ہم اندر داخل ہوئے تو یہاں بھی عجیب منظر ۔۔۔ایک بہت بڑا ہال۔۔۔وہاں بہت سی کرسیاں بچھی ہوئیں۔۔۔ایک دوسرے سے بندھی ہوئی جیسے ہسپتالوں میں مریضوں کے لئے رکھی جاتی ہیں۔۔۔مگر لاتعداد۔۔کئی سو لوگ ان

پلاسٹک کی کرسیوں پر ایک طرف منہ کئے بیٹھے تھے۔۔۔ جیسے کوئی میچ دیکھ رہے ہوں یا کسی کی تقریر سن رہے ہوں ان کے سامنے بہت سے کاؤنٹر بنے ہوئے تھے اور ہر کاؤنٹر پر ایک دو مسافر کھڑے تھے۔۔ ہم نے اندازہ لگایا کہ انہی کاؤنٹرز سے ہمیں ہوٹل میں کمرہ لینا ہوگا۔۔۔ ہم سیدھے جس کاؤنٹر پر گئے وہاں ایک چینی حسینہ خوبصورت یونیفارم پہنے ایک مسافر سے ہنس ہنس کر باتیں کرتی ہوئی بڑی اچھی لگ رہی تھی۔۔۔ ہم نے پہلے مسافر کے ہٹتے ہی ہیلو کہا اور اپنا نامۂ اعمال اس کی طرف بڑھایا وہ مسکرائی اور کہنے لگی آپ کا Token نمبر کہاں ہے، ہم نے لاعلمی کا اظہار کیا تو اشارہ کر کے بتایا کہ سامنے کاؤنٹر سے اپنا ٹوکن نمبر لیں اور اپنی باری کا انتظار کریں۔

ہم واپس پلٹ آئے۔۔۔ اور متعلقہ کاؤنٹر پر پہونچے۔۔۔ انہوں نے ہماری بکنگ کے کاغذات کی پڑتال کی اور ایک چھپے ہوئے ٹوکن پر مہر لگا کر ہمیں دیا اور کہا کہ انتظار کریں جب آپ کا نمبر آئے تو متعلقہ کاؤنٹر پر پہونچ جائیں۔۔۔ ہاتھ کے اشارے سے بتایا کہ اس پر آپ کا نمبر آئے گا۔۔۔ ہم نے منہ پھیر کر دیکھا، ہر ستون پر ایک Digital پلیٹ لگی ہوئی تھی اور اس پر 812 کا نمبر چل رہا تھا۔۔۔ ٹوکن نمبر کے ساتھ کاؤنٹر نمبر بھی روشن ہو جاتا ہے۔۔۔ ہمارے ہاں بہت سے بینکوں، منی چینجرز کی دکانوں میں یہ طریقہ رائج ہے۔۔ اب بیگم کے پاس آئے جنہوں نے کرسیاں قابو کی ہوئی تھیں۔۔۔ ہم نے بیگم کو تفصیل بتائی انہوں نے ٹوکن نمبر دیکھ کر کہا کہ ہمارا نمبر 1072 ہے۔۔۔ اس انتظار میں رات گذر جائے گی۔ ابھی تو 822 نمبر چل رہا ہے۔۔۔ میں خود حیران تھا لیکن بیگم کو دلاسہ دیتے ہوئے کہا تم نے دیکھا یہاں 25 کاؤنٹرز ہیں، وہ کہہ رہا تھا کہ ایک گھنٹہ سے پہلے آپ کا نمبر آجائے گا۔

یہاں اتنے مسافر ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمارا نمبر آتے آتے ہوٹل کے کمرے ہی ختم ہو جائیں۔۔۔ ہر ہوٹل میں ایک کاؤنٹر ہوتا ہے مسافر وہاں بھی سینکڑوں ہوتے ہیں یہ کیسی ہوٹل ہے۔۔۔

میرے لئے بھی یہ تجربہ نیا تھا۔۔۔ بہر حال ہمارا کمرہ تو پہلے سے Book ہے۔۔ ہم کیوں پریشان ہوں۔۔۔ یوں بھی یہ 28 منزلہ عمارت ہے اور بے حد کشادہ اور بڑی ہوٹل ہے۔

اچھا آپ سامان کے ساتھ بیٹھیں، میں واش روم میں منہ ہاتھ دھو کر آتی ہوں، ہم بیٹھ گئے۔۔۔ یہاں تو ایک میلہ لگا ہوا تھا، دنیا کے شاید پچاسوں ملکوں سے لوگ آئے ہوئے تھے سب کے چہرے مہرے الگ۔۔۔ رنگ و روپ جدا۔۔۔ پہناوے بھی خاصے مختلف۔۔۔ زیادہ تر

لوگوں نے جینز۔۔۔شارٹس۔۔۔اپرز اور اسکرٹس پہنے ہوئے تھے ایک چیز مشترکہ تھی کہ سب کے ہونٹوں پر مسکراہٹیں۔۔۔اور چہرے خوشی سے تمتما رہے تھے۔۔۔اس بھیڑ میں باتوں اور قہقہوں کے علاوہ دو الفاظ عام طور پر سنائی دیتے تھے۔۔۔Excus me۔۔۔Thank you۔۔۔۔ہیلو ہائے کا استعمال بھی زیادہ تھا۔۔۔یہ اسی کرہ ارض کے لوگ تھے۔۔۔مختلف مذہب۔۔۔عقیدے اور۔۔۔نظریہ پر ایمان رکھنے والے مختلف قوموں اور ملکوں سے تعلق رکھنے والے۔۔۔مگر سب کا رویہ دوستانہ تھا۔۔۔یہ چھوٹی سی دنیا تھی محبتوں سے لبریز ایک دوسرے کے لئے کشادہ دل۔۔۔ایک دوسرے کے لئے ''دیدہ و دل فرش راہ''۔۔۔ایک چھوٹا سا ''گلوبل ولیج''

بیگم واپس آ گئیں۔۔۔میں تو فریش ہو گئی۔۔

کافی پیتے ہیں۔۔۔میں نے کہا۔۔۔

واش روم کے ساتھ ایک خوبصورت ریستوران ہے مگر ہم سامان کے ساتھ وہاں کیسے جائیں۔بیگم نے ہم سے پوچھا

اچھا آپ بیٹھیں۔۔۔میں آپ کے لئے کافی لے آتا ہوں۔ابھی تقریباً ڈیڑھ سو کے بعد ہمارا نمبر آئے گا۔

میں باہر نکلا۔۔۔پہلے اپنے لئے کافی لی۔۔۔لاؤنج سے باہر آیا جہاں کوسٹر نے ہمیں اتارا تھا۔۔۔یہاں لوگ سگریٹ پی رہے تھے۔۔۔دیوار کے ساتھ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ڈسٹ بن اور بڑے بڑے ایش ٹرے رکھے تھے۔کافی کے ساتھ سگریٹ پینے کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔۔۔لوگوں کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری تھا ہمارے سامنے دو تین بسیں آ کر رکیں اور ان میں چینی نوجوانوں کا ایک گروپ باہر آیا۔غالباً کسی کالج کے طلباء و طالبات تھے۔۔۔کئی سو بچوں کے آ جانے سے پورچ میں ایک اژدھام ہو گیا۔۔۔چوں چوں۔۔۔چی چی۔۔۔۔چی پی۔۔۔پی بانگ۔۔۔قسم کی آوازیں گونجنے لگیں۔۔۔اتنی بڑی تعداد میں نوجوانوں کے آ جانے سے کوئی ہنگامہ نہیں ہوا۔۔۔بہت منظم طریقہ اور مہذب انداز میں وہ ہنستے مسکراتے کندھوں پر اپنا سامان لٹکائے ایک جگہ جمع ہوئے اور پھر لاؤنج کے مختلف دروازوں سے گذر کر اندر چلے گئے۔

پورچ کے بعد اتنا بڑا ایک لاؤنج تھا جتنی بڑی ہوٹل کی لابی تھی۔پورچ کے قریب جو پتھروں کا کشادہ راستہ تھا وہاں پر بھی بڑے بڑے درخت لگائے گئے تھے جبکہ لاؤنج میں بھی قطار سے کئی بڑے

بڑے درخت ایستادہ تھے۔۔۔درختوں کا تنا، اتنا بڑا ہے کہ لڑکی بالیاں، ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر انہیں اپنی بانہوں میں لینا چاہیں تو مشکل ہو جائے۔درختوں کے تنوں میں جو موٹی موٹی شاخیں پھیلی ہوئی تھیں وہ دیکھنے میں اتنی مضبوط کہ ساون کے موسم میں جھولا ڈال کر اونچی اونچی اور لمبی لمبی پینگیں لی جا سکتی ہیں، لیکن یہاں ساون بھادوں کی کوئی اہمیت نہیں کہ بارہ مہینے ایک سا موسم رہتا ہے، یہاں کے درخت، پودے، خودرو گھاس اور پہاڑ تقریباً روز ہی غسل کرتے ہیں اور زمین سیراب رہتی ہے۔۔۔ یہ First World Resort ہے چونکہ بچوں اور نوجوانوں کے لئے بنایا گیا ہے اسی لئے ان کی پسند اور مزاج کے مطابق در و دیواروں کو رنگوں سے پوتا گیا تھا۔۔۔ہوٹل کا بیرونی حصہ بھی ہفت رنگوں سے دیدہ زیب ڈیزائن کے ساتھ سجایا گیا تھا۔۔۔سامنے ایک بہت بڑا نصف گنبد نما دائرہ بنایا تھا جس پر رنگ برنگی پٹیاں لگیں تھیں اس کے نیچے کا حصہ بھی مختلف رنگوں کی پٹیوں سے مزین تھا۔۔۔اس بے حد وسیع گنبد کے نیچے کار پورچ ہے۔دھند کم ہوئی تو دیکھا کہ تین طرف عمارتیں تھیں۔۔۔ایک طرف چوڑی سڑک سے گاڑیاں U-Turn کر کے آتی تھیں اور مسافروں کو اتار کر واپس چلی جاتی تھیں یہ اتنا بڑا حصہ دراصل ہوٹل کا پورچ تھا۔۔۔

میں نے بیگم کے لئے کافی لی۔۔۔واپس بیگم کے پاس آیا۔۔۔بیگم کے ساتھ والی کرسی پر گلدستہ رکھا تھا۔۔۔میں نے گلدستہ اٹھایا اور کرسی پر بیٹھ کر اسے اپنی گود میں رکھ لیا۔۔۔؟ گلدستہ کو۔۔۔!!۔۔۔اب ہمارا نمبر قریب آ رہا تھا۔۔۔اچانک Digital plate پر 1072 کا ہندسہ چمکا اور اس کے سامنے کاؤنٹر نمبر 14۔۔۔اتفاق سے ہمارے سامنے ہی تھا۔۔۔اور حسن اتفاق کہ اسی چینی حسینہ کی بارگاہ میں ہمیں پیش ہونا تھا، ہم خوش ہو گئے۔۔۔کاؤنٹر نمبر 14 پر پہونچے تو وہ ہمیں دیکھ کر ذرا زیادہ مسکرائی۔۔۔ہم نے بھی شکریہ ادا کیا اور اپنے تمام کاغذات اس کے سامنے کر دیئے۔۔۔ایک فارم پر کیا۔۔۔اس نے پاسپورٹ الٹ پلٹ کر دیکھا۔۔اور ایک Form ہماری طرف بڑھا دیا ہم نے فارم پر کیا اور چینی گڑیا کے سامنے کر دیا۔۔۔وہ مسکرائی اور ایک پلاسٹک جیکٹ میں Key Card رکھ کر بتایا کہ Tower no II کی لفٹ سے اپنے کمرے میں چلے جائیں۔۔۔یہ ناشتہ کے کوپن ہیں آپ صبح ڈائننگ ہال میں آ جائیں ڈائننگ ہال آٹھویں منزل پر ہے۔۔ہم نے سامان سمیٹا۔۔۔بیگم ایک بازو میں گلدستہ اور دوسرے کاندھے پر پرس لٹکا کر ہمارے ساتھ ساتھ چلنے لگیں۔۔۔اس عمارت کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔۔

Level 2B

Level 2A

Level 2

Level 1M

ہمیں اپنے کمرے میں جانے کے لئے Level B کے قریب لفٹ پکڑنی تھی ذرا دور چل کر ہم مطلوبہ جگہ پر پہونچ گئے ۔۔۔ یہاں ویٹر اور پورٹر کی سہولت میسر نہ تھی ۔۔۔ ہوسکتا ہے کہ طلب کرنے پر مہیا کی جاتی ہو ۔۔۔ ہمارا کمرہ نمبر 1805 تھا یعنی اٹھارویں منزل پر تھا ۔۔۔

بغیر کسی دشواری کے ہم کمرے میں پہونچ گئے ۔۔۔ اچھا ۔۔۔ صاف ستھرا اور کشادہ کمرہ تھا ہماری توقع سے زیادہ عمدہ باتھ روم ۔۔۔ اصل میں چیک ان ہوتے وقت مسافروں کی تعداد دیکھ کر ہمیں گمان تھا کہ یہاں کے کمرے بس واجبی سے ہونگے ۔۔۔ لیکن ایسا نہیں تھا ۔۔۔ پردہ ہٹا کر شیشے کی دیوار سے باہر دیکھا تو شیشے پر بیڈ روم کی دیوار پر لگے ہوئے روشن بلب کے عکس کے سوا کچھ نظر نہیں آیا ۔۔۔ دھند تھی ۔۔۔ اور نیچے کا منظر بادلوں میں چھپا ہوا تھا ۔۔۔ ہوٹل میں تمام ضروری سہولتیں موجود تھیں ۔۔۔ قبلہ کے رخ کی رہنمائی کے لئے چھت پر تیر کا اسٹیکر لگا ہوا تھا ۔۔۔ تھک گئے تھے اس لئے آرام کی نیت سے بستر پر لیٹ گئے ۔۔۔

دو گھنٹے آرام کے بعد ہم نے شاور لیا ۔۔۔ کپڑے تبدیل کئے اور First World Resort کو دیکھنے نکلے ۔۔۔ احمد شاہ نے بتایا تھا کہ آپ اگر تین دن بھی وہاں رہیں، تو پورے Resort کو اور اس کے آس پاس کے علاقہ کو نہیں دیکھ پائیں گے ۔۔۔ چند گھنٹوں بعد ہی ہمیں اندازہ ہوگیا کہ سارے Resort کو دیکھنا ہمارے لئے ممکن نہیں اور سچ پوچھو تو اس کی ضرورت بھی نہیں ۔ کہ ہر طرف نت نئی Rides کے ساتھ ایک سا ماحول تھا، کوئی بھی Visitor پہلی دفعہ یہاں آکر راستوں کو نہیں سمجھ سکتا حالانکہ سیاحوں کی آسانی کے لئے جگہ جگہ تیر کے نشانات کے ساتھ مختلف مقامات کی نشاندہی کی گئی تھی چھپے ہوئے خوبصورت نقشے بھی مہیا کئے گئے تھے لیکن انہیں سمجھنے کے لئے اسکاٹ لینڈ کے جاسوسوں یا 007 والے جیمز بانڈ کی ضرورت تھی ۔۔۔ ہم نہ جاسوس ہیں نا جیمز بانڈ ۔۔۔ بلکہ سچی بات تو یہ کہ ہمارے پاس تو کبھی کسی قسم کے بانڈز بھی نہیں رہے ۔۔۔ اس لئے یقین جانیئے گھنٹوں بھٹکتے رہے خود کار سیڑھیوں سے چڑھ کر Lift سے اترتے پھرے ۔۔۔ لکڑی کے تختوں کی مدد سے بنائے گئے پلوں سے گذرتے اور پھر وہیں

آپہونچتے جہاں سے روانہ ہوئے تھے۔۔۔ہم کافی دیر سے Indoor Theme Park کی سیر کررہے تھے۔۔۔ اس جگہ کئی سو دکانیں اور اس سے ذرا کم ہوٹلیں اور Cofee shop تھیں۔۔۔دنیا کی تمام مشہور Fast foods کی دکانیں موجود۔۔۔''انڈور تھیم پارک'' کے مختلف حصوں میں انتظامیہ نے بہت سی مشہور شخصیات اور بین الاقوامی شہریت کی حامل ٹاورز کے Replica بنائے ہوئے تھے، عمارتوں میں کوالالمپور کا ''ٹوئین ٹاور'' امریکہ کا مجسمۂ آزادی۔۔۔۔۔۔۔۔۔پیرس کا

'' ایفل ٹاور'' وغیرہ شامل تھے۔۔۔ گوتم بدھ اور ایک بدھ بھکشو کے مجسمے ایستادہ تھے۔۔۔یہ تمام چیزیں پندرہ بیس فٹ بلند تھیں۔۔۔۔شاید رام کا بھی مجسمہ تھا۔۔۔یہاں ڈاکٹر مہاتیر محمد کا مجسمہ نہیں تھا۔۔۔ایک وجہ تو یہ ہوسکتی ہے کہ وہ بفضل تعالی حیات ہیں۔۔۔شاید دو ہزار سال بعد یہاں ملائیشیا کے محبوب لیڈر کا مجسمہ نصب کیا جائیگا۔۔۔ کیونکہ جن کے مجسمے موجود تھے ان شخصیات کو اس دنیا سے رخصت ہوئے اتنا ہی وقت گذر چکا تھا۔۔۔ یہاں بیشتر چیزیں بچوں کی دلچسپی کی تھیں، اشیاء سے بھری دکانیں خواتین کے لئے پرکشش تھیں۔۔۔اور مردوں کے لئے ۔۔۔خواتین ۔۔۔ بیشتر خواتین مختصر مختصر یا برائے نام لباس میں تھیں، تقریباً سب کچھ کھلا تھا ۔۔۔عام طور پر مردوں کا تجسس ملبوس چیزوں پر زیادہ ہوتا ہے۔۔۔

یہاں وہ تمام کھیل کود اور Rides موجود تھیں جو بچوں کے پارک میں ہوتی ہیں۔۔۔ پرانے زمانے کے میلے ٹھیلوں میں جو جھولے ہوتے تھے وہ جدید شکل میں یہاں موجود تھے۔۔۔۔کہیں لوگ تیر سے نشانہ بازی کررہے ہیں۔۔۔۔کہیں بندوق سے غبارے پھوڑ رہے تھے، کہیں تیز رفتار رائڈز چل رہی تھیں کہیں بچے لکڑی کے گھوڑوں پر بیٹھے تھے، بعض پنجرہ نما جھولے میں بیٹھے تھے ۔۔۔گھومنے والے جھولوں میں چکر کاٹ رہے تھے اور چلا رہے تھے ۔۔۔۔رو رہے تھے اور ان کی چیخوں سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔۔۔کہیں کوئی مصور سامنے بیٹھے ہوئے شخص کا اسکیچ بنا رہا تھا کہیں پر کوئی نجومی، ہاتھ دیکھ رہا تھا۔۔۔۔اس بھیڑ میں یقیناً کچھ لوگ ''ہاتھ دکھا'' رہے ہونگے۔۔۔۔ایک شیشے والی دکان میں ایک خاتون کسی کی تحلیل نفسی کررہی تھیں۔۔۔ گویا نفسانفسی کا عالم تھا۔۔۔سب اپنے اپنے شوق کی تکمیل میں مشغول تھے۔۔۔۔شاید ہم دونوں میاں بیوی یہاں تماشائی تھے کیونکہ بیشتر مسافر اپنے بچوں کے ساتھ آئے ہوئے تھے۔

ہاں ایک نئی چیز دیکھی ۔۔۔ بیس تیس لوگ ایک اسٹال کے گرد جمع تھے ۔۔۔ ایک شخص ساکت و سامت بیٹھا تھا ۔۔۔ سانس روکے ہوئے ۔۔۔ پرانے زمانے میں جس طرح فوٹو کھچواتے وقت بیٹھا جاتا تھا ۔۔۔ کالے پردے میں منہ ڈال کر فوٹو گرافر بار بار آواز لگاتا تھا ۔۔۔ سیدھی طرف دیکھئے ۔۔۔ سانس روکیئے ۔۔۔ وہ تو اللہ کا شکر ہے کہ تصویر کھچوانے والا زیادہ دیر فوٹو گرافر کی ہدایت پر عمل نہیں کرتا تھا ۔۔۔ ورنہ اس آب وگل کی کل کل سے آزاد ہو کر دل ناتواں سے چھٹکارا پا کر یہاں سے وہاں پہونچ جاتا جہاں سے واپس کوئی نہیں لوٹتا بس ایک تصویر رہ جاتی ۔۔۔ جی ہاں ۔۔۔ وہ صاحب جانے کب سے ساکت بیٹھے تھے اور ان کے سامنے موم کی گڑیا بنانے والا لائق اور تجربہ کار فنکار موم سے ان کا مجسمہ بنا رہا تھا ہتھیلی پر رکھے ان کے آدھے جسم کو وہ بڑی مہارت سے تکمیل سے ہمکنار کر رہا تھا ۔۔۔ ہم بھی اس ہجوم میں شامل ہو گئے ناک نقشہ ہو بہو ۔۔۔ سر کے بال، قمیض کے کالر ۔۔۔ اور پھر دیکھتے دیکھتے اس نے ہونٹوں کے اوپر بالوں کی مونچھیں چپکا دیں ۔۔۔ اب ایک طرف اچھا بھلا آدمی اسٹول پر بیٹھا تھا اور دوسری طرف فنکار کی ہتھیلی پر اس کا موی مجسمہ ۔۔۔ اس کام کے ۔۔۔ یعنی سانس روک کر بیٹھنے کا معاوضہ 70 رنگٹ ۔۔۔ پورا موی مجسمہ بنوانا ہو تو 100 رنگٹ ۔۔۔ ہم فنکار کی مہارت پر حیرت زدہ رہ گئے ۔۔۔ اور اسے داد دیئے بغیر نہ رہ سکے ۔۔۔ کیونکہ مجسمہ، ہو بہو اسی شخص کا تھا جس نے 70 رنگٹ دیئے تھے۔

اب ہم تھک گئے تھے ۔۔۔ ہمیں ایسی ہوٹل کی تلاش تھی جہاں پاکستانی کھانے مل سکے ۔۔۔ ایک جگہ ٹھہر کر ہم نے ہوٹل کا نقشہ پھیلایا ۔۔۔ نقشہ میں آٹھویں فلور پر دنیا کے مختلف کھانوں کی ہوٹلیں دکھائی گئیں تھیں ۔۔۔ عرب، ترکی، ویت نام، میکسیکو اور دیگر ممالک کے ساتھ انڈین کھانے کی بھی ہوٹل تھی ۔۔۔ پوچھتے پوچھتے ہم ایک لفٹ سے آٹھویں منزل پر پہونچے ۔۔۔ یہاں چھوٹی چھوٹی صاف ستھری ہوٹل نما دکانیں اور ان کے سامنے خوبصورت فرش پر میز کرسیاں پڑی تھیں سب سے آخری والی دکان انڈین ریسٹورنٹ تھیں ۔۔۔ سبزی، ترکاری، مچھلی اور چاول کی ڈشیں سامنے کاؤنٹر پر رکھی تھیں ہم نے روٹی کا پوچھا ۔۔۔ تو جواب ملا ۔۔۔ ختم ہو گئیں ۔۔۔ ہم نے پوچھا ۔۔۔ حلال ۔۔۔ لڑکے نے اثبات میں جواب دیا ۔۔۔ ہم نے پھر یوں کیا کہ مچھلی، سبزی اور چاول کا آرڈر دیا ۔۔۔

کھانا کھا کر نکلے تو یہاں ایک بڑے حصے میں سینکڑوں میزیں لگی ہوئی تھیں اس کے گرد

بلاشبہ ہزاروں کرسیاں تھیں۔۔۔ بہت سے دروازے تھے، مگر سب بند تھے۔۔۔ متعدد ویٹرز کام میں مصروف تھے۔۔۔ ہم نے اندازہ لگا لیا کہ صبح ہمیں اسی ڈائننگ ہال میں آنا ہے۔۔۔ رات کافی ہو چکی تھی اب Resort کی سرگرمیاں ماند پڑ رہی تھیں۔۔۔ دھیرے دھیرے دکانیں بند ہو رہی تھیں۔۔۔ ہمارا اصول ہے کہ بھرا میلہ چھوڑ کر آجاتے ہیں کیونکہ جانتے ہیں کہ دیر سے آنیوالوں کے چہروں پر جانیوالوں کے قدموں کی دھول جم جاتی ہے۔۔۔

کمرہ میں آئے۔۔۔ T.V آن کیا۔۔۔ وہی نہ سمجھ میں آنے والے غیر دلچسپ چینل۔۔۔ آرام دہ بستر پر لیٹے لیٹے جانے کب سو گئے۔

صبح اٹھے..... پردہ اٹھا کر باہر کا منظر دیکھا..... تو لطف دوبالا ہو گیا..... مزاج میں تازگی اور دل میں بالیدگی اتر آئی..... تازہ تازہ سورج دھندلے دھندلے اجالوں کے ساتھ طلوع ہوا..... بادل اور دھند نہیں تھی۔ اٹھارہویں منزل سے میلوں دور تک حسین مناظر آنکھوں کے راستے یادوں کی باؤلی میں اترتے رہے..... ہم مبہوت کھڑے سرسبز و شاداب پہاڑوں کو، ہر طرف بکھری ہوئی شاہراہوں کو..... اور ہرے بھرے درختوں کو دیکھتے رہے..... یہ وہی راستے تھے جن سے گزر کر ہم یہاں پہنچے تھے۔ مگر بلندی سے قدرت کے حسن کو دیکھنے کا اپنا ایک علیحدہ لطف ہے۔ بستر سے اٹھ کر ہی طبیعت تروتازہ ہو گئی۔ ایک اچھی صبح..... ایک یادگار صبح اور نابھلانے والی خوشگوار صبح..... باہر ہماری منتظر تھی۔

جلدی کریں۔ ناشتہ کرنا ہے..... ہزاروں لوگ ہوں گے۔ آج جانے کچھ کھانے کو ملتا بھی ہے یا نہیں۔ بیگم ناشتے کے بارے میں فکرمند تھیں۔

بھئی آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں۔ ناشتہ کرانا ہوٹل انتظامیہ کی ذمہ داری ہے۔ ان سے زیادہ کسے پتا ہوگا کہ آج رات ان کے ہوٹل میں کتنے مسافر ٹھہرے ہیں۔

اس بات کو چھوڑیں، ہمارے یہاں شادی بیاہ کی تقریبات میں ضرورت سے زیادہ کھانا ہوتا ہے، لیکن جب کھانا کھلتا ہے تو لوگ ٹوٹ پڑتے ہیں۔ جیسے ہفتوں بعد کھانا نصیب ہو رہا ہے۔ مردوں کو چھوڑیئے..... میں نے پڑھی لکھی، خوشحال اور شہر کی مشہور خواتین کو دیکھا ہے کہ اپنی پلیٹ پر کھانوں کا پہاڑ کھڑا کر لیتی ہیں۔

ٹھیک ہے!! لیکن اس کا سبب بدنظمی یا بے صبری نہیں..... وقت ہے۔ آپ کسی تقریب میں دس بجے کھانا کھول دیں۔ لوگ آتے جائیں گے..... اطمینان سے ڈنر دیکھیں گے.....

اپنی پسند کی تھوڑی تھوڑی چیزیں نکالیں گے.....اور سکون واطمینان سے گھر کی ڈائننگ ٹیبل سمجھ کر کھانا کھائیں گے۔ ناضرورت سے زیادہ لیں گے نا کھانا ضائع کریں گے۔ لیکن تم خود سوچو جب دس گیارہ بجے سے آئے ہوئے مہمان رات ڈیڑھ بجے تک کھانے کا انتظار کریں گے تو بھوک کا کیا عالم ہوگا !! دوسروں کی شکایت کیا کریں ہم خود ڈشوں کے نیچے بتی روشن ہونے کے بعد اسٹارٹنگ پوائنٹ پر یعنی اپنی جگہ چوکنا ہو جاتے ہیں.....اور کولڈ ڈرنکس کی بوتلوں کے ڈھکن کھلنے کی آوازوں پر اپنی کرسی سے اٹھ کر ٹہلتے ہوئے ''بوفے ٹیبل'' کے قریب پہنچ جاتے ہیں اگر میزبان کی درخواست کے بعد ڈشوں کے ڈھکنے کھلنے کی شناسا کھڑکھڑاہٹ سنیں اور آرام سے اٹھ کر نپے تلے قدموں سے بوفے تک پہونچیں اور اس کے بعد تمام ڈشوں کا جائزہ لیں اور اپنی پسند کا انتخاب کریں پھر سفید چمٹے سے احتیاط کے ساتھ مرغی کی ٹانگ اور سینے میں سے کسی کا چناؤ کریں.....اتنی دیر میں تو بیگم میلہ لٹ جاتا ہے.....پھر کارزار کام و دہن میں کس کو کس کا یارا.....آپ ذرا چوکے تو ٹھنڈی بوتل بھی ہاتھ سے گئی.....تجربہ کار مہمان، جلدی کرنے میں چوک جائیں تو وہ الٹا عمل کرتے ہیں.....یعنی پہلے سوئٹ ڈش پر ہاتھ صاف کرتے ہیں پھر بھیڑ میں شامل ہو کر اپنے بازو کو مہمانوں کے اوپر سے نیچے لا کر تکہ بوٹی جو ہاتھ لگے ہاف پلیٹ میں رکھ لیتے ہیں اور یوں بمشکل شکم سیر ہو کر گھر آتے ہیں.....سب جانتے ہیں کھانا بہت ہے.....ہر گز

کم نہیں پڑے گا.....مگر مہمانوں کو اپنے گھر بھی جانا ہے.....ذاتی سواری نہیں تو ٹیکسی بھی پکڑنی ہے.....ڈیڑھ دو بجے انتظار کرتے کرتے اس کی شائستگی، اس کی بردباری، اس کی احتیاط پسندی تو برف کے ڈلے کی طرح پگھل جاتی ہے.....اب وہ مہمان نہیں.....بھوکا ہوتا ہے.....اور بھوکا آدمی کسی اخلاقیات کا پابند نہیں ہوتا.....آپ وقت پر کھانا شروع کر کے دیکھیں۔۔۔۔ لوگ کس قدر خوش سلیقگی اور شائستگی کا مظاہرہ کرتے ہیں.....اگر یہاں بھی آپ ناشتہ آٹھ بجے سرو کرنے کے بجائے بارہ بجے تک انتظار کرائیں گے تو یہی مہمان، یہی سیاح اور سافر جو جھک جھک کر بار بار رکوع میں جاتے ہوئے تھینک یو تھینک یو کہتے نہیں تھکتے اس ہوٹل کو تہس نہس کر دیں گے۔سب لوگ مہذب ہوتے ہیں مگر ایک خاص حد تک۔

چلئے خیر اللہ مالک ہے.....باتوں باتوں میں اتنا وقت گنوا دیا.....بیگم نے دروازے کی طرف بڑھ کر کہا۔

ہم آٹھویں منزل پر آئے.....حیران رہ گئے.....اس وقت کم وبیش ڈیڑھ ہزار لوگ تو ہوں گے.....سینکڑوں میزوں کے گرد چہل پہل تھی.....داخلے کے لئے کئی دروازے تھے.....ہم اپنا کوپن دکھا کر اندر چلے گئے.....Bayview ہوٹل جیسا تو نہیں لیکن ناشتہ کا پُرتکلف اہتمام تھا.....تمام ضروری چیزیں موجود تھیں.....ڈشز بھری ہوئی تھیں.....سینکڑوں ملازمین ایک ''میکانکی معمول'' کی طرح سرگرم اور متحرک تھے۔dishes اور juices سے بھری بے آواز ٹرالیاں گردش میں تھیں.....ادھر کھانے کی کوئی چیز کم ہوئی.....پلک جھپکتے ہی اسے بدل دی.....جوس کا مگ خالی ہوا اسے تبدیل کر دیا.....مسافر بڑے اطمینان سے پسند کی چیزیں لے کر میز پر جا بیٹھے.....خالی پلیٹ چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے.....بوفے کی میز تک آتے.....نئی پلیٹ میں نئے کھانے لیتے اور اپنی میز پر جا بیٹھتے.....ان کے آنے سے پہلے پرانی پلیٹ اٹھالی جاتی تھی.....کوئی ہنگامہ نہیں.....کوئی عجلت نہیں.....کوئی شور وغل نہیں..... چھینا جھپٹی نہیں۔۔۔ہم ڈائننگ روم میں داخل ہوئے۔۔۔پہلے ہم نے اطمینان سے ایک خالی میز کا انتخاب کیا.....پھر اٹھ کر دو گلاس جوس لے کر میز پر رکھ دیئے.....پھر بچلوں کی طرف آئے.....اپنی پسند سے پلیٹ بھری اور میز پر آ کر ناشتہ کا آغاز کیا.....یوں آرام آرام سے قسط وار کھانے پینے کی چیزیں لیتے رہے.....پیٹ بھر گیا تو کافی لے آئے.....لوگ آتے رہے.....شکم سیر ہو کر جاتے رہے۔

اتنی بڑی تعداد میں لوگوں کو ناشتہ کرتے دیکھنے کا ہماری زندگی میں یہ پہلا منظر تھا.......

بلاشبہ ہوٹل انتظامیہ مبارکباد کی مستحق ہے....... ہم جب ڈائننگ ہال سے نکل رہے تھے......اس وقت بھی...... تمام یعنی تقریباً پچاسوں dishes کھانوں سے بھری ہوئی تھیں۔

ناشتہ کر کے ہم لابی میں آئے indoor theme park ہم کل رات دیکھ چکے تھے۔ ابھی resort کی دوسری جانب outdoor theme park دیکھنا باقی تھا۔لیکن ہم پہلے ہوٹل سے نکل کر کھلی فضا میں قدرتی مناظر دیکھنا چاہتے تھے۔لابی سے لاؤنج میں آئے پھر کار پورچ میں آگئے۔ایک طرف ہمارے سامنے ہوٹل کا دوسرا حصہ تھا جبکہ الٹے ہاتھ کو باہر جانے کا راستہ تھا۔ جہاں ہلکی دھوپ ہمارا انتظار کر رہی تھی....... ہم باہر نکلے....... یہاں بہت خوبصورت چھوٹا سا پارک بنا ہوا ہے۔گول دائروں کے اندر خوشنما پھول کھلے تھے.......اس کے اندر ایک اور گول دائرہ ہے....... جہاں سرو کے پیڑوں کے مشابہ چھوٹے پیڑ تھے۔یہ دراصل پتوں والے سبز درختوں کو تراش کر بنائے گئے تھے۔گول دائروں کی صاف ستھری منڈیر سیاحوں کے بیٹھنے کے لئے تھی....... اس کے ساتھ ہی شیشوں کی دیواروں سے coverd راہداری بنائی تھی۔ یہاں چونکہ بارش ہوتی رہتی ہے.......اس لئے ہوٹل انتظامیہ نے لاؤنج سے بس اسٹاپ تک یہ covered راہداری بنائی ہے تاکہ ہوٹل سے نکلنے والے مہمان بارش میں بھیگے بغیر بس اسٹاپ کے شیڈ تک پہونچ جائیں۔ اس راہداری کے ساتھ چھوٹی چھوٹی ٹک شاپس اور سوینیئر شاپس ہیں.......ہم نے باہر نکلنے کے لئے راہداری کا انتخاب کیا۔بس اسٹاپ پر پہنچے تو قطار سے سینکڑوں بسیں پارک تھیں،جن بسوں کی روانگی کا وقت مقرر تھا وہ قریب کھڑی تھیں اوران کی پارکنگ لائیٹس روشن تھیں۔کار پارکنگ کے لئے وسیع رقبہ موجود تھا جہاں لاتعداد گاڑیاں کھڑی تھیں۔بس اسٹاپ سے گذر کر ہم مرکزی سڑک کی فٹ پاتھ پر آگئے۔یہاں ایک پیٹرول پمپ ہے....... کھلی فضا میں آئے تو موسم بہت خوشگوار تھا.......اگر ہم رات کو یہاں آتے تو بغیر گرم کپڑے پہنے چند منٹ بھی نہیں ٹہیر سکتے تھے ٹھٹر ٹھٹر کر ہم دونوں اردو کے ۷۷ کے ہندسے کی صورت بمشکل تمام اپنے کمرے میں پہونچتے۔۔۔خیر ہم نے آس پاس کا جائزہ لیا۔۔۔کسی پہاڑی علاقے میں سڑکوں کے ساتھ اتنی وسعت اور کشادگی ہم نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی۔ ہمارے چاروں طرف نشیب وفراز سبزہ میں ڈھکا ہوا تھا۔ صرف مختلف اطراف میں جانے والی صاف ستھری سڑکیں تھیں۔بسوں اور دیگر گاڑیوں کی آمد و رفت شروع ہوچکی تھی۔صبح کا وقت تھا.......آس پاس کی ہر چیز ٹھہری ہوئی تھی.......درخت اور

پودے مؤدب کھڑے تھے..... ہوا بھی دبے دبے پروں سے درختوں کو چومتی ہوئی گزر رہی تھی..... وہ جانتی تھی کہ یہ عبادت کا وقت ہے..... باہر نکل کر ہم نے اندازہ لگایا کہ فرسٹ ورلڈ ریزروٹ میں نوجوان آتے ہیں یا والدین اپنے بچوں کے ساتھ یہاں قیام کرتے ہیں..... یہ وادی اپنے قدرتی حسن کے اعتبار سے بے حد خوبصورت ہے اس لئے یہاں درجنوں بڑے بڑے ہوٹل ہیں۔

ہمیں اگر پہلے سے اس Resort کے بارے میں معلومات ہوتیں تو شاید کسی اور ہوٹل میں قیام کرتے تاکہ آس پاس کے قدرتی مناظر سے ہمہ وقت لطف اندوز ہوتے رہتے۔ پھر یوں ہوا کہ سورج بادلوں کی اوٹ میں چھپ گیا..... دھوپ کی ہلکی ہلکی تمازت کم ہوگئی..... منظر اور بھی خوبصورت ہوگیا۔

ٹہلتے ٹہلتے ہم ذرا آگے بڑھے۔۔۔ سڑک کے کنارے ڈیڑھ فٹ اونچی حفاظتی دیوار بنی ہوئی تھی۔۔۔ دیوار کے اوپری حصہ پر سیمنٹ کا پلاسٹر کیا گیا تھا۔۔۔ ہم اسی دیوار یا منڈیر پر بیٹھ گئے۔۔۔ ایک سڑک بل کھاتی ہوئی نیچے جارہی تھی۔۔۔ یوں ہمارے نیچے جو سڑک تھی اس کے کنارے ایک بڑا سا گیس اسٹیشن تھا، اس جگہ بیٹھ کر ہم پر فضا موسم کا مزہ لیتے رہے پہاڑوں کے دامن میں کالے سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی مختلف سڑکیں تھیں۔۔۔ تمام سڑکیں دھلی ہوئیں..... ان پر سفید رنگ کی لین مارکنگ..... کھمبوں پر ٹریفک کے نشانات..... ہزاروں سیاحوں کی یہاں ہر وقت آمد و رفت..... مگر آس پاس دور و نزدیک کوئی پلاسٹک کی تھیلی..... خالی شاپنگ بیگ..... سگریٹ کا پیکٹ..... پان کی پڑیا..... ماچس کی ڈبیا..... پھٹے پرانے اڑٹے کاغذوں کے ٹکڑے..... ہم نے سوچا اگر کراچی سے کچرا چننے والے بچے یہاں آجائیں تو بے چارے بھوکوں مرجائیں..... ایسی بھی کیا صفائی کہ سڑک پر چلتے ہوئے بھی ڈر لگے کہ کہیں جوتوں کے نشانات نہ پڑ جائیں..... چلو شہروں میں تو یہ اہتمام اور احتیاط کسی حد تک درست ہے..... لیکن پہاڑی علاقہ میں تو سیاح خوش ہونے آتا ہے..... پابندیوں سے آزاد ہونے کے لئے آتا ہے..... آرام کرنے آتا ہے..... زندگی کو سہل بنانا چاہتا ہے..... سکون چاہتا ہے..... لیکن ہم کافی دیر سے سگریٹ کا بجھا ہوا ٹکڑا انگلیوں میں دبائے کھڑے ہیں..... اب اسے پھینکنے کے لئے واپس ہوٹل جائیں جہاں ڈسٹ بن رکھے ہیں۔ یا یہیں سڑک کنارے پھینک کر ان دیکھے پولیس والے کے ہاتھوں اپنی گرفتاری دے دیں۔

اب ہلکی ہلکی ٹھنڈ محسوس ہو رہی تھی.....اور ہمیں آؤٹ ڈور تھیم پارک بھی دیکھنا تھا.....
اس لئے ہم واپس چڑھائی چڑھتے ہوئے ہوٹل کی طرف بڑھے۔ ہوٹل کے صدر دروازے کے ساتھ تھیم پارک جانے کا راستہ ہے۔ ہمیں یہاں سے بھی مختلف قسم کی rides نظر آ رہی تھیں.....
انڈور پارک کے مقابلے میں آؤٹ ڈور پارک زیادہ وسیع تھا۔ چیئر لفٹ چل رہی تھی.....ہم اندر داخل ہوئے یہاں ہر ride کے لئے الگ ٹکٹ ہے۔ مونوریل بھی تھی، tea cup میں بھی لوگ بیٹھے بیٹھے چل بھی رہے تھے اور چکر بھی کاٹ رہے تھے۔ ایک طرف pirate train چل رہی تھی.....سامنے ایک چھوٹی سی جھیل میں ''بچہ کشتیاں'' چل رہی تھیں۔ یہ سب بچوں کے لئے تھیں.....نوجوانوں کے لئے بھی ان میں بہت سی چیزیں ہیں.....جو زیادہ جدید اور تیز رفتار ہیں۔

Thrill Rides استعمال کرنا تو اپنی جگہ انہیں دیکھنے کے لئے بھی ہمت کی ضرورت ہے۔ یہاں لوگوں کا خاصا ہجوم تھا۔ مشینوں کی آوازوں سے زیادہ rides پر بیٹھے ہوئے بچوں اور بڑوں کے چیخنے اور چلانے کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ ہم نے سوچا کہ چیخنے چلانے کا اتنا ہی شوق تھا تو اپنے گھر سے اتنی دور کیوں آئے۔

صرف ایک چیز ہم نے پہلی بار دیکھی۔ Flying Dragan.....اونچی کرسی نما نشست میں سوار کو کئی طرف سے اچھی طرح کس کر belt باندھ دی جاتی ہیں.....پھر یہ کھیل شروع ہوتا ہے.....رفتار خاصی تیز ہوتی ہے.....اوپر.....نیچے.....دائیں بائیں وہ تیزی کے ساتھ ریل پر گھومتا رہتا ہے.....یہاں تک تو ٹھیک ہے.....لیکن اچانک وہ چکر کاٹنے لگتا ہے.....
جیسے رولر سے چپکی ہوئی چیزیں چکر کاٹتی ہیں.....خاصا دل دہلانے والا منظر ہوتا ہے.....یہاں تقریباً ۳۵ قسم کی rides ہیں.....ہم نے دور کھڑے سارے تماشے دیکھ لئے.....ہماری روانگی کا وقت قریب تھا.....اس لئے کچھ اجنبی اور کچھ دیکھے بھالے راستوں سے گزرتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف جا رہے تھے کہ ایک تیر کے نشان نے ہمیں اپنی جانب متوجہ کیا۔ اس پر لکھا تھا casino ہم نے سن رکھا تھا کہ فرسٹ ورلڈ ریزورٹ پہلی جگہ ہے جہاں سرکاری طور پر جوا کھیلنے کی اجازت ہے۔۔۔۔ایک تو ہمیں اس بات پر حیرت ہوئی کہ جوا کھیلنے کے لئے اجازت کی کیوں ضرورت پیش آئی۔۔۔۔یہ تو ممنوعات میں سے ہے۔۔۔جیسے۔۔۔۔ڈاکہ۔۔۔قتل۔۔چوری۔۔۔۔بھلا کسی مہذب معاشرہ میں چوری کی اجازت دی جا سکتی ہے؟۔۔۔۔ہمارے ملک میں تو

ان کاموں کی قطعاً اجازت نہیں ہے۔۔۔ ہر نئی حکومت اور پولیس کا سربراہ اپنے پہلے بیان میں اس بات کو دہراتا ہے کہ کسی بھی قسم کے جرائم کرنے کی اجازت نہیں دی جائیگی۔۔۔ حتیٰ کہ ہمارے ملک میں تو دہشت گردی کی بھی اجازت نہیں ہے۔۔۔ اور پھر جوا کھیلنے کے لئے اجازت کی کیا ضرورت ہے۔۔۔ اپنی رقم ٹھکانے لگانی ہے یا جوا کھیلنے کا شوق پورا کرنا ہے تو جوتی اچھال کر یہ کام کرلو۔۔۔ سکہ اچھال کر ہار جیت کا فیصلہ کرلو۔۔۔ ہمارے ملک میں تو کرکٹ میچ کے دوران ایمپائر سکہ اچھال کر جب Toss کرتا ہے تو لوگ جوئے کی بازی لگا لیتے ہیں۔۔۔ انہیں تو کسی قسم کی اجازت کی ضرورت نہیں، بہت سے لوگ ہوٹل کی میز پر سکہ رکھ کر جوا کھیلتے ہیں، آس پاس والوں کو بھی پتہ نہیں چلتا، جوئے باز طے کر لیتے ہیں کہ جس کے سکے پر پہلے مکھی بیٹھے وہ جیت گیا، پھر مانگ پتہ ہے۔۔۔ اندر باہر ہے۔۔۔ رمی اور فلیش تو قدیم طریقہ ہے، تاش کے 52 پتے اور اس سے کہیں زیادہ اس کے کھیل ہمارے ملک میں رائج ہیں ہارنے اور جیتنے کے لئے سب سے بڑا اور مہذب طریقہ ڈالر کا بڑھنا اور اسٹاک ایکسچینج کا گرنا ہے۔۔۔ اب تو لوگ شکر، آٹا اور پیٹرول کی قیمت پر جوا کھیلتے ہیں۔۔۔ بھلا اس کام کے لئے اپنا گھر بار اور کاروبار چھوڑ کر آپ اس ہوٹل میں آئیں۔۔۔ دل نے سوچا جوئے کھیلنے کا کوئی خاص طریقہ ہوگا۔۔۔ اتنی دور آئے ہیں چلو ایک نظر دیکھتے چلیں۔۔۔

خودکار سیڑھیوں سے کوئی دس بار اوپر چڑھے تب جا کر Casino پہونچے۔۔۔ پورا فلور شاید اس کام کے لئے مختص ہے۔۔۔ ہوٹلیں۔ دکانیں اور سونیر شاپس یہاں بھی بہت ہیں۔۔۔ مختلف کمروں میں لوگ مشینوں کے سامنے بیٹھے تھے۔۔۔ جیسے ہمارے شہر کی مختلف گلیوں میں بچے کمپیوٹر games کھیلتے ہیں۔۔۔ ادھر ادھر کئی کمروں میں جھانک کر دیکھا۔۔۔ ہمیں کھلاڑی آمنے سامنے جوا کھیلتے نظر نہیں آئے۔۔۔ ہم تو لاس ویگاس بھی گئے تھے۔۔۔ سیزر۔۔۔ اور تاج محل نامی Casinos بھی گئے۔۔۔ وہاں ایسی مشینیں بھی ہیں مگر لوگ واقعی جوا کھلتے ہیں تاش کے پتوں کے ساتھ۔۔۔ مگر یہاں ہم نے باقاعدہ روایتی جوا کھیلتے کسی کو نہیں دیکھا۔۔۔ سخت مایوسی ہوئی۔۔۔ ہوسکتا ہے کہ بند کمرے میں کوئی بڑے پیمانے پر جوا ہو رہا ہو۔۔۔ اور ہم جیسے ''تھرڈ لے'' تماشبینوں کو اس لئے وہاں جانے کی اجازت نہ ہو کہ لاکھوں رنگٹ کے ہارے اور جیتنے کے عمل کو دیکھ کر وہیں ڈھیر نہ ہو جائیں اور منتظمین کو ایمبولینس کی سہولت مہیا کرنی پڑے۔۔۔

ہم اپنے کمرے میں آئے سامان سمیٹا۔۔۔گلدستہ Good gasture کے طور پر بیگم نے ہوٹل ہی میں چھوڑ دیا۔۔۔حالانکہ ابتک ویسا ہی تروتازہ تھا ۔۔۔کہنے لگیں اب بچوں کو گود میں اٹھانے کی عادت نہیں رہی۔۔۔۔میں کہاں کہاں اسے لئے پھرونگی۔۔۔لیکن چلنے سے پہلے بیگم نے یادگار کے طور پر گلدستہ کا فوٹو بنالیا۔۔۔بالکل اسی طرح جس طرح ہمارا بھائی مظہر، بقرعید سے ایک دن پہلے، قربانی کی گائے کا فوٹو اتار لیتا تھا۔۔۔اب برسوں سے مظہر امریکہ میں ہے مگر سنا ہے کہ اب بھی کوشش کر کے وہ بکرے کی تصویر ضرور اتارتا ہے۔۔

اسی کاؤنٹر، یعنی کاؤنٹر نمبر 14 پر ہم گئے ۔۔۔۔وہی چینی گڑیا آج بھی اسی جگہ بیٹھی تھی، ہمیں خیال آیا شاید ہمارے انتظار میں اسی وقت سے بیٹھی ہے کیسی اچھی میزبان ہے، رات بھر جاگتی رہی اور ہمیں بتایا بھی نہیں، ہم کس قدر لاپرواہ مہمان ہیں کہ ریزورٹ کی رنگ وروشنیوں اور ہاؤ ہو میں ایسے بے خود ہوئے کہ ایک بار بھی پلٹ کر اس کاؤنٹر پر نہیں آئے۔۔۔میں نے Key cards واپس کئے، اپنائیت اور وارفتگی سے مسکرائی (ہمیں ایسا ہی لگا) بولی!۔۔۔آپ کو کوئی زحمت تو نہیں ہوئی، پھر آیئے گا ہم آپ کی اور خدمت کریں گے۔۔۔ہم نے چاہا کہ جواب میں کہیں، پھر کہاں آنا نصیب ہوگا ہم حاضر ہیں، جس طرح چاہیں خدمت کریں۔۔۔جیسے بھی ہیں، جس لائق بھی ہیں۔۔۔۔لیکن اتنے بڑے مکالمے کو انگریزی میں ادا کرنے کے لئے جتنی انگریزی ہمارے پاس تھی وہ خرچ ہو چکی تھی یوں بھی مسافر کے پاس سفر سے لوٹتے وقت اندوختہ ختم ہو جاتا ہے اور سچ بات تو یہ ہے کہ سفر کے شروع سے ہمارے پاس سوائے سگریٹ کی ڈبیا اور لائیٹر کے اور کچھ تھا ہی نہیں سب بیگم کے پرس میں تھا۔۔۔وہ خالی ہو تب بھی قیمتی کہ Gucci کمپنی کا تھا

سفر کے دوران صرف سگریٹ لائیٹر خریدا تھا کہ ہمارا اپنا لائیٹر تو کراچی ائیر پورٹ میں Security والوں نے ضبط کر لیا تھا۔۔

ہم نے ایک بار پھر چودھ نمبر کے کاؤنٹر کے پیچھے ا۔ٹول پر بیٹھی ہوئی چینی گڑیا کو دیکھا اور فلمی ہیرو کی طرح، اپنی محبوبہ سے آخری ملاقات کے بعد بچھڑنے کا تاثر دیا اور دوبارہ مڑ کر بھی دیکھا۔۔۔مگر وہ نئے مسافر کے ساتھ نئے رومان میں مصروف تھی۔۔۔اگر ایک بار بھی نظر اٹھا کر ہمیں جاتے ہوئے دیکھ لیتی تو ہم احمد فراز کے درج ذیل شعر کو اپنے جذبات کی عکاسی کے لئے پیش کر دیتے۔

اسے فراز اگر دکھ نہ تھا بچھڑنے کا
تو کیوں وہ دور تلک دیکھتا رہا مجھ کو

ہم باہر لاؤنج میں آئے۔۔۔وقت سے پانچ منٹ پہلے AOS کی کوسٹر پارکنگ میں ہمارا انتظار کر رہی تھی۔۔۔ہم گاڑی میں بیٹھ گئے، وہی مناظر۔۔۔مسحور کر دینے والی فضا ۔۔۔سورج جو کچھ دیر پہلے تک ہمارے سروں پر چمک رہا تھا۔۔۔وہ بادلوں کی اوٹ میں چھپ گیا ۔۔۔بارش تو اب تک کہیں نہیں ملی لیکن جینٹنگ ہائی لینڈ میں ہمیں موسم بہت خوبصورت ملا۔۔۔ آتے وقت ہم بادلوں میں سے گذر کر ہوٹل پہونچے تھے۔۔۔ڈرائیور نے بتایا کہ فرسٹ ورلڈ ریزورٹ سے کوالالمپور 60 کلومیٹر پر ہے۔۔۔کل ہم ائیر پورٹ سے سیدھے یہاں پہونچے تھے۔۔۔اب ملائیشیا کے دارلحکومت کی طرف جارہے ہیں، جہاں سنا ہے کہ دنیا کی بلندترین عمارتوں میں سے ایک عمارت ہے''ٹون ٹاور''۔۔۔خاموشی سے سفر جاری رہا۔۔۔ہم اب اترائی کی طرف جارہے تھے۔۔۔دونوں طرف ہرے بھرے پہاڑ کھڑے تھے۔۔۔یہاں راستہ بھی ذرا تنگ ہوگیا تھا۔۔۔شمالی علاقہ جات کی سڑکوں میں سفر کے دوران ہمیں کہیں کہیں بلندی سے پانی گرتا دکھائی دیتا ہے اور کہیں پہاڑوں کے اوپر بنے ہوئے گھروں کے لئے سانپ کی طرح بل کھاتی پگڈنڈی نظر آتی ہے۔۔۔یہاں پگڈنڈی کی بجائے سیڑھیاں بنا دی گئیں تھیں اور ان کے ساتھ ساتھ لوہے کی ریلنگ بھی لگی ہوئی تھی کہ اوپر چڑھنے والوں کو سہارا مل جائے۔۔۔اس طرح بارش کے پانی کی نکاسی کے لئے پکی نالیاں بنائی گئیں تھیں۔۔۔تاکہ پانی خود اپنا راستہ بناتا ہوا پہاڑوں کے کمزور حصوں کو نقصان نہ پہنچائے۔۔۔یہ بڑا دوررس فیصلہ تھا کیونکہ پانی کی نیت خراب ہو تو! اکثر عمارتوں کی مضبوط دیواریں بھی کمزور پڑ جاتی ہیں۔۔۔پانی مرتا ہے تو بنیادیں کھوکھلی کر دیتا ہے۔۔۔اور آنکھوں کا پانی مرتا ہے تو سیرت و کردار کے حسن کو ماند کر دیتا ہے ۔۔۔پانی کو رواں رہنا چاہیے، منجمد اور ٹھہرے ہوئے پانی کی بو، بدبو میں بدل جاتی ہے اور مرتے ہوئے پانی کی خو، آس پاس کی چیزوں کو مار دیتی ہے، جڑیں کمزور کر دیتی ہے۔۔

کاغان اور مری کا راستہ اب بہت کشادہ ہوگیا ہے مگر یہاں کی کشادگی لمبے ہاتھ پھیلائے اپنے معنی کو وسعت عطا کر رہی تھی۔۔۔آنے جانے کے لئے دو رویہ سڑکوں پر لین مارکنگ کی ہوئی تھی اور سڑکیں سیسے کی طرح صاف اور رواں تھیں۔۔۔دونوں طرف اونچے اونچے پہاڑ سبزے سے ڈھکے ہوئے تھے۔۔۔درختوں کی قطار کا ذکر ہو تو ایک منظم ترتیب ذہن میں آتی

ہے مگر یہاں تو درختوں کے جھنڈ تھے۔۔۔ایک دوسرے سے جڑے ہوئے۔۔۔ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے، اتنے قریب۔۔۔اتنے قریب۔۔۔۔۔جیسے ایک جان دو قالب، درختوں کے اس پار کا منظر نادیدہ رہ جاتا ہے۔۔۔بس سبزہ کی ایک خوبصورت اور دلآویز دیوار نظروں کے سامنے کھڑی تھی۔۔۔۔درختوں کے درمیان جو فاصلہ ہوتا ہے اس پر خودرو گھاس اور پیارے پیارے معصوم پودوں نے قدم جمائے ہوئے تھے اور جو درختوں کے مٹیالے تنے ہوتے ہیں اس پر بیلوں نے بانہیں ڈالی ہوئی تھیں اور جو پہاڑ کی اترائی سڑک کے ساتھ چل رہی تھی اس پر سبزے کے قالین بڑے سلیقے سے بچھائے گئے تھے۔۔۔۔قدرت نے خوب عطا کیا۔۔۔اور انتظامیہ نے اسے خوب سنوارا۔۔۔چلتی گاڑی میں مسافر دائیں، بائیں بل کھاتی سڑک کے سامنے خوبصورت لینڈ اسکیپ دیکھنے میں محو تھا، کوسٹر میں خاموشی تھی اور دونوں مسافر قدرت کے حسن کو آنکھوں کے راستے ذہن کے نہاں خانوں میں محفوظ کر رہے تھے۔۔۔بادل امڈ آئے تھے۔۔۔لگتا تھا شاید بارش ہو جائے۔۔

مجھے بیگم کے ساتھ ناران ۔ کاغان ۔ شوگران ۔۔۔میاندم ۔۔۔بحرین ۔۔۔مینگورہ۔۔۔۔سوات دیکھنے کا موقع ملا۔۔۔پھر اچانک اتروڑ کے جنگلات یاد آئے وہاں بھی درختوں کے ایسے ہی جھنڈ ہیں۔۔مگر راستہ ٹھیک نہیں پھر درختوں کے نیچے صفائی نہیں۔۔۔۔لیکن شوگران تو ان تمام مناظر سے کہیں زیادہ حسین خوبصورت اور دلفریب ہے۔۔۔ہاں اتنی تعداد میں سیاح نہیں آتے۔۔۔۔آتے ہیں تو پرائمری اسکول کے بچوں کو جتنی گنتی یاد ہے اتنی تعداد میں۔۔۔۔یہاں تو سیاحوں کا جمعہ بازار لگا ہوا ہے کیلکولیٹر کے ذریعہ ان کا شمار کرنا پڑتا ہے۔۔

منو!۔۔۔۔۔۔میں دھیمی آواز میں بولا، بہت خاموش ہو!

ہوں!۔۔بس ان مناظر کو دیکھ رہی ہوں۔۔۔ڈرتی ہوں کہ آواز کا پتھر اس پرسکون وادی کے سکوت کو نہ توڑ دے۔۔۔میں تو ان درختوں کو بھی بڑی احتیاط سے دیکھتی ہوں۔کہیں میری نظریں حسن فطرت اور دست آدم کی مہارت کو میلا نہ کر دے، خوبصورت چیزوں پر نظر لگ جاتی ہے اور زیادہ تر اپنوں ہی کی نظریں لگتی ہے

تم ٹھیک کہتی ہو۔۔۔یہ مناظر قدرت، حسن فطرت ہمارے یہاں بھی تو ہیں، تم نے وادی کاغان اور وادی سوات دیکھی ہیں۔۔۔کیا یہ شوگران اور میاندم سے زیادہ حسین ہیں؟ وادی سوات کی گود میں ہرے بھرے درخت بھی ہیں اور اسکی چھاتی میں زمرد اور ہیروں کی کانیں بھی

چھپی ہوئی ہیں۔۔۔

بیگم چپ ہوگئیں۔۔۔پھر میری طرف شکایتی نظروں سے دیکھا اور سرد لہجہ میں کہا ۔۔۔سوات!!!

لہجہ کی تلخی کی حدت پگھلے سیسے کی طرح میرے کانوں میں اتر گئی۔۔۔۔میں نے سوات کی کانوں کا ذکر کیا تھا اور اسی لفظ سوات نے میرے کانوں کے پردے جلا دیئے۔۔۔لیکن پھر بھی ہمت کر کے ماحول کو خوشگوار بنانے کے لئے کہا۔۔۔یار اپنا سوات بھی تو بہت خوبصورت ہے۔

دکھ بھرے لہجہ میں بولیں ۔۔۔۔خوبصورتی ! ۔۔۔۔کسے کہتے ہیں آپ خوبصورتی!!۔۔۔۔سنگ سرخ کی قتل گاہوں کو۔۔۔سنگ مرمر کے محلات کو جہاں اب انسانی خون کے چھینٹے پڑے ہیں، زمرد کی کانوں کو جہاں کلاشنکوف کی گولیاں بکھری پڑی ہیں۔۔۔قیمتی پتھروں سے بنے ہوئے مکانات کی الماریوں میں کتابیں نہیں بندوقیں رکھی ہیں۔۔۔وہاں سوات میں جی ہاں سوات میں سرسبز وشاداب درختوں کی جڑوں میں گولیاں بوئی جارہی ہیں، وہاں کی مسحور کن فضا میں، پھولوں کی خوشبو نہیں بارود کی بو پھیلی ہوئی ہے۔۔۔وہاں اب رگِ سنگ سے بے گناہوں کا خون ٹپکتا ہے۔۔۔وہاں کے ثمر آور درختوں پر پھل نہیں، مشتبہ جاسوسوں کی لاشیں لٹکی ہوتی ہیں وہاں کے پیڑوں کی مضبوط شاخوں میں جھولے نہیں غداروں کے لئے پھانسی کے پھندے لگے ہوئے ہیں۔۔۔وہاں مدرسوں میں معصوم بچوں کو امن وآشتی کا نہیں، دہشت گردی کا درس دیا جاتا ہے، وہاں اسکولوں میں اسلام دوستی کا نہیں انسان دشمنی کا سبق پڑھایا جاتا ہے۔۔۔اب لالازار کے سبزہ زاروں میں پرندوں کے چہکنے کی نہیں، دھماکوں کی آوازیں گونجتی ہیں۔۔۔خبر نہیں کون کسے مار رہا ہے۔۔۔جانے کس سمت سے میزائل آتے ہیں اور بے گناہوں کے گھروں کو مقتل گاہ بنا دیتے ہیں۔۔۔سوات کے لوگ کیونکر دہشت گرد ہوسکتے ہیں وہ تو سیاحوں کی خدمت کرتے تھے۔۔۔ان کی حفاظت کرتے تھے۔۔۔اور بہت کم پیسوں میں ان کی میزبانی کرتے تھے۔۔۔ہم تو شادی کے بعد بھی گئے تھے۔۔۔۔پورے ملک سے دولہا دلہن اسی سوات میں جا کر ہنی مون مناتے تھے۔۔۔کبھی سنا کہ کسی دلہن کے زیور چھین لئے۔۔۔کبھی سنا کسی نو بیاہتے جوڑے کو اغواء برائے تاوان کر لیا۔۔۔جوان جوان لڑکے لڑکیاں، کالجوں اور یونیورسٹیوں سے آکر وہاں کے رومان پرور ماحول میں سپنے بنتے تھے۔۔۔اپنی آنکھوں میں مستقبل کے خواب دیکھتے تھے۔فضا کی مسحور کن خوشبو، قوت شامہ سے

اپنی رگ و پے میں اتار لیتے تھے۔۔ان حسین مناظر کو اپنی یادوں کے خزانے میں اتار کر دل و دماغ میں محفوظ کر لیتے تھے۔۔۔سیدھے سادھے معصوم۔۔۔۔پہاڑی لوگ تو سیاحوں کو آتا دیکھ کر راستہ چھوڑ کر کھڑے ہو جاتے تھے۔۔۔جانے کس کی نظر لگ گئی۔۔۔۔جانے کن چور راستوں سے ان حسین وادیوں میں دہشت گرد آ گئے۔۔۔اب ہماری حکومت، گولیاں دہشت گردوں پر چلاتی ہے اور مارے سیدھے سادھے اور معصوم لوگ جاتے ہیں۔۔۔مقامی لوگ، کبھی طالبان کے ہاتھوں مارے جاتے ہیں اور کبھی '' ڈورن حملوں'' کی زد میں شہید ہو جاتے ہیں۔۔۔۔ظلم سہتے سہتے وہ بھی شاید انتقام پر اتر آئے۔۔۔وہاں کے لوگوں کو کیا معلوم، کون مظلوم ہے اور کون ظالم ہے وہاں کے لوگ خود اپنوں کی لاشیں اٹھاتے اٹھاتے تھک گئے۔۔۔۔اب سوات میں بم برستے ہیں۔۔۔میزائل گرتے ہیں اور لوگ مرتے ہیں۔۔۔اس ماحول کو اس فضاء کو آپ حسن کہتے ہیں۔۔۔خوبصورتی کہتے ہیں۔۔

بیگم کی آواز رندھ گئی۔۔۔۔پلکیں آبدیدہ ہو گئیں۔۔۔۔۔پھر خود ہی کہنے لگیں، ہم تو پچھلے دو سالوں سے سوات جانے ہی کا پروگرام بنا رہے تھے۔۔۔ہم خود وہاں جانے کی بجائے یہاں آ گئے۔۔۔آپ بتائے یہاں کہ لوگ وہاں کیوں جائیں گے۔۔۔۔۔؟؟

سیاح تو فاختہ کی مانند ہوتے ہیں۔۔۔ جہاں امن اور سکون ہوگا وہیں کا رخ کریں گے۔۔۔تھکن کا بوجھ اتار کر سیاح، سکون کی ریشمی چادر کی تلاش میں آئیں اور انہیں اذیتوں کا کمبل اوڑھا کر یرغمال بنا لیا جائے۔۔۔مسافر ہنسنے مسکرانے اور قہقہے لگانے آئیں اور ان کے گلے گھونٹ دیئے جائیں۔۔۔۔صبر و سکون اور مستی و سرشاری کی تلاش میں آئیں اور لاش بنا دیئے جائیں۔۔۔۔راہ نوردوں کو دہشت گردوں کا سامنا ہو۔۔۔محبت پسندوں کے خواب، انتہا پسندوں کے ہاتھوں خاک میں مل جائیں۔۔۔ جہاں ہماری اپنی ملیشیاء یرغمال بنا لی جائے بھلا ملاایشیا والے اپنا مال و منال لیکر کیوں آئیں گے۔۔۔ٹھیک ہے وہ ہمارا وطن ہے۔۔۔ہمارے ملک کا حصہ ہے سوات ہمارا اپنا علاقہ ہے لیکن آپ بتائیں اس لمحہ موجود اس علاقہ میں ہمارا کوئی علاقہ ہے۔۔۔۔میاندم میں کسی کو دم مارنے کی فرصت ہے۔۔۔۔وادیء سوات میں، خوشگوار حیات کے لمحات سیاح کو میسر میں؟

بیگم اندر ہی اندر ہچکیاں لیتی رہیں۔

میں چپ رہا۔۔۔۔میں بھی رونا چاہتا تھا۔۔۔۔۔میری آنکھوں کی پلکوں پر بھی آنسو

کانپ رہے تھے۔۔۔لیکن میں نے منہ دوسری طرف پھیر لیا، گردن جھکا لی۔۔۔کانپتے ہوئے آنسو لڑکھڑا کر میری قمیض کے دامن میں جذب ہو گئے۔۔۔جب آدمی کے پاس سوال کا جواب نہ ہو تو وہ ندامت سے سر جھکا لیتا ہے۔۔۔یا سنی ان سنی کر کے منہ دوسری طرف پھیر لیتا ہے۔۔۔میں نے منہ پھیر لیا۔۔۔میں نے گردن جھکا دی۔۔۔!!

سوات کا ستارہ میری ہتھیلی پر ماند پڑ گیا، میں نے مٹھی بند کر لی، کیونکہ میرا یقین ہے کہ جلد ہی یہ ستارہ میری ہتھیلی کی حرارت سے تابندہ ہو کر سیاحوں کو ایک بار پھر اپنی طرف متوجہ کرے گا۔۔۔میں نے اس لمحہ موجود میں گردن جھکائی ہے۔۔۔ لیکن مستقبل میں، میں سر اٹھا کر اپنی بیگم کی شکایتوں کا جواب دینے کے قابل ہو جاؤں گا۔۔۔انشاءاللہ

سفر جاری رہا۔۔۔راستے میں ایک چینی ٹیمپل دیکھا She Wee Tample، پگوڈا کی شکل۔۔۔خاصا بڑا تھا۔۔۔گذرتے ہوئے نظر ڈالی۔۔۔شاید یہ قبولیت کی گھڑی تھی ۔۔۔۔بارش کی راہ تکتے تکتے ہمیں چھ دن ہو گئے تھے کہ اچانک گھنگھور گھٹا چھا گئی، پہلے بوندیں پڑیں۔۔۔کوسٹر کے وائپرز نے دھمال ڈالنے والے فقیروں کی طرح جھومنا شروع کر دیا۔۔۔ گاڑی کے شیشوں پر موٹی موٹی بوندوں نے دستک دینا شروع کی، پھر کوسٹر کی چھت پر تڑاتڑ شروع ہو گئی

۔۔۔موسلا دھار بارش تو نہیں تھی۔۔۔لیکن بارش تھی۔۔۔ڈرائیور نے گاڑی۔۔۔ کی رفتار نسبتاً سست کر دی۔۔۔ہم نے دائیں بائیں پہاڑوں کی طرف دیکھا، سیڑھی نما نالیوں سے بارش کا پانی ترتیب وار اچھلتا ہوا نیچے گر رہا تھا، فٹ پاتھ کے کنارے کنارے پکی نالیوں میں جمع ہو کر متعین کئے گئے راستے میں بہہ رہا تھا۔۔سڑک پر پانی کا ریلا نہیں تھا۔۔بلکہ سڑک کا پانی بھی فٹ پاتھ کے ساتھ ساتھ لگی ہوئی جالی دار ڈھکنوں سے نیچے نکاسی آب کی نالیوں میں گر رہا تھا ۔۔۔۔بے حد خوشگوار اور حسین منظر تھا۔۔۔لیکن بارش کا یہ سلسلہ زیادہ دیر قائم نہیں رہا۔۔۔ پندرہ منٹ کے بعد مطلع صاف ہو گیا اور ہلکی چمکدار دھوپ چاروں اور پھیل گئی۔۔۔اب ہم ''گوتم جایہ'' کے علاقہ سے گذر رہے تھے سڑک کے ساتھ کا حصہ بارونق۔۔۔دکانیں، ہوٹلیں لوگوں کی آمد و رفت۔۔۔یہاں مقامی شہروں کے علاوہ سنگاپور اور تھائی لینڈ کی بسیں بھی آتی جاتی ہیں۔۔۔یہاں ہم نے ڈبل ڈیکر بسیں بھی دیکھیں۔۔۔لندن میں تو خیر عام ہیں مگر شہر کی سڑکوں پر دھیمے دھیمے چلتی ہیں یہاں موٹروے پر تیز رفتاری سے چلتی ہیں دیکھا۔۔۔۔چند میل

سفر طے کیا تھا کہ پھر بادل اُمڈ آئے ۔۔۔۔ یہاں درختوں میں سرخ رنگ کے چھوٹے چھوٹے پھول لگے ہوئے تھے ۔۔۔ خوبصورت درخت تھے لگتا ہے کہ ان میں آگ لگی ہوئی ہے جیسے انگارے دھک رہے ہوں، بے حد حسین منظر تھا

آدھ راستہ طے کرنے کے بعد نشیب کا سلسلہ ختم ہو گیا ۔۔۔ اب ہمارے سامنے سیدھی سڑک ہے ۔۔۔۔۔۔۔ آدھ گھنٹے بعد شہری علاقہ شروع ہو چکا تھا ۔۔۔ دائیں بائیں بلند و بالا عمارتیں ۔۔۔ ٹریفک کا رش ۔۔۔ فٹ پاتھ پر لوگوں کی بھیڑ ۔۔۔ جدید دکانیں ۔۔۔ منظر تیزی سے بدلتے رہے اب ہم شہر میں داخل ہو چکے تھے۔

گرانڈ کانٹی نینٹل ہماری منزل تھی اور اب ہم ہوٹل کے پورچ میں داخل ہوئے ۔۔۔ سامان اتارا ۔۔۔ ڈرائیور کا شکریہ ادا کیا ۔۔۔ استقبالیہ کاؤنٹر پر معمول کی کاروائی مکمل کی ۔۔۔ 25 ویں منزل پر ہمیں کمرہ دیدیا گیا ۔۔۔ پورٹر نے سامان ٹرالی پر رکھا ۔۔۔ لفٹ میں داخل ہوئے اور بٹن دباتے ہی اندازہ ہو گیا کہ لفٹ ''ماٹھی'' ہے ہلکے ہلکے جھٹکے کھاتی ہوئی ایک ڈیڑھ منٹ میں پہونچی ۔۔۔ بیگم کی جان پر بن آئی ۔۔۔ کراچی ۔۔۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں ہماری بیگم کبھی Lift استعمال نہیں کرتیں، جن شہروں کی چار پانچ منزلہ ہوٹلوں میں ٹھہرنے کا اتفاق ہوا ۔۔۔ بیگم لفٹ استعمال کرنے سے گریز کرتی ہیں ۔۔۔ یہاں معاملہ ''ڈبل فگر'' کا ہے پینانگ اور جینٹنگ ہائی لینڈ میں Lifts بے حد سبک رفتار تھیں اس لئے بیگم کو تردد نا ہوا ۔۔۔ مگر یہاں صورتحال مختلف تھی ۔۔۔ بعد میں ایک دوست نے بتایا کہ گرانڈ کانٹی نینٹل ہوٹل، کوالالپور کی پرانی ہوٹلوں میں شمار ہوتی ہے، یہاں ایک لفٹ بند تھی ۔۔۔ کہ انتظامیہ اس کی جگہ نئی Lift لگوا رہی ہے، آئندہ کبھی آئے تو دیکھیں گے ۔۔۔

پورٹر نے کمرہ کھولا ۔۔۔ سامان اتارا اور چلا گیا ۔۔۔ ہم نے کمرے کا جائزہ لیا ۔۔۔ بہت بہتر، کشادہ اور آرام دہ کمرہ تھا ۔۔۔ ضرورت کی تمام اشیاء موجود تھیں ۔۔۔ بیگم نے سب سے پہلے کیتلی تلاش کر کے پانی ابالنے کے لئے رکھ دیا ۔۔۔ چاء یا کافی ۔۔۔؟ بیگم نے پوچھا

آج میں کافی بناتا ہوں ۔۔۔ اس دوران بیگم نے بسکٹ اور ٹکیاں نکالیں ۔۔۔ کافی کگ میں نے فرج کے پاس ایک چھوٹی سی الماری سے نکالے ۔۔۔ بیگم کو پسند آئے ۔۔۔ کافی نے ساری تھکن دور کر دی ۔۔۔ پہلے وضو کر کے ظہر اور عصر کی نمازیں ادا کیں سفر میں نمازیں آسان ہو جاتی ہیں ۔۔۔ اللہ تعالیٰ تو رحیم و کریم ہے اس نے مسافروں کے لئے قصر نماز کی

رحمتیں عطا کی ہیں۔۔۔کاؤنٹر سے کئی لفافے بھی ہمارے نام ملے تھے ایک خط AOS کا تھا جس میں لکھا کہ سٹی ٹور کے لئے 10 بجے تیار رہیں، ایک خط ہوٹل کی انتظامیہ کی جانب سے تھا جس میں نیک تمناؤں کا اظہار کیا تھا۔اور ہوٹل کے جنرل مینیجر Ronny Wong کے دستخط تھے۔۔ایک اور خط بھی تھا جس میں ہوٹل میں موجود سہولیات کی تفصیلات درج تھیں۔

ہم تھکے ہوئے تھے، اس لئے بستر میں دبک گئے۔۔

ڈیڑھ دو گھنٹے بعد سو کر اٹھے۔۔۔حسب عادت دیوار پر پڑے پردوں کو ہٹایا تو نگاہوں کے عین سامنے ۔۔۔۔۔۔ بہت قریب ''ٹون ٹاور'' موجود تھا۔۔۔۔ ہمارے کمرے سے ٹاور بالکل صاف نظر آ رہا تھا کہ ہم اس کے فلور گن سکتے تھے۔۔۔لیکن سچی بات یہ ہے کہ ہم منزلوں کا شمار نہیں کر سکے کہ آنکھیں عینک لگانے کے باوجود بھی کمزور ہیں سنتے آئے ہیں کہ یہ دنیا کی بڑی عمارتوں میں سے ایک ہے۔۔۔ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ اور ٹون ٹاور نیویارک بھی ہم نے دیکھی ہیں۔۔۔سڑک پر کھڑے ہو کر منہ اٹھا کر دیکھو تو آسمان سے باتیں کرتی نظر آتی تھیں۔۔۔۔۔۔ ۲۵ ویں منزل سے دیکھنے میں ''ٹون ٹاور'' اتنی بلند محسوس نہیں ہوتی تھی۔۔۔بہر حال باوقار اور پرشکوہ عمارت ہے اس کے ساتھ ہی K.R.L Tower بھی سر اٹھائے کھڑا ہے جس کی چھت پر نصب ۔۔۔۔۔۔انٹینا ۔۔۔۔ٹون ٹاور سے زیادہ بلند تھا۔۔۔۔ٹون ٹاور کے آس پاس پچاسوں عمارتیں اپنے حسن و جمال کے ساتھ تن کر کھڑی ہیں۔۔۔۔اندازاً یہ تمام 50 منزلوں سے زیادہ بلند ہونگی۔۔۔۔مختلف رنگوں اور ڈیزائن کی بلند عمارتوں نے کوالالمپور کو عمارتوں کے تعلق سے بین الاقوامی شہروں کی صف میں لا کھڑا کیا ہے حالانکہ یہاں کی شہری آبادی اور علاقہ زیادہ نہیں ہے ایک محتاط اندازے کے مطابق کوالالمپور شہر گلشن ٹاؤن اور جمشید ٹاؤن کے برابر ہوگا، آبادی اور رقبہ کے اعتبار سے۔۔۔۔ہم دیر تک فضاء سے شہر کا جائزہ لیتے رہے۔۔کوالالمپور کا فضا سے جائزہ لیں تو تقریباً وہی منظر ہے جیسا کومتار ٹاور کی 60 ویں منزل سے پینانگ شہر کا منظر تھا۔۔۔لیکن ہم جس سمت سے کوالالمپور کو دیکھ رہے ہیں یہاں سے سمندر نظر نہیں آتا۔۔۔ہاں تمام چھوٹی بڑی عمارتوں کی چھتیں جھنگی نما ہیں۔۔۔اور اکثر چھتوں میں سرخ رنگ استعمال کیا گیا ہے۔۔۔عمارتوں سے ذرا دور درختوں کے جھنڈ میں رہائشی بستیاں ہیں۔۔۔تمام مکانات ایک جیسے تھے اور اکثر کی چھتیں سرخ رنگ کی تھیں

بیگم نے کہا ساڑھے 6 بج رہے ہیں۔۔۔تیار ہو جائیں، ہمیں شہر بھی جانا ہے اور رات

کھانے کے لئے پاکستانی ہوٹل بھی تلاش کرنا ہے۔۔

شام سات بجے ہم ہوٹل سے باہر نکلے۔۔۔ ہوٹل گرانڈ کانٹی نینٹل، مرکزی شاہراہ سے ذرا ہٹ کر ایک نسبتاً چھوٹی سڑک پر واقع ہے۔۔۔ ہوٹل کے بالکل سامنے ایک بہت خوبصورت اور بلند عمارت ہے۔۔۔ اس میں E.O.N Bank واقع ہے۔۔۔ ہوٹل سے چند قدم کے فاصلے پر مرکزی شاہراہ ہے جسے ''راجہ لاؤٹ روڈ'' کہا جاتا ہے۔۔ یہاں سڑک کے لئے جالان کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔۔۔ ہماری ہوٹل سے ملی ہوئی ایک اور پرانی ہوٹل۔۔۔۔ ''ہوٹل پلازہ'' ہے۔۔۔ اس ہوٹل کا صدر دروازہ۔۔۔۔ ''جالان راجہ لاؤٹ'' پر ہے۔۔۔ ہوٹل پلازہ کے بالکل سامنے ''کوسمو پوائنٹ انٹرنیشنل یونیورسٹی کالج'' ہے۔۔۔ اور اس کے ساتھ ایک خوبصورت بس اسٹاپ، جس طرح کے جدید بس اسٹاپ حال ہی میں کراچی کی بعض اہم شاہراہوں پر سٹی ڈسٹرکٹ گورنمنٹ کراچی نے تعمیر کئے ہیں۔

شام کے سائے ڈھل رہے تھے۔۔۔ اسٹریٹ لائیٹس اور بعض عمارتوں کے بلب روشن ہو گئے تھے۔۔۔ مگر ابھی ڈوبتے سورج کی ملگجی روشنی اطراف میں پھیلی ہوئی تھی۔۔۔ بغیر کسی راہنمائی کے ہم نے سڑک پار کی۔۔۔ انٹرنیشنل یونیورسٹی کالج کی عمارت کے باہر بہت سے طلباء و طالبات کاندھوں پر بیگ لٹکائے بس اسٹاپ پر اپنی مطلوبہ سواری کا انتظار کر رہے تھے۔۔۔ اس یونیورسٹی سے زیادہ خوبصورت اور بڑی عمارت تو پروفیسر اعجاز فاروقی کے ''پریکٹیکل سینٹر'' کی بلڈنگ ہے۔۔۔۔ ہم نے الٹے ہاتھ کو جانے کی بجائے سیدھے راستے کو اختیار کیا اس طرف اسکوٹرز کے بہت سے گیراج تھے۔۔۔ دکانیں تھیں اور ہر پانچ سات دکانوں کے بعد چھوٹی بڑی ہوٹلیں تھیں۔۔۔ ان کے نام اتنے بدذائقہ تھے کہ رات کے کھانے کے لئے ہم ان کا انتخاب نہ کر سکے۔۔۔ اب ہم نے راہگیروں سے پاکستانی ہوٹل کے بارے میں پوچھنا شروع کیا۔۔۔ ایک فرلانگ سے زیادہ دور تک ہم چہل قدمی کرتے رہے۔۔۔ اس دوران ایک ہوٹل کے باہر فٹ پاتھ پر بچھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھی ہوئی ایک Family پر نظر پڑی، پہلی نظر میں پاکستانی دکھائی دیئے۔۔۔ بیگم نے ان سے پاکستانی ہوٹل کا پتہ معلوم کیا تو انہوں نے بڑی اپنائیت سے ٹھیٹھ پنجابی لہجہ میں کہا۔۔۔ نال ای ایک پاکستانی ہوٹل ہے اتھے ایک کڑی کھلوتی ہے۔۔۔ اشارہ اس طرف تھا جہاں سے ہم چل کر آئے تھے۔۔۔ اندھیرا بڑھ رہا تھا۔۔۔ فٹ پاتھ پر لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی اب ہم نے واپس جانے کا فیصلہ کیا۔۔۔ کچھ دیر

بعد ایک ہوٹل نظر آئی ۔۔۔۔۔ہم نے ہوٹل کے اندر شیشوں کے پیچھے کھانوں کی ڈشز دیکھیں کھانے تو دیکھے بھالے تھے۔

اور کاؤنٹر پر ہماری ہی صورت سے ملتا جلتا ایک ایشائی بیٹھا تھا۔۔۔۔

یقیناً وہ انڈین تھا۔۔۔۔ہم نے اردو میں بات کی تو اس نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں جواب دیا ۔۔۔۔ہم نے پوچھا تھا کہ کیا یہاں قریب میں کوئی پاکستانی ہوٹل ہے اس نے سر ہلا کر بڑی بے نیازی سے جواب دیا۔۔۔

نہیں کوئی پاکستانی ہوٹل قریب نہیں۔۔۔۔

اس کا جواب سن کر ہم مایوس ہوئے۔۔۔۔بہر حال ہم اپنے ہی ہوٹل کی طرف جا رہے تھے۔۔۔۔اتفاق دیکھئے کہ چند عمارتوں کے بعد ایک ہوٹل دیکھا اس کے دروازے کے اوپر اللہ ۔۔۔۔محمدؐ۔۔۔۔۔لکھا ہوا تھا ان اسمائے مبارکہ کے بیچ جلی حروف میں ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' درج تھا۔۔۔۔دل خوش ہو گیا۔۔۔۔۔حیرت اس بات پر ہوئی کہ کچھ دیر پہلے ہم اسی جگہ سے گذرے تھے۔۔۔لیکن ہمیں یہ ہوٹل نظر نہیں آیا۔۔۔۔۔ہوٹل میں چند میزوں کے گرد لوگ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔۔۔ملائیشیا میں درمیانے درجہ کی ہوٹل میں تمام کھانے ایک بڑی ٹیبل پر مختلف ڈشز میں رکھ دیئے جاتے ہیں ۔۔۔۔آپ اپنی پسند کا کھانا منتخب کریں اور آرڈر دیتے جائیں۔۔۔۔یہاں تمام پاکستانی کھانے موجود تھے۔۔۔۔ہمارے استفسار پر ویٹر نے بتایا کہ تندوری روٹی بھی ہے۔۔بیگم خوش ہو گئیں۔۔۔ہم نے اپنی پسند کے کھانوں کی طرف اشارہ کیا تو ویٹر نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں ہمیں برابر کے کمرے میں جانے کو کہا۔۔۔۔یہ اتنا ہی بڑا دوسرا کمرہ تھا۔۔۔۔مگر ائیر کنڈیشن تھا۔۔۔۔نسبتاً صاف ستھری کرسیاں تھیں۔۔۔بالکل اسی طرح جیسے ہمارے ہاں برنس روڈ کی ہوٹلوں میں Families کے لئے علیحدہ حصہ مخصوص ہوتا ہے ۔۔۔۔تھوڑی دیر بعد کھانا میز پر چن دیا گیا۔۔۔۔تازہ تندوری روٹیاں۔۔۔۔مچھلی کا سالن بے حد لذیذ، ملائے کھانوں میں نمک مرچ مصالحے ہمارے ہاں کی طرح استعمال ہوتے ہیں، کھانے کے ساتھ ہم نے پانی مانگا۔۔۔۔بیرے نے پوچھا۔۔۔منرل واٹر۔۔۔؟

ہم نے کہا نہیں پینے کا سادہ پانی۔۔۔۔۔۔۔!!

بیرا چھوٹے گلاس میں پانی لایا مگر ان میں پانی سے زیادہ برف کی ڈلیاں پڑی ہوئی تھیں اور شیشے کے گلاس بھی وہی تھے جن میں دس بارہ برس پہلے بہادر آباد کراچی میں ہم کبھی کبھی

''راجو آئسکریم'' کھاتے تھے۔۔۔۔ہوٹل کے اس حصہ میں چند لوگ بیٹھے تھے لیکن ہم سے ذرا آگے ایک میز پر چار چینی نژاد طالبات بیٹھی تھیں، بہت مناسب لباس میں وہ شاید کھانا کھانے کے بعد کولڈ ڈرنکس لے رہی تھیں۔۔۔۔بظاہر یہ عام بات ہے لیکن میں ان کا تذکرہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔۔۔۔ہم جب اس میز پر آکر بیٹھے تھے تو وہ مسلسل قہقہہ لگا رہی تھیں، ہنسنا مسکرانا تو معمول کی بات ہے۔۔۔۔مگر بھرپور قہقہے۔۔۔۔وقفے وقفے سے ان کے قہقہوں کی نقرئی گونج اس وقت ختم ہوتی جب انہیں احساس ہوتا کہ وہ اجنبی لوگوں کے درمیان بیٹھی ہیں۔۔۔۔لمحہ بھر کو آواز تھم جاتی پھر کسی بات پر وہ بے ساختہ ہنستیں، اور ان کی ہنسی قہقہہ بن جاتی۔۔۔۔اور پھر تھم جاتی ۔۔۔۔قلقل مے کی طرح۔۔۔جیسے ساقی بوتل سے کانپتے ہاتھوں میں پکڑے ایک ایک جام میں ۔۔۔وقفہ وقفہ سے شراب انڈیلتا ہے بالکل اسی طرح ان بچیوں کے نقرئی قہقہہ وقفہ وقفہ سے بلند ہوتے تھے۔ذرا دیر بعد پھر قہقہوں کے فوارے پھوٹتے جیسے میخانے میں اول شب، بہت سی بوتلوں سے بیک وقت شراب انڈیلی جا رہی ہو۔۔۔۔۔زندگی سے بھرپور۔۔۔۔خوشیوں سے لبریز ان کے قہقہوں میں بے فکری کی سرشاری، اپنے اندر کے اطمینان کے اظہار کا بے ساختہ پن رگ و پے میں سمائی مسرتوں کے جذبوں سے ان کے چہرے گلنار ہو رہے تھے۔۔۔۔چہرے پر بلا کی معصومیت دکھ و آلام سے بے نیاز۔۔۔۔۔غم والم سے بے پرواہ۔۔۔۔۔۔وہ حد درجہ مسرور تھیں

آپ خود سوچئے بچیوں کے قہقہے۔۔۔۔۔وہ بھی چینی نوعمر لڑکیوں کے قہقہے۔۔۔۔شہنائی اور بانسری کی دھن پر۔۔۔طبلے کے آخری سرے پر بشیر جیسے ماہر طبلہ نواز کی انگلیوں کی آہستہ آہستہ مگر تیز رفتار تھاپ۔۔۔سے ملی جلی جو آوازیں پیدا ہوتی ہیں وہی آوازیں سرخوشی و سرشاری و سرمستی میں ڈوب کر شہد گلوں سے قہقہوں کی صورت طلوع ہو کر فضا میں بکھر جائیں تو آپ کیسا محسوس کریں گے۔۔۔۔کبھی کبھی ایسی آوازیں، ایسے قہقہے ہمیں مہندی کی تقریب میں دلہن کی ہمجولیوں کے جھرمٹ میں سنائی دیتی ہیں۔۔۔۔ان قہقہوں میں بے فکری اور اندیشوں سے بے نیازی کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔۔۔معصوم اور روشن آنکھوں میں سہانے سپنے نامحسوس طریقے پر آرزو بن کر مکالموں میں ڈھل جاتے ہیں۔۔۔پھر اچانک شرم وحیا کے انار سے ذو معنوی جملے پھوٹتے ہیں اور مائیوں میں بیٹھی دلہن کے ساتھ اس کی سکھیاں جڑ جاتی ہیں۔۔۔ایسے میں کوئی بزرگ آواز گونجتی ہے اور لمحہ بھر خامشی چھا جاتی ہے۔۔۔۔پھر قہقہے بلند ہوتے ہیں اور گیندیں کے

پھولوں سے سجی سیج کے آس پاس محفل زعفران زار ہو جاتی ہے۔۔۔میں مائیوں کی تقریب سے واپس لوٹ آیا۔۔۔اسی لمحہ احساس ہوا کہ۔۔۔۔۔ہمیں کھل کر ہنسے ایک زمانہ بیت گیا۔۔۔۔۔ بے تکلف دوستوں کی محفل میں بھی بڑے تکلف کے ساتھ منافقانہ مکالموں میں ڈرتے ڈرتے کبھی کوئی فقرہ چست کریں یا جملہ کسیں۔۔۔تو فوراً کہتے ہیں ، معاف کرنا یوں ہی کہہ دیا تھا۔۔۔پلیز مائنڈ مت کرنا۔۔۔ہم کس ماحول میں زندگی گذار رہے ہیں۔۔۔ہم کتنے اندیشوں اور وسوسوں کو اپنے اندر چھپائے ہوئے ہیں۔۔۔ ہمارے اندر کی خوشی کیا ہوئی۔۔۔ ہمارے اندر کی سرمستی کہاں چلی گئی۔۔۔ ہمارے اندر کی کی بے فکری کہاں کھو گئی ۔۔۔یہ بچیاں کیوں اس قدر سرشار ہیں۔۔۔یہ دولت منداور امیر بھی نہیں ہیں ایک درمیانے درجے کے عام سے ہوٹل میں کھانا کھانے آئی ہیں ۔۔۔ان کے اپنے مسائل بھی ہوں گے۔۔۔انہیں بھی اپنے مستقبل سے خوفزدہ ہونا چاہیئے۔۔۔انہیں بھی زندگی کی تلخیوں ، ناکامیوں اور مایوسیوں کا لاشعوری طور پر ہی سہی احساس ہونا چاہیئے۔۔۔۔لیکن ان کے تو خواب وخیال میں بھی خوف اور اندیشے نہیں ہیں۔۔۔کیا یہاں کا معاشرہ اتنا مطمئن۔۔۔۔اتنا پر سکون اور اتنا پر یقین ہے۔۔۔کہ اس معاشرہ میں رہنے والے لوگ ہر وقت ہنستے مسکراتے رہتے ہیں، بے خوف اور بے فکر رہتے ہیں۔۔۔یقیناً۔۔۔ہم نے چھ دنوں میں یہاں جو کچھ دیکھا یہ بچیاں اس معاشرہ کا عکس ہیں ۔۔۔۔۔۔۔انہیں اپنے حکمرانوں پر۔۔۔ اپنے سسٹم پر۔۔۔اپنے ملک پر اندھا اعتماد ہے۔۔۔مجھے اچانک یاد آیا۔۔۔انہی میں سے ایک لڑکی ساڑھے چودہ سو سال پہلے ۔۔۔آدھی رات کو شہر مدینہ کی فصیل پار کر کے تنہا کہیں جا رہی تھی۔۔۔راستہ میں ایک گھڑسوار نے راستہ روک کر پوچھا۔۔۔اے لڑکی تم پر کیا افتاد پڑی ہے کہ تم آدھی رات کو اکیلی گھر سے نکل کھڑی ہوئی۔۔۔انہی میں سے ایک لڑکی نے گھڑسوار سے الٹا سوال کیا۔۔۔کیا عمر فاروقؓ اب ہمارے خلیفہ نہیں ہیں۔۔؟

گھڑسوار نے حیرت سے کہا۔۔۔۔کیا مطلب۔۔۔۔!!

لڑکی نے کہا اگر عمر فاروقؓ ہمارے خلیفہ ہیں تو ایک اجنبی کو یہ جرأت کیسے ہوئی کہ وہ ایک نامحرم لڑکی کا راستہ روک لے

گھڑسوار نے کہا میں عمر فاروق ہوں اور اپنی رعایا کی خبر گیری کے لئے گشت پر ہوں ۔۔۔تاریخ کا یہ منظر ساڑھے چودہ سو سال پہلے مدینہ کی گلیوں میں گم ہو گیا تھا۔۔۔بس تاریخ

کے صفحہ پر روشن ہے۔۔۔لیکن میں نے محسوس کیا کہ۔۔۔وہ منظر پھر سے یہاں روشن ہوگیا یہاں کے لوگوں کی خبر گیری کرنے والے حکمراں جاگ رہے ہیں۔۔بیدار ہیں۔۔۔ایک ایک شہری کے دکھ درد سے واقف ہیں۔۔۔انہوں نے قانون کی حکمرانی قائم کی ہے۔۔۔امیر و غریب جو قانون کی زد میں آجائے۔۔۔اور انصاف کے ترازو میں، اس کا جرم ثابت ہو جائے تو معافی ممکن نہیں۔۔۔یہی وجہ ہے کہ ہم خود انگلیوں میں دبے سگریٹ کے ادھ جلے ٹکڑے کو فٹ پاتھ پر لئے پھرتے ہیں کہ کہیں Dust Bin نظر آئے تو یہ ٹکڑا اس میں ڈال دیں۔۔۔ حالانکہ ہم تو سیاح ہیں۔۔۔مسافر ہیں۔۔۔بلکہ ان کے مہمان ہیں لیکن نہیں قانون سب کے لئے ہے۔۔۔قانون سے ماوراء کوئی نہیں، قانون سے بالادست کوئی نہیں، مجھے خیال آیا کہ اس معاشرہ میں ہمارا گذارہ مشکل ہے۔۔۔ہمارے یہاں ہر پابندی کا حل ہے۔۔۔پاکستان میں عذاب ثواب کا صرف تصور ہے ملائیشیاء میں ہر جرم کا حساب ہوتا ہے۔۔۔ہمارے ہاں قانون سے بچنے کے لئے کوشش اور سفارش کا در وا رہتا ہے۔۔۔یہاں پرسش اور سرزنش کا در کھلا ہے۔۔۔پاکستان میں تعزیرات کی تشریحات، تاویلات و توجیہات بہت ہیں۔۔۔ملائیشیاء میں قانون کی گرفت سخت ہے۔۔۔میں سوچنے لگا کہ انہوں نے چودہ سو سال پرانی تاریخ کے صفات پر بکھرے ہوئے نظام کو کیونکہ عملاً نافذ کر دیا۔۔۔مجھے یوں لگا کہ میں زمانے کے بدلے ہوئے تقاضوں کے مطابق جدید قدروں کے ساتھ ساڑھے چودہ سو سال پرانے معاشرہ میں موجود لوگوں کی قناعت و دیانت۔۔۔سادگی و راستبازی، پاکیزگی و بے نیازی، اطمینان و ایقان کا عکس یہاں کے لوگوں کے چہروں پہ دیکھ رہا ہوں۔۔۔کہ انہیں یقین ہے کہ ان کا مستقبل معتبر ہاتھوں میں محفوظ ہے۔۔

کھانا کے بل میں پانی کی قیمت آدھا رنگٹ فی گلاس شامل تھی۔۔۔۔۔۔ ۔۔۔۔ہوٹل سے باہر نکلے تو حیران رہ گئے۔۔۔۔ہوٹل پلازہ اور ہوٹل گرانڈ کانٹی نینٹل ہمارے سامنے۔۔۔۔اور بغل میں انٹرنیشنل یونیورسٹی کالج کی عمارت۔۔۔۔سڑک پار کر کے ہم E.N.O Bank سے ہوٹل پہنچ گئے۔۔۔۔لاؤنج پرسکون تھا۔۔۔۔بہت کم مسافر یہاں موجود تھے۔۔۔البتہ برابر ڈائننگ روم میں لوگ چند میزوں پر بیٹھے گفتگو کر رہے تھے۔۔۔۔

رات نو بجے ہونگے۔۔۔ہم اپنے کمرے میں آئے۔۔۔۔اور عادت کے مطابق پردہ

سرکایا تو عجیب منظر۔۔۔لمحہ بھر کو تو میں مبہوت رہ گیا

صبح سویرے اٹھ کر ناشتہ کرنے کے لئے ہم تیار ہوئے کہ واپس آ کر کپڑے تبدیل کر کے ''سٹی ٹور'' پر جانا تھا۔۔۔بیگم لفٹ کی کارکردگی سے مطمئن نہیں تھیں۔۔۔اس لئے وہ ناشتہ کے بعد دوبارہ لفٹ کے ذریعہ کمرہ میں آنے پر تیار نہیں ہوئیں۔۔۔کہنے لگیں کہ بس ایک بار ہی نیچے چلیں گے اور ناشتہ کر کے لوبی میں بیٹھ جائیں گے تاکہ وہیں سے سٹی ٹور پر چلے جائیں۔۔۔لفٹ سے اتر کر لاؤنج کے ساتھ ہی ہوٹل ہے۔۔یہ ڈائننگ روم بھی کہلاتا ہے۔۔۔ہم نے کوپن دیئے اور اندر چلے گئے۔۔۔ہمیں یوں محسوس ہوا کہ جیسے ہم امرتسر کے کسی ہوٹل میں آ گئے ہیں۔۔۔چند گورے اور چینی جوڑوں کو چھوڑ کر تمام چہرے بھارتی تھے۔۔۔خاصی تعداد میں سکھ گھرانے بھی تھے۔۔۔ڈشوں کی طرف بڑھے تو سارے کھانے جانے پہچانے۔۔۔۔پوری، ساگ۔۔۔۔روٹی۔۔۔۔۔۔سوجی کا حلوہ۔۔۔۔چاول۔۔۔۔دال۔۔۔۔ان کے علاوہ وہ دیگر اشیاء خوردونوش بھی موجود تھیں، جو لنکاوی، پینانگ اور جینٹنگ ہائی لینڈ'' کی ہوٹلوں میں موجود تھیں مگر معیار اور تعداد میں کم تھیں۔۔

چالیس پچاس مسافر ہونگے۔۔۔مگر Service بہت ناقص تھی، ہوٹل کے بیرونی حصہ میں بھی ناشتہ کی میزیں رکھی ہوئی تھیں، یہ حصہ سڑک کے کنارے تھا۔۔۔یعنی آپ ناشتہ کے دوران باہر کے ماحول کو بھی enjoy کر سکتے ہیں، ہمیں یہ حصہ اس لئے پسند آیا کہ یہاں سگریٹ پینے کی اجازت تھی۔۔

بیرونی حصہ میں ایک Cook چولہے کی دھیمی آنچ پر رکھے ہوئے پرانے فرائی پین میں بڑے اطمینان سے انڈا ہاف فرائی کر رہا تھا۔۔۔کئی مسافر ہاتھوں میں پلیٹ لئے قطار میں کھڑے تھے ہم نے بیگم کے لئے ہاف فرائی حاصل کرنیکی کوشش کی لیکن پہلے دن کامیاب نہیں ہو سکے۔۔۔ہمیں تو خیر یقین ہو گیا کہ وہ ہوٹل انتظامیہ کی ہدایت پر آرام آرام سے یعنی کاہلی اور سستی سے ایک ایک انڈا فرائی کر کے مسافروں میں تقسیم کر رہا ہے۔۔۔۔ہماری طرح بہت سے مسافر مایوس ہو کر دیگر ڈشز کی جانب متوجہ ہو گئے۔۔۔سکھوں کے ساتھ قریب کی میز پر ناشتہ کرنے کا موقعہ ملا غور سے ہم نے ان کی حرکات وسکنات کا جائزہ بھی لیا۔۔۔ان کی زبانی کھلی ٹلی پنجابی باتیں بھی سنیں۔۔۔مگر ہمیں ہنسی نہیں آئی۔۔۔البتہ ایک مسافر کی داڑھی مجھے ان کی عمر سے بھی زیادہ لمبی لگی۔۔۔ناف تک تو ہو گی۔۔۔کھانے میں ان کو البتہ بڑی دشواری ہو رہی تھی۔۔۔پلیٹ

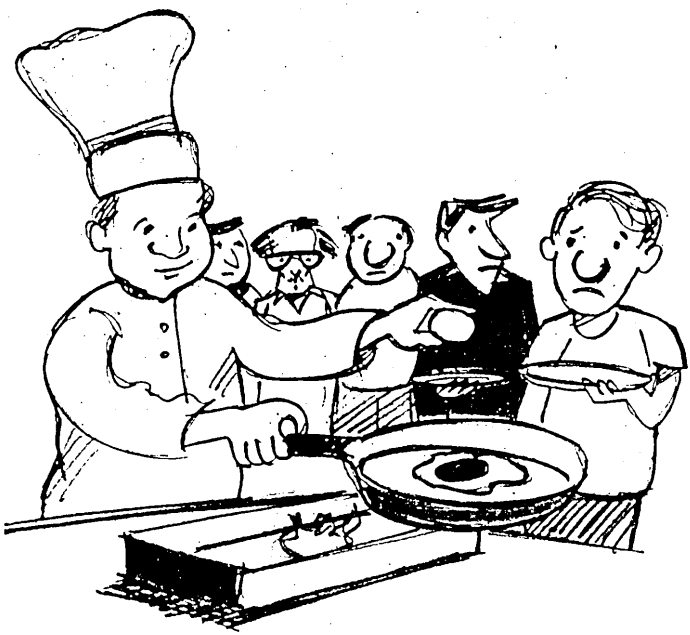

سے چمچہ کے ذریعہ لقمہ لینے کے لئے جھکتے تو داڑھی پلیٹ میں پہلے برش کی طرح جھاڑو پھیرنے لگتی۔۔۔ وہ بے چارہ ایک ہاتھ سے داڑھی کو سمیٹتا اور دوسرے ہاتھ سے لقمہ منہ میں لیتا۔۔۔ یوں لگ رہا تھا جیسے مائیں اپنے ہاتھ سے بچے کے منہ میں لقمہ دینے سے پہلے اسکی گردن میں لٹکے ہوئے نیپکن کو سنبھالے رکھتی ہیں۔۔۔

ناشتہ سے فارغ ہو کر ہم ہوٹل لابی سے باہر نکلے تو AOS کی کوسٹر کھڑی تھی ہم دو ہی مسافر تھے لیکن چند گلیوں کے بعد کوسٹر ایک اور ہوٹل کے سامنے رک گئی چند منٹ کے بعد چھ سات مغربی ممالک کے سیاح ہمارے ساتھ آ بیٹھے اس کے بعد کوسٹر تیسری ہوٹل کے پورچ میں داخل ہوئی۔۔۔ جہاں سے ایک جاپانی اور انڈین جوڑا ہماری ٹیم کا حصہ بنے۔۔۔ حیرت ہمیں اس وقت ہوئی جب کوسٹر ''بس اسٹاپ'' پر جا کر کھڑی ہوگئی ڈرائیور نے کہا پلیز آپ لوگ اتر جائیں۔۔۔

ہم کوسٹر سے اترے تو دیکھا پچاسوں بسیں وہاں پارک تھیں، ہمارے ڈرائیور نے ہم سب مسافروں کو ایک بس میں بیٹھنے کا اشارہ کیا جس میں پہلے سے چند مسافر سو رہے تھے، ہمیں یاد آیا کراچی حیدرآباد کے درمیان سپر ہائی وے پر چلنے والی بسوں کے ڈرائیورز بھی مسافروں کو اسی طرح بیچ

دیتے ہیں۔۔۔یعنی جب کسی بس میں مطلوبہ تعداد کے مسافر نہیں ہوتے تو آدھ راستے میں، دوسری بس والے ڈرائیور کے ہاتھوں اپنے مسافروں کو فروخت کر دیتے ہیں۔۔۔مسافر بہت احتجاج کرتے ہیں، شور کرتے ہیں، پولس سے شکایت کرنے کی دھمکی بھی دیتے ہیں مگر چار و ناچار دوسری بس میں سوار ہو جاتے ہیں۔۔۔یہاں بھی ہمارے ساتھ ایسا ہی ہوا۔۔۔کوسٹر کا ڈرائیور ہم سے دام لئے بغیر ''بس ڈرائیور'' کے دام میں پھنسا گیا۔۔۔یہاں ذرا انتظار کرنا پڑا۔۔۔بس کی تمام نشستیں جب مسافروں سے پر ہوگئیں۔۔۔تو آرام دہ اور خوبصورت بس روانہ ہوئی۔۔۔بس میں ایک خوش شکل اور اسمارٹ گائیڈ بھی تھا۔۔۔بس جیسے ہی اسٹاپ سے نکل کر سڑک پر آئی گائیڈ نے پیشہ ورانہ انداز میں اپنا تعارف کرایا۔۔۔مسافروں کو خوش آمدید کہا۔۔۔ اور رننگ کومینٹری شروع کر دی۔۔۔آپ کے دائیں جانب یہ ہے۔۔۔آپ کے بائیں جانب وہ ہے۔۔۔اور اب فلاں روڈ سے گذر رہے ہیں۔۔۔یہ جو عمارت آپ دیکھ رہے ہیں Pink Colour کی اس کی ایک تاریخی حیثیت ہے۔۔۔انگریزی بہت صاف تھی۔۔۔مگر روانی بہت تیز تھی۔۔۔کامل توجہ دیں تو کچھ کچھ سمجھ میں آتا تھا۔۔۔وہ تو اچھا ہوا کہ سڑک پر ٹریفک خاصا تھا اور بس دھیمی رفتار میں چل رہی تھی۔۔۔اگر بس کی رفتار تیز ہوتی تو ہم کچھ دیکھ پاتے اور نہ سن پاتے اور نہ سمجھ پاتے، ان دلنشیں مناظر کو ذہن نشیں کرنا تو درکنار وقتی طور پر یاد رکھنا بھی مشکل۔۔۔ایک عمارت دیکھی ایسی خوبصورت کہ عبادت کرنے کو جی چاہے۔۔۔پل بھر میں گذر گئی۔۔۔مسجد تھی، ہم تو زیارت بھی نہ کر سکے۔۔۔گائیڈ کی تقریر جاری رہی۔۔۔ہم سفارتی علاقہ سے گذر رہے ہیں۔۔۔یہاں امریکہ، چین، جاپان، UK کے سفارتخانے ہیں۔۔۔یہ کوالالپور کا گولف کلب ہے۔۔۔یہ اسلامی بنک۔۔۔فلاں بنک۔۔۔فلاں بنک ہے۔۔۔ہم کو تو بیگم سمیت بچوں کے سیل نمبر بھی یاد نہیں عمارتوں کے اس سیل رواں میں کس کس کا نام یاد رکھیں، اب ہم نے اپنے کان، کامل توجہ کے ساتھ کارڈلیس مائک پکڑے گائیڈ کی آواز پر لگا دیئے اور ایک ہوشیار اور چوکنے ڈرائیور کی طرح ہر منٹ میں چوبیس بار دائیں بائیں بیک مرر کو دیکھنے کے انداز میں سیدھے الٹے ہاتھ کو دیکھنا شروع کیا جب وہ رائٹ سائیڈ کہتا تو ہم سیدھے ہاتھ کی عمارت دیکھتے اور جب وہ لیفٹ سائیڈ کہتا تو ہم الٹے ہاتھ کو دیکھتے اس طرح دائیں بائیں گردن موڑتے ہوئے ہم نے محسوس کیا کہ پنڈولم کی طرح ہماری گردن حرکت کر رہی ہے لیکن جب گائیڈ کی ہدایت کے مطابق ہمیں کوئی چیز نظر نہیں آئی تو احساس ہوا کہ جب وہ رائٹ

کہتا تھا تو ہم اس کے سیدھے ہاتھ کی طرف دیکھتے اور گردن موڑ کر بھاگتی عمارت کو دیکھنے کی کوشش کرتے اور جب وہ لیفٹ کہتا تو الٹے ہاتھ کی طرف۔۔۔۔اصل میں وہ ہمارے سیدھے ہاتھ کی طرف نشاندہی کرتا تھا اور ہم اس کے سیدھے ہاتھ کی طرف دیکھتے اور جب وہ ہمارے الٹے ہاتھ کی طرف اشارہ کرتا تو ہم گائیڈ کے الٹے ہاتھ کی طرف گردن موڑ لیتے۔۔۔۔پس جب اس نے یہ کہا کہ یہ برطانوی دور کے رہائشی مکانات ہیں وکٹورین طرز کے۔۔۔۔اس وقت ہم ایک اور خوبصورت سی بلند عمارت کو دیکھ رہے تھے اور جب اس نے کہا کہ یہ ہندوؤں کا مندر ہے تو ہمارے سامنے ایک شاپنگ پلازہ تھا۔۔۔اور وہاں سیاحوں کا اژدھام تھا۔۔۔

ایک جگہ بس روک دی گئی۔۔۔گائیڈ نے کہا۔۔۔یہ سامنے ''ٹون ٹاور'' ہے۔۔یہ ملائیشیا کی بلند ترین عمارت ہے اس کا ڈیزائن ارجنٹائن کے ایک آرچیٹیکٹ نے تیار کیا تھا 1982 میں اس کا تعمیراتی کام شروع ہوا اور 1986 میں یہ عمارت مکمل ہوئی اس میں 88 فلورز ہیں۔۔۔چار منزلوں میں شاپنگ سینٹرز ہیں جب کہ باقی Floors پر ایک پیٹرولیم کمپنی کا دفتر اور دیگر تجارتی کمپنیوں کے دفاتر ہیں۔۔۔۔ہمیں ذرا دور کوالالمپور ٹاور بھی نظر آ رہا تھا یہ C.N Tower کینیڈا کی طرز کا ٹاور ہے اس میں رہائشی یا تجارتی فلورز نہیں ہیں البتہ ہر روز سیاحوں کے لئے 65 منزل تک جانے کی اجازت ہے۔۔آپ لوگ دیکھنا چاہتے ہیں تو صبح سویرے یہاں آ کر Q میں لگنا ہوگا۔۔۔لفٹ کے ذریعہ آپ کو اوپر لے جایا جائے گا جہاں سے آپ شہر کا فضائی جائزہ لے سکتے ہیں K.L Tower میں ایک ریوالونگ ریستوران بھی ہے اور یہ ٹاور ملائیشیا کا سب سے اونچا ٹاور ہے۔۔۔اب آپ لوگ ''ٹون ٹاور'' کے ساتھ تصویریں بنائیں۔۔۔دس منٹ ہم یہاں ٹھہریں گے، اس اعلان کے بعد بس کا خودکار دروازہ کھل گیا اور سیاحوں نے ایک ایک کر کے آرام سے اترنا شروع کیا۔۔۔تمام مسافر ایک فٹ پاتھ پر جمع ہو گئے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ہم سے ذرا دور دو سڑکوں کے اس پار ''ٹون ٹاور'' کھڑا آسمان سے باتیں کر رہا تھا۔۔۔اس کے ابتدائی دو تین فلورز ہمیں نظر نہیں آئے۔۔۔کیونکہ۔۔۔اس کے ساتھ ہی پارک تھا۔۔۔کنونشن سینٹر تھا۔۔۔۔۔جہاں داخلے کے لئے ٹکٹ خریدنا پڑتا تھا۔۔۔SKY Hotel تھا اور قریب میں ایک بلند عمارت تھا DANDU NAN AECAHALL ہوٹل ہے۔۔۔اب ہم نے ساری توجہ ٹوئن ٹاور کے ساتھ تصویر بنانے پر صرف کر دی تمام سیاح اپنے اپنے کیمروں کے ذریعہ اپنے پیاروں کو سامنے کھڑا کر کے تصویریں بنا رہے تھے۔۔۔ہم نے بڑا غور کیا کہ ہم کس جگہ بیگم کو

کھڑا کر کے تصویر اتاریں۔۔۔اسی طرح ہماری بیگم بھی ہمیں سامنے کھڑا کر کے مختلف زاویوں سے تصویر بنانے کی کوشش کرتی رہیں۔۔۔اگر آخری منزل تک ٹوئن ٹاور کی تصویر لینا منظور ہے تو پھر سامنے کھڑے ساتھی کی تصویر نہیں آسکتی اور اگر آپ کو اپنے دوست کی تصویر لینا مقصود ہے تو پھر ٹوئن ٹاور کی دیو ہیکل اور بلند عمارت کی تصویر لینا مشکل ہے اگر روزنامہ ڈان کے مجیب اخبار جہاں کے بابر اور جنگ کے شعیب اور Star کے حیدر عباس اور ایکسپریس کے اشرف اور جلال قریشی ایسے مشاق اور تجربہ کار فوٹو گرافر بھی یہاں موجود ہوتے تو بے بس ہو جاتے۔۔۔ہم نے اس پہلو پر بھی غور کیا کہ اگر فٹ پاتھ پر لیٹ کر اپنے ممدوح کو فوکس کریں تب بھی ٹوئن ٹاور قابو میں نہیں آئے گا اور ٹوئن ٹاور کو قابو کر لیا تو آپ کا چہیتا۔۔۔کیمرے کے Focus سے نکل جائے گا۔۔۔تمام لوگوں کی طرح ہم نے بھی یہی کیا کہ بیگم کی تصویر بنائی اور ٹوئن ٹاور کو کیمرہ کی Range پر چھوڑ دیا۔۔۔

اس خاص جگہ پر لا کر ٹوئن ٹاور کے ساتھ Photo session کی تک ہمیں سمجھ نہیں آئی۔۔۔اس سے کہیں بہتر تھا کہ ہمیں ٹوئن ٹاور کے داخلی دروازہ پر

لے جا کر کھڑا کر دیتے۔۔۔ہم ٹوئن ٹاور کو ایک بار ہی سہی پیر تا سر دیکھ لیتے دھیرے دھیرے گردن اٹھاتے اٹھاتے اس کی آخری منزل کو اپنی نگاہوں سے چوم لیتے۔۔

''فوٹو سیشن'' کی یہ لفظی ترکیب بھی امریکہ کے صدر اور چھوٹے ملکوں کے سربراہان کے درمیان ''وائٹ پیلس'' کے سبزہ زار میں ایک تصویر اتروانے سے شروع ہوئی ہے۔صدر امریکہ کے ساتھ ایک تصویر بنوانے کے لئے دنیا بھر کے ملکوں کے صدور۔۔۔وزراء اعظم اور سربراہان مملکت واشنگٹن جاتے ہیں۔۔۔بعض دفعہ تو ایک تصویر اتروانے کے لئے بڑے جتن کرنے پڑتے ہیں کبھی کبھی اس شوق کی تکمیل کی خاطر عزت سادات ہی نہیں قومی جذبات بھی مجروح ہوتے ہیں۔۔۔حال ہی میں ہمارے ملک کے وزیر اعظم بھی یہ رسم پوری کرنے امریکہ گئے تھے، وائٹ ہاؤس کے سبزہ زار پر صدر بش کے سامنے کھڑے ہو کر پریس بریفنگ کے دوران وہ اس قدر گھبرائے کہ ٹانگیں کانپنے لگیں۔۔۔وہ تو ڈائس سامنے تھا اس لئے فوٹو گرافرز ان کی کانپتی ہوئی ٹانگوں کو Focus نہیں کر سکے۔۔۔ہاں کانپتے لہجے کو کیمروں کے مائک نے قید کر لیا۔۔۔یہاں دل نہیں بھرا تو امریکہ کے مستقبل کے مبینہ صدر اوباما سے درخواست کی گئی کہ ایک فوٹو سیشن کر لیں بڑی مہربانی ہوگی۔۔۔اس کے بعد جانے آپ کے ساتھ تصویر اتروانے کا موقعہ

ملے یا نہ ملے۔۔۔لائق سفیر پاکستان نے اس کا اہتمام کیا، مگر اوباما نے شرط یہ لگائی کہ صرف ایک تصویر اتروا ؤنگا اور اس کو ریلیز کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ میرا Staff کریگا۔۔۔ہمارے وزیر اعظم اس پر بھی تیار ہو گئے کہ چلو اخبار میں چھپے یا نہ چھپے گھر کے ڈرائنگ روم کی دیوار پر تو لٹکی رہے گی، آنیوالی نسلیں کہیں گی کہ ہمارے جد امجد نے امریکی صدر کے ساتھ تصویر اتروائی تھی اعتبار نہیں ہے تو ہماری پرانی حویلی میں آکر دیکھ لو۔۔۔۔"

خیر وہ بڑے لوگ ہیں۔۔۔ٹوئن ٹاور کے ساتھ ہمارا فوٹو سیشن تو ناکام ہو گیا کیونکہ نہ ہمارا قد اس کی برابری کر سکا اور نہ ازراہ التفات "ٹون ٹاور" ہمارے برابر آکر کھڑا ہوا۔۔پندرہ منٹ بعد ہنستے مسکراتے سیاح بس میں بیٹھ گئے اور اپنے ڈیجیٹل کیمروں اور موبائل فون کی اسکرین پر ٹوئن ٹاور کے ساتھ اپنی اپنی تصاویر دیکھتے رہے، ہماری بیگم نے پلٹ پلٹ کر یعنی ریورس کر کے کئی بار اپنی تصویر دیکھی۔۔۔کسی تصویر میں ٹوئن ٹاور موجود تو بیگم نہیں تھیں۔۔۔اور کسی تصویر میں بیگم تھیں تو مکمل ٹوئن ٹاور نہیں تھا۔۔۔

گائیڈ کی تقریر پھر شروع ہو گئی۔۔۔ہم نے اب کی بار اس کی رٹی رٹائی تقریر پر دھیان نہیں دیا کیونکہ سماعت و بینائی کو کامل یکسوئی کے ساتھ ہم آہنگ کرنا اپنی طبیعت سے جنگ کرنے کے مترادف تھا۔۔۔یوں بھی دائیں بائیں گردن ہلا ہلا کر دیکھنے کی وجہ سے شانوں میں درد ہونے لگا تھا۔۔۔گردن کا ذکر اس لئے نہیں کیا کہ وہیں سے درد Travel کرتا ہوا کندھوں تک پہونچا تھا۔۔

کچھ دیر بعد ہمیں ایک ہینڈی کرافٹس سینٹر۔۔۔لے جایا گیا۔۔۔یہاں اسے BATIK کہا جاتا ہے۔۔۔دستکاری کے اس مرکز تک سیاحوں کو لایا جاتا ہے۔۔۔تاکہ ہم ان کی دستکاری کو دیکھ سکیں اور کچھ نہ کچھ خرید لیں۔۔۔۔اگر ہم یہ سینٹر نا بھی دیکھتے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔۔۔لیکن یہ قوم اپنی دستکاری کا فروغ چاہتی ہے۔۔۔یہاں ہم سے پہلے بہت سی بسیں کھڑی تھیں۔۔۔مسافروں کے اترنے سے پہلے ہر مسافر کے کندھے یا شانے پر ایک اسٹیکر لگا دیا جاتا ہے۔۔۔اس کا اہتمام اس لئے کیا جاتا ہے کہ اس بھیڑ میں بس کے مسافر ایک دوسرے کو پہچان لیں اور ٹور آپریٹر یا گائیڈ اپنی بس کے مسافروں کو تلاش کر سکیں۔۔۔باتک کے مرکزی دروازے سے داخل ہونے کی بجائے ہمیں عقبی دروازے سے لے جایا گیا۔۔۔یہاں دستکار بڑی مہارت سے اپنے کام میں مصروف تھے۔۔۔ایک بڑے فریم میں تقریباً تین میٹر کپڑے کو

کسا ہوا تھا جیسے ہمارے لیاقت آباد میں شادی بیاہ کے جوڑے تیار کرنے والے ہنرمند ایک فریم میں کپڑا لپیٹ لیتے ہیں ۔۔۔تمام مسافر اس فریم کے اردگرد کھڑے ہوگئے اب دستکار نے برش ہاتھ میں لیا۔۔۔۔اس برش کے اوپر چھوٹی سی دوات جڑی ہوئی تھی ۔۔۔ہنرمند نے برش کی مدد سے تیزی کے ساتھ کپڑے پر دیدہ زیب گل بوٹے بنانے شروع کئے اور دیکھتے دیکھتے سفید کپڑے پر مختلف ڈیزائن کی لکیروں کی مدد سے پھول پتیاں اجاگر ہونے لگیں ۔۔۔سیاحوں نے دستکار کی مہارت کو داد دینے کے لئے تالیاں بجائیں ۔۔۔۔ملائیشیا میں یہ فن زیادہ تر مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہے، اسی لئے اسلامی ثقافت کی جھلک نمایاں ہے ۔۔۔اس وقت ہمیں خیال آیا کہ ہماری چھوٹی بیٹی نہد یہ تو اس سے کہیں زیادہ خوبصورت دوپٹے پینٹ کرتی ہے اس نے فائن آرٹ میں چار سالہ ڈگری حاصل کی ہے ۔۔۔لیکن بیکار۔۔۔۔وہ اپنی دو بچیوں کی پرورش میں اتنی مگن ہے کہ اس فن کو بھولتی جارہی ہے، شادی کے بعد شروع شروع میں اس نے بہت سے دوپٹے ڈیزائن کئے تھے پرل کانٹی نینٹل ہوٹل میں اپنے کام کی نمائش بھی کی تھی جو بے حد کامیاب رہی۔۔۔۔پھر چھوڑ دیا۔۔۔ہم سے بڑی بیٹی المنٰی Al-Mina کاظمی اب بھی ڈریس ڈیزائننگ کرتی ہے ملائیشیا میں آپ گھر میں ہیں تب بھی کام کرنا پڑتا ہے۔۔۔۔یہاں عورت اور مرد دونوں مل کر اپنی اپنی پسند کا کام کرتے ہیں جو خواتین باہر دفتروں میں ملازمت نہیں کرتیں۔۔۔۔وہ دستکاری کا کام گھروں پر کرتی ہیں ۔۔۔حکومت اور کمرشل ادارے ان کی مدد کرتے ہیں۔۔

پینٹنگ کا مظاہرہ ختم ہوا تو ایک دروازے سے تمام سیاحوں کو ایک شوروم میں لے جایا گیا۔۔۔۔یہاں پہلے سے بہت لوگ موجود تھے۔۔۔۔گھریلوں دستکاری کے سینکڑوں نمونے شوکیسز میں سجے ہوئے تھے ۔۔۔تمام ملبوسات اور دیگر اشیاء ایسی تھیں جو ہمارے ملک میں تیار کی جاتی ہیں۔۔۔۔مگر ان کی اس طرح مارکیٹنگ نہیں کی جاتی ۔۔۔۔غیر ملکی سیاح خاص کر خواتین نے ہاتھ کے بنے ہوئے ملبوسات میں بڑی دلچسپی کا اظہار کیا۔۔۔۔بیگم شوروم میں مختلف چیزیں دیکھتی رہیں ۔۔۔میں باہر نکل آیا۔۔۔۔BATIK کے باہر صدر دروازے کے قریب گائیڈ کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔۔۔ہم نے بھی موقع غنیمت جانا۔۔۔اپنے برانڈ کی سگریٹ سلگائی اور گائیڈ سے باتیں کرنے لگے ۔۔۔گائیڈ نے بتایا کہ۔۔۔۔ملائیشیا میں 13 ریاستیں ہیں، 9 ریاستوں پر سلطان کی حکومت ہوتی ہے ۔۔۔ہر پانچ سال بعد 9 ریاستوں کے سلطان اپنے میں سے ایک سلطان کو King منتخب کرتے ہیں جو ملائیشیا کا روایتی بادشاہ کہلاتا ہے

---پارلیمنٹ سے منتخب ہونے والا وزیراعظم ملک کا اصل حکمراں ہوتا ہے پارلیمنٹ کی نگرانی میں چند اہم محکمہ ہوتے ہیں ---مقامی معاملات ریاستیں خود نمٹاتی ہیں ---ریاستوں اور پارلیمنٹ کے درمیان کوئی اختلاف نہیں سب اپنی اپنی حدود میں رہ کر اپنے اپنے اختیارات کے ساتھ خدمات انجام دیتے ہیں ---سیاحوں نے اب باہر آنا شروع کر دیا تھا ان میں سے بیشتر مرد تھے ---- یہاں ہم نے دیکھا کہ تین پہیوں والی اسکوٹر پر چلتی پھرتی Shop ڈیزائن کی گئی تھی ----دیکھنے میں یہ ٹھیلے معلوم ہوتے ہیں ---مگر صاف ستھرے اور خوبصورت ----ان ٹھیلوں پر روزمرہ کی ضروری چیزیں اور کھانے پینے کی اشیاء فروخت کی جاتی ہیں۔

BATIK کے صدر دروازے کے دونوں طرف دو بڑے گملوں میں Orange Trees لگے ہوئے تھے یہ درخت نہیں پودے تھے مشکل سے ڈیڑھ فٹ اونچے ----ان پودوں میں بگو بیروں سے ذرا چھوٹے Orange لگے ہوئے تھے اس کی شاخیں پھلوں سے لدی ہوئی تھیں ---خیال رہے کہ یہ مصنوعی نہیں قدرتی تھے ---بیگم باہر نکلیں تو ہم نے انہیں بھی یہ پیڑ نما پودے دکھائے وہ بھی حیران ہوئیں ----سچ مچ کے ہیں ---بیگم نے پوچھا---

جی ہاں قدرتی ہیں ---

دیکھیں اللہ کی شان ہے ----بیگم نے شاخوں اور پھلوں کو چھو کر دیکھتے ہوئے کہا---

اب گائیڈ نے اپنے مسافروں کو جمع کرنا شروع کیا اور بس میں بیٹھنے کی ہدایت کی--

تمام مسافر اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے --بعض خواتین کے ہاتھوں میں شاپنگ بیگز تھے ----یہ سامان انہوں نے اسی BATIK سے خریدا تھا

بس پھر روانہ ہوئی ------گائیڈ کی نشست کے برابر خالی کرسی پر آج کا تازہ اخبار پڑا تھا، ہم نے اس کی اجازت سے اخبار اٹھالیا ----دوسرے صفحہ پر جلی سرخی کے ساتھ خبر تھی کہ کونسل نے کام کرنے والی خواتین پر گہری رنگ کی Lipstick اور اونچی ایڑھی کے جوتوں اور چپلوں پر پابندی لگا دی، ----ہمیں بے حد دکھ ہوا

----بیگم کو خبر دکھائی اور اپنے احساسات کا ذکر کیا تو سرخی پڑھ کر ایک سطر پر توجہ دلائی women at work ---آپ کیوں مایوس ہوتے ہیں ---عام خواتین پر پابندی نہیں لگائی -----ہم نے کہا عام خواتین سے باتیں کرنے ہم ان کے گھروں پر جھانکنے تھوڑی جائیں گے ----جیسی بری بھلی یہاں نظر آتیں ہیں وہ ہوٹلوں۔شاپنگ سینٹرز اور مختلف دفاتر ہی میں تو

دکھائی دیتی ہیں ۔۔۔۔۔سانولی سلونی ملائے خواتین ہلکا سا میک اپ کر کے ہونٹوں پر لالی لگا لیتی ہیں اور دلکش نظر آتی ہیں چینی نژاد خواتین پہلے ہی بالشت بھر کی ہوتی ہیں چار پانچ انچ کی Heel پہن کر ہمارے کندھے تک آجاتی ہیں ۔کونسل کو یہ بھی گوارا نہیں ۔۔۔۔اور پھر جو خواتین کاؤنٹر کے پیچھے کھڑی ہو کر دن رات سیاحوں کی خدمت کرتی ہیں ان کے گورے گورے رنگ، کشادہ چمکدار پیشانی اور ادھ کھلی باتیں کرتی آنکھیں سیاحوں کو اپنی جانب متوجہ کرتی ہیں وہ چینی گڑیائیں تو بغیر ہیل کے کاؤنٹر کے اندر ہی چھپ جائیں گی، سیاحوں کو پتہ بھی نہیں چلے گا کہ یہ کھڑی ہیں کہ بیٹھی ہیں ۔۔۔کیا دکانوں میں سجا مال بغیر سیلز گرلز کے فروخت ہو جائے گا بیگم نے ہمیں تنبیہی نظروں سے دیکھا ۔۔۔ہم چپ ہو گئے ۔۔۔لیکن دل ہی دل میں سوچتے رہے کہ ہمارے کوالالمپور پہونچتے ہی یہ فیصلہ کیوں کیا گیا ۔۔۔کہیں ایسا تو نہیں کہ ہماری آمد کی اطلاع کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا ہو ۔۔۔ یوں ہم ایسے کون سے گلفام ہیں کہ صرف ہماری نظروں سے یہاں کی ورکنگ وومن کو دور رکھنے کے لئے یہ قانون پاس کیا گیا ہے ۔۔۔یونہی ہمیں اپنے دوستوں کے بارے میں بدگمانی پیدا ہوئی، ہماری آمد کی اطلاع جن دوستوں کو تھی ان میں سے کسی پر بھی تو ہم شبہ نہیں کر سکتے ،سیف الرحمٰن گرامی اور فرہاد زیدی کے علاوہ صرف جاوید حسن اور محی الدین الدین چنگیزی ہمارے اس خفیہ مشن سے واقف تھے ۔۔۔ان میں سے محی الدین چنگیزی پر شبہ نہیں کیا جا سکتا ہے وہ کامریڈ ضرور ہے لیکن دل کا برا نہیں ۔۔۔ہاں اگر شفیع چندریگر کو ہماری ملائیشیا روانگی کا پتہ چل جائے تو وہ ضرور ہمارے بارے میں الٹی سیدھی خبریں Internet کے ذریعے ملائیشیا بھجوا سکتا ہے کہ وہ کالج کے زمانے میں ہمارے خلاف ایسی کئی وارداتیں کر چکا تھا ۔۔۔مگر شفیع چندریگر کے تو فرشتوں کو بھی پتہ نہیں ہوگا کہ ہم ملائیشیا آئے ہیں ۔۔۔اچانک خیال آیا کہ بچوں نے بتایا تھا کہ ہماری روانگی کی خبر روزنامہ جنگ کراچی میں تصویر کے ساتھ چھپی ہے ۔۔۔یقیناً شفیع چندریگر نے خبر پڑھ کر یہ شرارت کی ہوگی ۔۔۔ہم نے تو ابھی کوالالمپور کے کسی بڑے شاپنگ سینٹر میں توجہ سے window shopping بھی نہیں کی اور AOS کے ذریعہ جو سٹی ٹور کرایا جا رہا ہے اس میں بھی اب تک ہمیں کسی قابل ذکر شاپنگ سینٹر نہیں لے جایا گیا ۔۔۔پھر ہم نے سوچا کہ ہمیں پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے جب غیر ممالک سے آنے والے سیاح سیلز گرلز کے بغیر دکانوں کو دیکھتے گزر جائیں گے اور ونڈو شاپنگ پر گذارا کریں گے تو یہاں کاروبار کیسے چلے گا ۔۔۔ہم تو اول دن سے برادر مسلم ملک سمجھ کر حکومت کو یہ مشورہ دینا

چاہتے تھے کہ وہ مغربی ممالک سے کچھ سیلز گرلز کرائے پر منگوالیں تا کہ غیر ملکی سیاح انہیں دیکھ کر زیادہ خریداری کریں اور اپنے ملک کی کرنسی ملائیشیا میں صرف کریں۔۔۔۔خیر مٹی پاؤ جی، ہمیں پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔۔پھر ہم نے یہ سوچ کر خود کو تسلی دی کہ ابھی تو کونسل نے فیصلہ کیا ہے اس کے نوٹیفیکیشن جاری ہونے میں چند روز لگیں گے اس وقت تک ہم اپنا مطالعاتی دورہ مکمل کر کے اپنے وطن واپس جا چکے ہونگے۔۔۔۔اگر کسی ملک کی خواتین کی سرگرمیوں کا تفصیلی جائزہ نہ لیا جائے ان کے مسائل سے آگہی نہ ہو۔۔۔۔ان کے کتابی چہروں کو پوری توجہ سے نہ پڑھا جائے تو مطالعاتی دورہ سود مند نہیں رہے گا ہمارے لئے نہیں ملائیشیا کے لئے۔۔۔۔۔۔کہ ہم تو اپنی رپورٹ بنا کر حکومت کو بھیجنا چاہتے تھے۔۔۔بہت سی اچھی تجاویز جو خواتین کے چہرے پڑھ کر ہم تیار کرتے وہ اب نہیں کر پائیں گے۔۔۔بہر حال کوالالمپور میں آئندہ چند روز کے دوران اونچی ہیل کی مدد سے چینی نژاد لڑکیاں اور ملائے خواتین گہری لپ اسٹک کی مدد سے ہماری توجہ اپنی جانب مبذول کرانے میں کامیاب ہوگئیں تو ہم ان چہروں کا مطالعہ ضرور کریں گے اور رپورٹ بھی تیار کریں گے۔۔۔ایک اخبار کی خبر سے اتنا مایوس ہونے کی ضرورت نہیں اور پھر یوں بھی تو ہو سکتا ہے یہ Table story ہو اور کل کونسل کی طرف سے اس کی تردید آجائے۔

کیا سوچ رہے ہیں۔۔۔آپ تو بالکل چپ ہو گئے۔۔۔بیگم نے ہمارے شانے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

میں سوچ رہا ہوں کہ اس فیصلہ سے ملائیشیا کی Leather and Cosmatic Industries تو بیٹھ جائیں گی۔

کاسمیٹکس انڈسٹری کی بات تو سمجھ میں آتی ہے چمڑے کی صنعت کو بھلا کیا خطرہ ہے۔

بیگم نے پوچھا

تم بھی کمال کرتی ہوئی نت نئے ڈیزائن کی چپلیں اور جوتیاں کون خریدے گا اور یہ جو ہر مہینے خواتین طرح طرح کے پرس خرید کے کندھے پر لٹکائے پھرتی ہیں ان کا کیا مصرف رہ جا ئیگا۔۔۔لیڈیز پرس میں ہوتا کیا ہے۔۔۔۔لپ اسٹک کے شیڈز۔۔۔۔آئینہ۔۔۔ہیر برش۔۔۔۔اور میک اپ کا دوسرا سامان۔۔۔۔جب لپ اسٹک پر ہی پابندی لگا دی گئی تو باقی چیزیں تو ثانوی ہیں۔۔۔۔چاء۔۔۔کافی۔۔۔اور برگر کھانے کے بعد ہونٹوں پر کیا لگائیں گی۔۔۔بار بار آئینہ کیوں دیکھیں گی۔۔۔ہاں بس اس کا ایک فائدہ

ہے۔۔۔۔خواتین کو آرام کرنے کا زیادہ وقت مل جائیگا۔۔

زیادہ وقت وہ کیسے؟

بھئی دفتر جانے کے لئے گھنٹوں پہلے کیوں بیدار ہونگی۔۔۔۔پانچ منٹ پہلے سو کر اٹھیں۔۔۔۔منہ پر پانی کا چھپا کا مارا باتھ روم سلیپر پہنے۔۔۔۔سپڑ سپڑ کرتے ہوئے گھر سے نکلیں اور بس پکڑ کر دفتر آ گئیں۔۔۔۔۔سچ پوچھو تو مجھے خوف آ رہا ہے کہ اس فیصلہ سے کہیں یہاں کے لوگوں کا کاروبار متاثر نہ ہو۔

آپ بھی کمال کرتے ہیں۔۔۔۔ایک ذرا سی خبر سے ملاایشیاء کا کاروبار کیسے ٹھپ ہو جائے گا۔۔۔

بھئی تم خود سوچو۔۔۔۔گاہک ،سیلز گرل کے پاس کیوں آئے گا۔۔۔۔''اونچی ہیل'' کی جوتیوں کے بغیر چینی لڑکیاں۔۔۔۔تو شورومز کے کاؤنٹر پر کھڑی نظر ہی نہیں آئیں گی۔۔۔۔ملائے سیلز گرلز سے کون Bargaining کرے گا۔۔۔۔۔یہاں تو تجارتی بازاروں کی سب دکانیں One Price Shops بن جائینگی۔۔۔۔۔کوئی بھولا بھٹکا ضرورتمند گاہک آ کر چیز طلب کرے گا۔۔۔۔سیل گرل قیمت بتا دے گی۔۔۔۔۔گاہک مال خریدے گا اور چلا جائے گا۔۔۔۔حجت کرنے۔۔۔۔بحث کرنے۔۔۔۔قیمت کم کرانے یعنی ''بارگیننگ'' کرنے کے بہانے کن چہروں کو دیکھے گا۔۔۔۔گہری سانولی یا سانولی سنولی لڑکیوں کو کم از کم ایشیائی دیکھنے تو ادھر نہیں آئیں گے ،اسی رنگت کی روؤنی صورتوں کو دیکھنے کا شوق ہوتا تو گھر سے باہر پردیس میں کیوں آتے۔۔۔۔ہاں چینی لڑکیوں کی رنگت گوری ہے مگر وہ اونچی ایڑھی کے بغیر نظر کب آئیں گی۔۔۔

توبہ ہے ،ایک بات کے پیچھے ہی پڑ گئے۔۔۔۔بیگم نے جھنجھلا کر منہ کھڑکی کی طرف موڑ لیا۔۔

گائیڈ کی تقریر جاری تھی وہ اونچے اونچے رہائشی فلیٹوں کے بارے میں بتا رہے تھے کہ یہ کم قیمت رہائشی منصوبوں کے تحت تعمیر کئے گئے ہیں بعض پلازہ 25-20 منزلہ ہیں ملائیشیا کا ہر شہری جس کی آمدنی ایک ہزار رنگٹ ماہانی ہے وہ یہاں فلیٹ بک کرا سکتا ہے اور آسان اقساط ادا کرتے ہوئے ان فلیٹوں میں رہائش اختیار کر سکتا ہے کم قیمت رہائشی منصوبے یہاں بہت کامیاب ہیں اور اس کی وجہ سے ملک کے تمام شہریوں کو گھر میسّر ہیں۔۔۔۔اس لئے یہاں کوئی [illegible]

ہے۔۔۔۔نہ جھونپڑ پٹی ہے۔۔۔نا بلڈر مافیا ہے اور نہ ہی سرکاری زمینوں پر قبضہ کرنے کی روایت ہے۔۔۔۔ 1965 میں ان فلیٹوں کی تعمیراتی کام کا آغاز کیا گیا تھا۔۔۔دائیں بائیں قطار اندر قطار اونچے اونچے رہائشی پلازہ ہم دائیں بائیں دیکھ رہے تھے۔۔۔گائیڈ نے بتایا کہ پہلے ہمارے ملک کا نام ملایا تھا 1963 میں اس کا نام ملائیشیا رکھا گیا۔۔۔

کچھ دیر بعد ہماری بس ایک سڑک کے کنارے رک گئی۔۔۔۔اس سڑک پر بہت سی بسیں رکی ہوئی تھیں۔۔۔اور یہاں ایک اژدھام تھا۔۔۔ایک طرح کا میلا لگا ہوا تھا۔

☆☆☆

کنگ پیلس

گائیڈ نے بتایا کہ یہ King کا محل ہے۔۔۔۔آپ آدھ گھنٹہ یہاں گھومیں اور تصویریں بنائیں۔۔۔لیکن اب ہماری بس ادھر سامنے پارکنگ ایریا میں کھڑی ہوگی، بس کا نمبر نوٹ کرلیں اور آدھ گھنٹے بعد واپس آجائیں۔۔

ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔۔۔تمام مسافر بس سے اترے اور ادھر ادھر بکھر گئے۔۔۔ بادشاہ کا محل واقعہ محل تھا۔۔سینکڑوں ایکٹر پر پھیلا ہوا ہے۔۔اور اتنی ہی تعداد میں سیاح یہاں موجود تھے اور تصویریں بنا رہے تھے۔۔اور جھانک جھانک کر صدر دروازہ کے اس پار متعدد عمارتوں کو دیکھنے کی ناکام کوشش کررہے تھے۔

ہم نے واشنگٹن میں وائٹ ہاؤس بھی اسی طرح باہر کھڑے ہوکر دیکھا تھا، وائٹ ہاؤس کا کچھ حصہ سیاحوں کے لئے کھولا جاتا ہے لیکن جس دن ہم پہونچے تھے اس دن سیاحوں کو یہ سہولت میسر نہ تھی۔۔۔ یہاں King Palace کے لئے بھی وائٹ ہاؤس کی پالیسی اپنائی گئی ہے ۔۔۔۔یعنی سیاح آئیں۔۔۔۔صدر دروازہ سے King Palace کو دیکھیں شاہی محل کا تصور کریں، تصویر بنائیں اور بطور یادگار اپنے کیمروں میں محفوظ کرلیں۔۔۔صدر دروازہ سے محل کی اصل عمارت اتنی دور ہے کہ انسانی آنکھ اسے اپنی گرفت میں نہیں لے سکتی۔۔۔۔موبائل فون کا کیمرہ بھی چند میٹر سے زیادہ دور کی تصویریں نہیں بنا سکتا

King Palace کا بیرونی حصہ بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے دائیں بائیں سبزہ زار۔خوش رنگ پھولوں کی تزئین و آرائش۔۔۔مختلف اقسام کے پودوں کی نہایت سلیقہ سے زیبائش۔۔۔نشیب سے فراز تک اٹھتے ہوئے حصہ پر سبزہ کا قالین۔۔۔اس پر درختوں کی قطاریں۔۔۔۔محل کی شوکت و وجاہت اندرونی حصوں میں ہوتو ہو۔۔۔بیرونی حصہ تو بڑا انسان دوست تھا، مہکی ہوئی فضا۔۔۔ جسم و جاں کو مسرور کرنے والی نرم نرم پروں سے چلتی ہوئی ہوائیں ۔۔۔پورے ماحول میں سکون و اطمینان اور بے فکری کی ان دیکھی چادر تنی ہوئی تھی۔۔۔یہ بادشاہ سلامت کا محل ہے۔۔۔۔؟ مگر دروازہ کے باہر اس کی رعایا ہنستی مسکراتی اور چہلیں کرتی آپس

میں ایک دوسرے کی تصویریں بنانے میں مصروف ہے۔۔۔۔ بچے تو اتنے بے خوف کہ ماؤں کی گود سے نکل کر باوردی محافظوں کو چھیڑ رہے تھے۔۔۔ حالانکہ محل کے دربان ننگی تلوار ہاتھ میں لئے گھوڑوں کی پیٹھ پر بیٹھے تھے، مردوں کو چھوڑیئے خواتین اور بالشت بالشت بھر کی چینی، جاپانی گڑیائیں۔۔۔ گھوڑے سے چپک کر فوٹو کھنچوا رہی تھیں۔۔۔۔۔۔ ہمارے خیال میں گھوڑا منہ سے نہیں اپنے پورے وجود سے مسکراتا ہے اور قہقہہ لگانے کے لئے اپنے نتھنوں کو استعمال کرتا ہے۔۔۔۔ اونٹتے ہوئے دودھ کی سی رنگت والی دراز قد لڑکی۔۔۔ گھوڑے کی گردن میں بازو ڈالے تصویر بنوانے کے لئے پوز دے رہی تھیں۔۔۔ میں نے غور سے دیکھا تو لڑکی دم سادھے اور گھوڑا دم دبائے اور سم جمائے۔۔۔۔ سامت کھڑے تھے۔۔۔ کیمرے کی روشنی چمکی۔۔۔۔ لمحہ بھر بعد، فوٹو کھنچواتے وقت جو کلف چہرے پر جمی تھی وہ ڈھل گئی اور لڑکی بے تکلف ہو کر گھل مل گئی۔۔۔ ہم سے نہیں گھوڑے سے۔۔۔۔ یعنی لڑکی گھوڑے کی گردن پر ہاتھ پھیرنے لگی۔۔۔ گھوڑے نے بھی بدن ڈھیلا چھوڑ دیا۔۔۔۔ اب لڑکی کی ایک اور ساتھی ان متحرک لمحات کو مووی کیمرہ میں قید کرنے لگی۔۔۔ پھر گھوڑے کو جانے کیا سوجھی کہ اس نے اپنی گردن نیچے جھکائی تو۔۔۔۔ کان کی لویں گورے گورے گالوں کو مس کرتی ہوئیں اوپر اٹھ گئیں۔۔۔ لڑکی مسکرائی، اپنے گال پر ہاتھ پھیر کر، پیار سے گھوڑے کی گردن پر ہاتھ پھیرنے لگی اور۔۔۔۔ اور پھر اپنے گال کو گھوڑے کی گردن سے مس کر کے گھوڑے کو الوداعی بوسہ دیا۔۔۔ گھوڑے نے گردن ہلائی دائیں سے بائیں انکار میں نہیں۔۔۔۔ اوپر سے نیچے، اقرار میں، جیسے کبھی گاؤں کا دولہا قاضی کے سامنے تین بار سہرے سے ڈھکی منڈیا ہلاتا ہے۔۔۔۔ لڑکی مسکراتی ہوئی پلٹ آئی۔۔۔ مگر پلٹ پلٹ کر دیکھتی رہی۔۔۔ گھوڑے کی طرف۔۔۔ لڑکی نے آخری بار گھوڑے کی طرف دیکھ کر بائی کے انداز میں الوداعی ہاتھ ہلایا اور بھیڑ میں گم ہو گئی۔۔۔۔ جیسے بھیڑ، گلے میں گم ہو جاتی ہے۔۔۔ گھوڑے نے گردن موڑ کر بھیڑ میں گم ہو جانے والی لڑکی کو متلاشی نگاہوں سے دیکھا اور اچانک زور سے گردن ہلائی۔۔۔ جھرجھری سی لی اور مدہم آواز میں ہنہنایا۔۔۔ کہ گھوڑسوار جو مٹی کے مادھو کی طرح بیٹھا تھا لمحہ بھر کو بکھر گیا۔۔۔ پھر اس نے گھوڑے کی پیٹھ پر ٹانگیں کسیں اور لگام تھام کر بت بن گیا۔۔۔۔ گھوڑا بھی اپنی ڈیوٹی پر واپس آ گیا یعنی ساکت ہو گیا۔۔۔۔ ہم نے اس دن یقین کر لیا کہ گھوڑا انسان دوست اور پیار کرنے والا ہے۔۔۔ گھوڑے بھی ایسے تربیت یافتہ اور مانوس حسِ نسوانیت۔۔۔ کہ لڑکیوں کو قریب آتا دیکھ کر مسکراتے

ہوئے دوستانہ رویہ اختیار کر لیتے ہیں۔اور پھول جھاڑ والیی دم کو اس طرح ہلاتے تھے جیسے لڑکیاں نہیں گھوڑیاں چپک کر کھڑی ہیں۔۔اور اگر کوئی مرد تصویر بنوانے کے لئے آگے آئے تو قریب پھٹکنے نہ دیں۔۔۔۔۔۔

محل کا آہنی دروازہ بہت بڑا اور کشادہ تھا۔۔جیسے ہمارے ہاں گورنر ہاؤس یا ایوان صدر کا دروازہ ہوتا ہے۔۔۔دروازہ پر سیاہ پالش کی ہوئی ہے مگر سنہری بیل بوٹوں سے سجا ہوا ہے اور دونوں دروازوں کے درمیان King کا Insignia بنا ہوا ہے اور اس پر سنہری رنگ کیا ہوا ہے اس کے دونوں جانب بغلی دروازوں پر دو گھڑ سوار دربان موجود تھے۔۔۔سرخ رنگ کا یونیفارم آستینوں پر سفید رنگ کا پلاسٹر چڑھا ہوا جیسے بینڈ باجے والوں کا ہوتا تھا۔۔دربان کی شکل وصورت بھی بینڈ باجے والوں کی سی تھی جسامت ایسی کہ ایک عام فوجی سپاہی بلند آواز سے ''گھرکی'' دے تو سوار، گھوڑے سے لڑکھڑا کر گر پڑے۔۔۔ایسے دربان جان بوجھ کرر کھے گئے تھے۔۔۔کیونکہ یہاں کا بادشاہ بڑا رحم دل اور کریم النفس ہے۔۔یہی وجہ ہے کہ بادشاہ سلامت کے دربان اور محافظ بھی منکسر المزاج ہیں۔۔۔گھوڑا انگڑا، وردی کلف لگی ہو تو پہننے والے کی گردن میں بھی سریا لگ جاتا ہے۔۔۔روایتی دربان تےہم نمائش کے لئے کھڑے کئے گئے تھے تاکہ محکمہ سیاحت کی آمدنی اور بچوں کی دلبستگی کا سامان پیدا ہو۔۔۔۔شاہی دروازے سے ہم نے اندر جھانک کر دیکھا تو ذرا فاصلے پر محل کی اصل عمارت کا اوپری حصہ نظر آیا۔۔۔یقیناً بہت پرشکوہ اور باوقار ہوگا۔۔۔۔

31 اگست 1957 کو ملائیشیا آزاد ہوا۔۔۔جمہوری نظام قائم ہوا مگر بادشاہ کی روایتی حیثیت برقرار رکھی گئی۔۔۔دنیا بھر کے سفیر اسی محل میں آکر بادشاہ کو اپنے ملک کی جانب سے اپنی تقرری کا خط پیش کرتے ہیں۔۔۔بادشاہ ادب، ثقافت اور مذہبی امور کا سربراہ ہوتا ہے جیسا کہ ہم نے پہلے تحریر کیا کہ 9 ریاستوں کے سلطان اپنے میں سے کسی ایک سلطان کو پانچ سال کے لئے بادشاہ منتخب کرتے ہیں۔

King Palac میں ہمیں جو چیز پسند آئی وہ ان کی نامحسوس مہمان نوازی تھی کیونکہ محل کے باہر جہاں مشروبات کی دکانیں تھیں وہاں سیاحوں کے لئے سگریٹ نوشی کی اجازت عام تھی ۔۔۔ہمارا تو بادشاہ سلامت کے بارے میں یہی تاثر ہے کہ وہ بڑا سگریٹ نواز ہے۔۔۔

لندن کے بکنگھم پیلس کے باہر بھی ہم نے روایتی شاہی دربانوں کو کھڑا دیکھا تھا ان کا لباس

ان کی وضع قطع ۔۔۔ان کی ٹانگوں کے نیچے اقبال مہدی کی پینٹنگز کے سے تنومند اور چوکس گھوڑے، بڑا رعب پڑتا ہے۔۔۔دربانوں کو دیکھ کر بھی خوف سا محسوس ہوتا ہے۔۔انگریز سپاہیوں کی وردیاں ہم نے پینانگ کے قلعہ میں دیکھی تھیں۔۔۔۔ریلوے اسٹیشن کے قلیوں کی یونیفارم سے بھی گئی گذری تھیں۔۔۔روایت اور وضعداری کا تو یہی تقاضہ تھا کہ اپنی روایتی وردیوں میں دربانوں کو مریل گھوڑے پر سوار کراتے مگر گورا اپنا ماضی ہی نہیں اپنی اوقات بھی بھول جاتا ہے۔۔۔ملائیشیا کا بادشاہ بھی اپنے ملک کی خوشحالی اور مضبوط اقتصادی ترقی کے پیش نظر اپنے دربانوں کو بھی شاندار یونیفارم اور مشکی گھوڑے مہیا کرسکتا ہے مگر محمود بادشاہ کی طرح انہوں نے اپنا ماضی نہیں بھلایا اور جو قوم اپنا ماضی یاد رکھتی ہے اس کا مستقبل ہمیشہ تابناک رہتا ہے۔۔۔

ہمارے گروپ کے لوگوں نے واپسی کیلئے بس کی تلاش شروع کی۔۔۔اتفاق سے مقررہ وقت پر بس اسی سڑک کے کنارے آکر کھڑی ہوئی۔۔۔اور تمام مسافر ایک ایک کر کے بس میں سوار ہوگئے۔۔۔۔بس اگلی منزل کی طرف روانہ ہوئی۔۔۔اب تک ''سٹی ٹور'' سیاحوں کے لئے نہ تو دلچسپ تھا اور نا ہی معلوماتی۔۔۔بس فوٹو سیشن ہی تھا۔۔۔دیکھیں آگے ہمیں کہاں لے جاتے ہیں۔۔۔

☆☆☆

نگارا میوزیم

گائیڈ نے بتایا کہ اب ہم ملائیشیا کے ایک اہم عجائب گھر کو دیکھنے جا رہے ہیں اس کا نام ہے Nigara Musium --- یہ دراصل ان کا ''نیشنل میوزیم'' ہے اور یہ عجائب گھر ''دمن سرا روڈ'' (Jalan Damansara) پر واقع ہے، تمام مسافر بس سے اترے --- جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ ہمارے ساتھ اٹلی ، جرمنی ، چینی ، جاپانی اور دو ہندوستانی Families تھیں اب تک سب ایک دوسرے سے صورت آشنا ہو چکے تھے بس سے اترتے اور چڑھتے ہوئے ایک دوسرے کو مسکرا کر دیکھنے لگے تھے --- جب بھی موقعہ ملتا تو Excuse me اور Thank you کا بے دریغ استعمال کرتے ---

صدر دروازے سے داخل ہوئے --- بہت کشادہ راہداری ، چند سو قدم چلنے کے بعد الٹے ہاتھ کو مڑنا پڑا --- یہاں ریلوے کے دو بہت پرانے انجن کھڑے تھے جو کوئلے کی مدد سے چلا کرتے تھے --- ذرا آگے ایک بہت پرانی کار کھڑی تھی ، اس کے ماڈل اور Make کا ہمیں اندازہ نہیں لیکن Trusahnan آٹو موبائل کمپنی نے 1985ء میں اس وقت کے وزیر ثقافت ڈاکٹر سلیمان بن حاجی داؤد کو عطیہ کے طور پر دی تھی ، اس کار کو یہاں نمائش کے لئے رکھ دیا گیا ہے ---

ایک بات ہم اور بتاتے چلیں کہ بادشاہ سلامت کی جانب سے مختلف شعبہ حیات سے تعلق رکھنے والی اہم شخصیات کو ''ان کی اعلیٰ خدمات پر ''دکتور'' کا اعزاز دیا جاتا ہے --- جس طرح برطانیہ میں ''Sir'' کا خطاب دیا جاتا ہے --

میوزیم کی عمارت سے باہر اور بہت سے پرانی چیزیں رکھی ہیں ان میں بگیاں (بغیر گھوڑوں کے) ٹھیلے --- بڑے بڑے مٹی کے برتن --- میوزیم کی عمارت کا صدر دروازہ سڑک کی طرف نہیں ہے --- بلکہ داخلی دروازے سے ذرا پیدل چلنا پڑتا ہے پھر الٹے ہاتھ کو مڑیں تو عمارت نظر آتی ہے --- قومی عجائب گھر کی عمارت انتہائی خوبصورت اور دیدہ زیب ہے --- عمارت کا بیرونی حصہ بہت چوڑا ہے --- انگریزی حرف V کی الٹی شکل ۸ میں دو

منزلہ سرخ چھتیں ہیں اور اصل عمارت سے خاصی اونچی ہیں درمیان میں جو عمارت ہے وہ دس چوکور ستونوں پر قائم ہے۔۔۔ستونوں کے اوپر منڈیر سے ترچھی چھت تک کوئی ڈیڑھ فٹ لمبا ''میورل'' بنا ہوا ہے اسے مصوری یا سنگتراشی کا خوبصورت نمونہ قرار دے سکتے ہیں۔۔۔

اونچائی پر ہونے کی وجہ سے یہ اندازہ نہیں لگا سکے کہ یہ کس کینوس پر بنا ہوا ہے۔۔۔دیوار پر بنا ہے یا مصور کے ہاتھوں نے لکڑی پر گل بوٹوں کا بھی کام کیا

میوزیم میں 2 رنگٹ کا داخلہ ٹکٹ ہے۔۔۔ٹکٹ لیکر ہم اندر داخل ہوئے تو شیشوں کی دیوار کے اس پار گراؤنڈ فلور سیاحوں کے لئے بند کیا ہوا تھا کہ اندر کچھ تعمیراتی اور آرائشی کام ہو رہا تھا ۔۔۔لیکن شیشے کے اس پار ہمیں نئی اور پرانی بہت سی اشیاء نظر آرہی تھیں ان میں جدید انداز کی Souvenir shop بھی تھی،

پہلی منزل پر جانے کے لئے دونوں طرف مخروطی سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔۔۔آرام دہ فرش پر عمدہ قسم کے گول ٹائلز بچھے ہوئے تھے۔۔۔یہاں سے خوبصورت راہداری شروع ہوتی ہے جس کے دونوں جانب دیواروں پر یادگار اشیاء محفوظ ہیں اور اس کے آگے شیشوں کی دیواریں ۔۔۔پہلے حصہ میں 300 سو سال پرانے مصالحہ جات رکھے ہیں مختلف برتنوں اور پلیٹوں میں یعنی مرچیں۔۔۔کالی مرچیں۔۔۔جائفل۔۔۔جاوتری وغیرہ وغیرہ

اس کے بعد ایک بڑی پرانی کشتی کا ماڈل ہے 30 فٹ لمبی تو ہوگی اس میں توپیں لگی ہوئی ہیں اور وہ چیزیں موجود ہیں جو پرانے وقتوں کی جنگی کشتی میں لگی ہوتی تھیں، دور سے دیکھیں تو حقیقت کا گمان ہوتا تھا۔۔۔ایک حصہ میں مختلف قسم کی پرانی تلواریں۔۔۔چھوٹی توپیں۔۔۔ اس کے آگے چلے تو دیکھا۔۔۔گھروں اور باورچی خانے میں عام استعمال ہونے والے چھوٹے بڑے پالش کئے ہوئے برتن رکھے تھے۔۔۔ایسے ہی تھے جیسے پرانے وقتوں میں ہمارے گھروں میں استعمال ہوتے تھے۔۔۔جیسے مرتبان۔۔۔پلیٹیں۔گلاس۔۔۔ہانڈی (اس میں آج بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی) کونڈے (۲۲ رجب والے نہیں) آگے بڑھے۔۔۔ایک حصہ میں بڑے قرینے سے چھریاں۔۔۔چھرے۔۔۔چاقو۔۔۔ڈھال اور مختلف اقسام کی تلواریں زنگ آلودہ نہیں۔۔۔صاف اور چمکدار۔۔۔اس کے بعد ایک شوکیس میں بہت سے پرانے میڈلز رکھے ہوئے تھے میڈلز دیکھ کر ہم کندھوں کو یاد کرتے رہے جن پر یہ کبھی سجائے گئے تھے۔۔۔یہ میڈلز ان کو دیئے جاتے ہیں جو میدان جنگ میں اپنے ساتھیوں کے مقابلے میں

زیادہ بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے میدان جنگ سے کامیاب واپس لوٹتے ہیں ۔۔۔یا مارے جاتے ہیں اور بعد میں ان کے ورثاء کو پیش کر دیئے جاتے ہیں۔۔۔ بہادری کیا ہے۔۔۔؟

ا۔اپنے دفاع میں جنگ کرنا۔۔

۲۔دوسروں کی سرزمین پر قبضہ کرنے کے لئے معصوم اور بے گناہ لوگوں کو قتل کرنا۔

۳۔دشمن کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہونچانا۔

ایک اور خیال آیا۔۔۔دشمن کون ہوتا ہے دشمن کی تعریف کیا ہے۔۔۔۔؟

ہم جن میڈلز کو دیکھ رہے تھے یہ برٹش آرمی کے میڈلز تھے ۔۔اپنے جزائر چھوڑ کر یہ گورے۔۔۔ہزاروں میل دور کا سفر کر کے سب سے پہلے پینانگ میں آئے تھے۔۔۔یہاں جو لوگ 300 سال پہلے رہا کرتے تھے ان سے گوروں کی کیا دشمنی تھی۔۔۔۔خیر یہ سب سوال غیر ضروری تھے۔۔۔عجائب گھر میں ہم نے چھری، چاقو اور تلواریں دیکھیں ان چیزوں کے سوا انگریزوں کے پاس کوئی اور ہتھیار نہیں تھے۔۔۔سوائے توپوں کے۔۔۔اس کا مطلب تو یہی ہوا نا کہ چھری چاقو اور تلوار کے بل بوتے پر انگریزوں نے اس سرزمین پر قبضہ کر لیا۔۔۔یہاں کے لوگوں کے پاس تو چھری چاقو بھی نہیں ہونگے اگر ہوتے تو وہ اپنی مقدس دھرتی پر غیر ملکیوں کے ناپاک قدموں کو کیوں کر برداشت کرتے، مجھے خیال آیا کہ یہ میڈلز اور تمغے تو ان فوجیوں کو دیئے گئے ہونگے جنہوں نے معصوم اور ہنستے کھیلتے ملائے عوام کو دھوکے سے قتل کیا ہوگا۔۔۔!!

اب نہ قاتل بچا نہ مقتول۔۔۔۔دونوں مٹی اوڑھ کر زمین کی خوراک بن گئے صرف میڈلز اور وردیاں رہ گئیں۔۔۔جو عام سیاحوں کے لئے درس عبرت ہیں۔۔۔ان میڈلز کو کون سیلوٹ کرتا ہوگا۔۔۔ان وردیوں کو عقیدتمندانہ نظروں سے کون دیکھتا ہوگا۔۔۔؟؟

ہم ظلم و جبر کر کے جو مسرتیں حاصل کرتے ہیں۔۔۔وہ کے روزہ ہیں۔۔۔؟؟

عجائب گھر میں بڑی بڑی سائز کی بہت سی تصاویر بھی ہیں، جن میں انگریز فوجیوں کے گروپ فوٹوز وغیرہ شامل ہیں۔راہداری آگے جا کر کشادہ ہوگئی۔۔۔یہاں ایک خاصا بڑا بحری جہاز موجود تھا۔۔۔اس پر سلور رنگ کا پینٹ کیا ہوا تھا۔۔۔یہ بھی ماڈل تھا۔۔۔اصل تو خیر کہاں ہوگا البتہ اس میں ایک بٹن لگا ہوا تھا جسے آپ Push کریں تو بحری جہاز کے انجن اسٹارٹ ہونے اور ازاں بعد جہاز کے چلنے کی آواز آتی ہے۔۔۔ہمارا جی چاہا کہ بٹن دبا کر

پرانے زمانے کے جہاز کی آواز سنیں، پھر خیال آیا کہ یہ لوگ بڑے کمرشل ہیں، بٹن دبانے کے بعد کسی نے ہاتھ پکڑ لیا کہ آپ اتنے رنگٹ ادا کریں بصورت دیگر ہمارے ساتھ چلیں۔۔۔۔ نیچے ۔۔۔ ہمارے دفتر میں۔۔۔۔ تو ہم کیا کریں گے۔۔۔ چند دن یہاں رہ کر ہمیں اندازہ ہو گیا تھا کہ دشوار اور محنت طلب کام یہاں مرد ہی کرتے ہیں اگر ہمیں کوئی یقین دلا دیتا کہ بٹن دبانے کے بعد کوئی خاتون آپ کا ہاتھ پکڑ لیں گی۔۔۔۔ اور اپنے ساتھ لے جائیں گی۔۔۔۔۔ نیچے۔۔۔۔ یعنی اپنے کمرے میں۔۔۔۔ اس کے بعد پھر اگر جرمانہ بھی طلب کرتے ہیں تو ہم اسے خطرہ سمجھ کر بطور فطرہ ادا کر دیتے۔۔۔۔

ہم نے یہاں ایک سائیکل دیکھی۔۔۔۔ 1941 میں تیار ہوئی تھی۔۔۔۔ اسی سال یعنی 1941 کو ہم اس دنیائے فانی میں آئے تھے۔۔۔۔ اس لئے سائیکل سے ہم عمری کا رشتہ سا محسوس ہونے لگا۔۔۔ حیرت ہوئی کہ 67 سال گذرنے کے باوجود سائیکل ویسی ہی تھی جیسی ہمارے چوکیدار کے پاس ہے۔۔۔۔ 67 برس کے بعد دنیا بالکل بدل گئی۔۔۔ لوگ مانیں یا نہ مانے سچی بات تو یہ ہے کہ دنیا میں آج جتنی ترقی آپ لوگ دیکھ رہے ہیں یہ ہماری پیدائش کے بعد ہی رونما ہوئی ہیں۔۔۔۔ ہم نسلِ انسانی پہ کوئی احسان جتانا نہیں چاہتے لیکن۔۔۔۔ ٹرانزسٹر۔۔۔۔ ریڈیو۔۔۔۔ ٹیلی ویژن۔۔۔۔ اور کمپیوٹر سے لے کر موبائل فون تک ساری ایجادات ہماری پیدائش کے بعد ہوئیں۔۔۔۔ کیا آپ اس سے انکار کریں گے۔۔۔ کہ خلاؤں کو چیر کر انسان نے چاند کے ماتھے پہ سیندور بھی ہماری پیدائش کے بعد ہی لگایا تھا۔۔۔ خیر اللہ جسے عطا کرے۔۔۔۔ جسے توفیق دے۔۔۔۔ اگر آپ بھی ان حقائق کو نہ بھی تسلیم کریں تب بھی بقول برادرم محمد ایوب ہم نے ان باتوں پہ کبھی غرور نہیں کیا۔۔۔ معاف کیجئے گا انسان ہوں کبھی کبھی اپنے کارناموں کا ذکر بلا ارادہ زبان پر آجاتا ہے۔۔۔۔ معذرت چاہتا ہوں۔۔۔ بات سائیکل کی ہو رہی تھی، ایسی فائدہ مند اور غریب پرور ایجاد ہے کہ 1941 میں جس شکل وصورت اور قد وقامت کی تھی ویسی ہی آج بھی ہے۔۔۔ ہاں بعض ترقی یافتہ ملکوں نے اس پر تجربات کئے نتیجہ کے طور پر وہاں کی سائیکل کو پولیو کا مرض لاحق ہو گیا اسی لئے عوام میں مقبول نہ ہو سکی۔۔۔ صرف Cycle race میں حصہ لینے والے کھلاڑی ''پولیو زدہ سائیکل'' استعمال کرتے ہیں۔ اور حالت سجدہ میں اسے چلاتے ہیں، ڈرتے ہیں کہ کہیں سائیکل کا مرض انہیں نہ لگ جائے اسی لئے اکثر کولہے اٹھا کر چلاتے ہیں۔۔۔ اور انعام اور میڈل حاصل کرنے کی خاطر سر نیہوڑا کر سائیکل

چلاتے ہیں۔۔۔۔ سائیکل کے حوالے سے ایک بات غور طلب ہے کہ اس کا نام رکھتے وقت سائیکل کمپنیاں بہت غور وفکر کرتی تھیں۔۔۔۔ بالکل اسی طرح جیسے 30-20 برس پہلے تک والدین اپنے نوزائیدہ بچے کا نام رکھتے وقت اچھے ناموں کا چناؤ کرتے تھے۔۔۔۔ پنڈت اور مولوی سے پوچھتے۔۔۔ قرآن کریم سے نکالتے یا ''مثنوی مولانا روم'' میں نام ڈھونڈتے تھے سائیکل بنانے والی کمپنیوں نے بھی سائیکل کا نام رکھنے میں بہت۔۔۔۔ احتیاط برتی۔۔۔۔ اور لائق بادشاہوں اور جری پہلوانوں کے نام پر سائیکل کے نام رکھے جیسے۔۔ ہرکیولس۔۔۔۔ سہراب۔۔۔ رستم۔۔ یہی نام ہیں نا سائیکلوں کے۔۔۔۔ بس یہ بھی اللہ کا کرم ہے ہمارے ساتھ جو چیز دنیا میں آئی۔۔ وہ خلق خدا کے کام آئی۔۔۔۔ لیکن ہم نے اس پر کبھی غور نہیں کیا۔۔

آگے چلے۔۔۔ ایک شیشے کے گھر میں لائف سائز کے ماڈل بنے ہوئے تھے، ملائے غلاموں پر انگریز حاکموں کے کارندے ظلم کر رہے تھے۔۔۔ یہ منظر تکلیف دہ تھا۔۔۔ طبیعت مکدر ہوگئی

اسی طرح ایک اور کمرے میں چھ لائف سائز فوجیوں کے یونیفارم سمیت ماڈلز بنائے گئے تھے۔۔۔۔ یونیفارم کا ذکر ہم نے اس لئے کیا ہے کہ پچھلے منظر میں ملائے غلام ننگ دھڑنگ تھے۔۔۔۔ بس ایک کچھنا یا لنگوٹ باندھی ہوئی تھی ہوسکتا ہے کہ انگریزوں نے ظلم کرتے وقت ملائے غلاموں کو ننگا کر کے مارا پیٹا ہو لیکن بعد میں ملا ایشیا کے حکمرانوں نے ستر پوشی کے لئے انہیں لنگوٹ پہنا دی ہو۔۔۔۔۔۔'' خیال رہے کہ مذکورہ چھ ماڈلز میں دو خواتین بھی تھیں۔۔۔۔ یونیفارم میں ملبوس ان فوجیوں میں چینی کمیونسٹ بھی تھے۔۔۔۔ ایک حصہ میں پانی بھرنے کے پرانے ڈول پڑے تھے رسی اور کندھے پر رکھنے والی لکڑی بھی تھی۔۔۔ 300 برس پہلے پانی بھرنے کا یہی رواج تھا۔۔۔۔ ہمارے دیہی علاقوں میں کنویں سے پانی گھر لانے کے لئے اب بھی یہی طریقہ رائج ہے۔

ایک شوکیس میں بہت سی ٹوپیاں رکھی تھیں۔۔۔۔ مختلف قسم کی۔۔۔۔ وہ ٹوپیاں جو بادشاہ اور ان کے امراء عام حالات میں پہنتے تھے۔۔۔ ہاں ایک ٹوپی تاریخ کا حصہ بن گئی۔۔۔۔ یہ ٹوپی اعلان آزادی کے بعد ۳۱ اگست 1957 کو راجہ آف پیرس المرحوم سید حسن جمال نورانی نے اپنے سر پر اوڑھی تھی۔۔۔۔ یہ ٹوپی ملا ایشیا کے عوام کو غلامی سے نجات پانے کی یاد دلاتی ہے۔

ایک حصہ میں دیوار کے ساتھ بڑے اسکرین پر ایک ڈاکومینٹری دکھائی جارہی تھی اور

اسکرین کے سامنے 35-30 سیاحوں کے بیٹھنے کے لئے آرام دہ نشستوں کا اہتمام کیا گیا تھا۔۔

یہاں جو چیز ہمیں سب سے زیادہ پسند آئی وہ ''یوم آزادی'' کی پلیٹ ہے۔۔۔۔اس پلیٹ پر ملا ایشیاء کا جھنڈا اور ان کا قومی نشان ثبت ہے۔۔۔۔ یہ بیحد دیدہ زیب اور خوبصورت ۔۔۔۔اسی طرح اس شوکیس میں وہ Bages بھی رکھے گئے ہیں جو یوم آزادی کے دن تیار کئے گئے تھے۔۔۔۔ یہاں ایک قلم بھی رکھا ہے۔۔۔۔اسے ''یوم آزادی'' کی یادگار قرار دیا جاتا ہے۔

☆☆☆

قومی یادگار

تمام مسافر بس میں واپس آ گئے ہم نیشنل مانومنٹ دیکھنے جا رہے ہیں، راستے میں اور کئی تاریخی عمارتیں اور مقامات گذرتے ہوئے دیکھے۔۔۔لیکن چونکہ ''سٹی ٹور'' میں یہاں Stop نہیں تھا اس لئے تفصیل سے ان تاریخی اور مشہور مقامات کو نہیں دیکھ سکے۔۔۔بیشتر مقامات چونکہ آزادی حاصل کرنے کے بعد تعمیر کئے گئے ہیں اس لئے وہ بہت وسیع و عریض رقبے پر پھیلے ہوئے ہیں۔۔۔قومی یادگار بھی بہت بڑے علاقہ پر تعمیر کی گئی ہے۔۔۔

یہاں پارکنگ کے لئے وسیع جگہ موجود ہے اس کے بعد چند سیڑھیاں چڑھ کر ایک چوکور مینار نظروں کے سامنے آتا ہے۔۔۔لیکن اس کے چاروں طرف ایک کشادہ Pool ہے س کے بعد بہت بڑا تخت ہے یہ تخت ایک ایک فٹ کم ہوتا جاتا ہے تقریباً دس سیڑھیوں کے بعد جو تخت ہے اس پر ایک چوکور بلند مینار بنایا گیا ہے۔۔۔چوطرفہ حوض میں پانی ہے اور چونکہ حوض میں نیلے رنگ کے ٹائلز لگائے گئے ہیں اس لئے نیلگوں پانی ہلکورے کھا رہا تھا اس کے اردگرد بہت سے اونچے فوارے نصب ہیں

اس سے باہر کا افرش بہت خوبصورت اور صاف و شفاف ہے۔۔۔اس پر سفید پٹیوں سے بڑے بڑے جو گوشے بنائے ہوئے ہیں جیسے شطرنج کی بساط پر خانے ہوتے ہیں۔۔۔ آگے بڑھیں ذرا اوپر ایک پلیٹ فارم پر قومی یادگار قائم ہے۔۔۔اس کے سامنے دور تک بہت کشادہ حوض ہے۔۔۔اور اس میں بہت سے فوارے فضا میں بلند ہو کر انار کی طرح پھوٹ رہے ہیں۔۔۔پلیٹ فارم کے اوپر پتھروں سے بنایا ہوا خوبصورت تراشیدہ چبوترہ ہے اس کے اوپر تانبے کا ایک انتہائی خوبصورت مجسمہ بنا ہوا ہے اس مجسمہ کا ڈیزائن امریکی مجسمہ ساز Felix de weldon نے تیار کیا ہے۔۔۔اس مجسمہ کی اونچائی 15.5 میٹر ہے۔۔۔پہلی ہی نظر میں یہ مجسمہ۔۔۔دیکھنے والے پر ایک عجیب سی کیفیت طاری کر دیتا ہے۔۔۔دراصل یہ مجسمہ ان شہیدوں اور مجاہدوں کی یاد دلاتا ہے جو انگریز سامراج اور ازاں بعد کمیونسٹوں کے خلاف اپنے وطن کی حفاظت کے لئے جنگ کرتے رہے ہیں۔۔۔ابتدا میں دو فوجیوں کو شہید دکھایا گیا ہے ایک

فوجی زخمی ہے۔۔۔دوسرا سپاہی زخمی فوجی کو سہارا دے کر اٹھا رہا ہے جبکہ دو فوجی جوان ہاتھوں میں بندوق لئے کھڑے ہیں اور ان کے عقب میں ذرا بلندی پر ایک فوجی ہاتھ میں نیزہ لیکر فتح کا اظہار کر رہا ہے۔۔۔یہ مجسمہ، ملائیشیاء کی جنگ آزادی کی علامت ہے Felix de weldon نے کمال مہارت سے جنگ آزادی میں حصہ لینے والے جوانوں کے مختلف جذبات کی عکاسی کی ہے اور ملائیشین فوج کا Moto بیان کیا ہے یعنی Unity, Strenght, Leadership Sacrifice, Courage, Suffring and vigilance اس مجسمہ کے ذرا نیچے چبوترے نما پلیٹ فارم پر نصب ایک تختی پر لکھا ہے۔۔ Dedicated to the great fighter in the cause of peace and freedom, May the blesing of Allah be upon him

میری زبان پر ان تمام شہیدوں اور مجاہدوں کے حق میں دعا کے الفاظ کانپنے لگے جنہوں نے اپنے وطن کی آزادی کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔۔ان کی قربانی رائیگاں نہیں گئی کہ آج ملائیشیاء بظاہر ایک چھوٹا ملک ہے لیکن آزاد بھی ہے اور یہاں کے عوام خوشحال بھی ہیں۔

راستے میں گذرتے ہوئے سلطان عبدالصمد بلڈنگ دیکھی۔۔۔۔ بہت خوبصورت، پروقار اور پرشکوہ عمارت ہے۔۔۔۔KMC کراچی کی عمارت کی طرح اس کے دائیں بائیں دو گنبد ہیں اور ان کے درمیاں ایک بلند ٹاور پر ایک گنبد ہے اور گنبد کے نیچے چوکور تخت پر چار بڑے گھڑیال لگے ہوئے ہیں یہ عمارت 1897 میں تعمیر کی گئی تھی۔۔۔۔سلطان عبدالصمد بلڈنگ تعمیر سازی کا نادر نمونہ ہے اس عمارت کو Court Complex میں تبدیل کر دیا گیا ہے اور اب یہ عمارت اعلیٰ عدالتوں کے منصفین کی رہائش گاہ کے طور پر استعمال کی جارہی ہے اس سے پہلے یہاں 1888 میں کرکٹ گراؤنڈ ہوتا تھا۔۔بتایا گیا کہ اسی مقام پر ۳۱ اگست 1957 کو آزادی کا پرچم لہرایا گیا تھا اور یونین جیک اتارا گیا تھا اب یہاں دنیا کا سب سے بڑا Flag pole نصب کیا گیا ہے۔۔۔۔۔ہم اب تھک گئے تھے اور بس کی رفتار بھی سست ہوگئی تھی۔۔۔گائیڈ بھی سیاحوں سے بے نیاز ہو کر اخبارات کی سرخیاں دیکھنے میں گم ہو گیا تھا۔۔کچھ دیر بعد ایک بار پھر گائیڈ کھڑا ہوا اور اس نے آس پاس کے علاقہ کی تفصیل بتانا شروع کی۔۔۔یہ چائنا ٹاؤن ہے۔۔۔یہ سینٹرل مارکیٹ ہے۔۔۔اس موقع پر کچھ مسافروں نے کہا کہ ہم چائنا ٹاؤن Visit کرنا چاہتے ہیں۔۔۔۔گائیڈ نے بتایا کہ پروگرام کے مطابق یہاں پر بس روکنا ہمارے لئے ممکن

نہیں ۔۔۔ جو مسافر اترنا چاہیں وہ اتر جائیں لیکن انہیں اپنی اپنی ہوٹلوں تک خود جانا ہوگا ۔۔۔ یہاں سے بسیں جاتی ہیں اور ٹیکسی بھی جاتی ہیں ٹیکسی کو پانچ رنگٹ سے زیادہ نہ دیجئے گا ۔۔۔ اور ہاں، آپ یہاں Bargaining کر سکتے ہیں مسافروں نے باہم مشورہ کیا، بیگم بھی شاپنگ میں Interested تھیں اس لئے چینی، جاپانی اور انڈین فیملیز کے ساتھ ہم بھی چائنا ٹاؤن کے قریب اتر گئے ۔۔۔ بس چلی گئی ۔۔۔

چائنا ٹاؤن جانے کا ارادہ کیا تو قمر علی عباسی یاد آ گئے ۔۔۔ زمانہ طالب علمی کے دوست ہیں، ۱۹۶۰ء کی ابتدائی دہائی سے ہم نے کم وبیش ایک ساتھ ہی لکھنا شروع کیا تھا ۔۔۔ روزنامہ جنگ کراچی میں ہم دونوں لکھا کرتے تھے ۔۔۔ اس زمانہ میں شفیع عقیل بزم نوآموز منصفین کے نگران ہوتے تھے ۔۔۔ ہمیں ان کی شفقت حاصل تھی انہی دنوں ہم نے روزنامہ امروز کراچی میں بھی لکھنا شروع کیا مرحوم افضل صدیقی ''بزم امروز'' کے صفحہ کے ابو بھیا تھے اور طاہر نقوی، نوشابہ صدیقی، شمی تھانوی، کامل احمر، سید کاظم رضا، قدیر غوثی، قدسیہ خان، ہارون رشید، ایم الیاس، عارفہ شمسہ، شاہد حسین بخاری، نیر بن سوز، یونس ہمدم، رشید شکیب، عرفان عابدی وغیرہ باقاعدہ سے لکھا کرتے تھے ۔۔۔ اسکول سے کالج میں آئے تو قمر علی عباسی کے ساتھ بین الکلیاتی مباحثوں میں شرکت کرنے لگے ۔۔۔ ابتدا ہی سے قمر علی عباسی بے حد شرارتی تھے ہمہ وقت جملہ بدست اور فقرہ بکف رہتے تھے، عملی زندگی میں آئے تو قمر علی عباسی ریڈیو پاکستان سے وابستہ ہوگئے ۔۔۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لئے انہوں نے بڑے مقبول ڈرامے لکھے ۔۔۔ ازاں بعد سفرنامہ کی طرف متوجہ ہوئے ۔۔۔ پھر ایسا وقت آیا کہ ''سفرنامہ'' نے ان کا قلم پکڑ لیا ۔۔۔ اب ماشاءاللہ ان کا شمار دنیا میں سب سے زیادہ ''سفرنامے'' لکھنے والوں میں ہوتا ہے۔

اب سے تقریباً تیس سال پہلے انہوں نے ''چلا مسافر سنگاپور'' تحریر کیا تھا ۔۔۔ سنگاپور گئے تو دو تین دن کے لئے پینانگ اور کوالالمپور کا چکر لگا آئے ۔۔۔

''چلا مسافر سنگاپور'' میں انہوں نے مذکورہ دونوں شہروں کے بارے میں چند صفحات لکھے ہیں ۔۔۔ چائنا ٹاؤن کی طرف قدم اٹھائے تو ان کی تحریریں ذہن میں تازہ ہوگئیں ۔۔۔ قمر علی عباسی نے سیاحوں کو مشورہ دیا تھا کہ چائنا ٹاؤن مت جانا ۔۔۔ کیونکہ وہاں آئے دن فائرنگ ہوتی ہے، گولیاں چلتی رہتی ہیں ۔۔۔ بازار میں بھگدڑ مچ جاتی ہے ۔۔۔ دکانیں لوٹ لی جاتی ہیں ۔۔۔ مزید نصیحت کی کہ ۔۔۔

☆ سڑک پر پیدل چلنے سے گریز کریں کہ موٹر سائیکل ڈرائیور پرس چھین کر بھاگ جاتے ہیں

☆ قیمتی چیزیں ہوٹل کے لاکرز میں رکھیں

☆ دکان اور ٹھیلے والوں سے سامان نہ خریدیں

☆ ساحل پر اپنا قیمتی سامان نہ رکھیں

☆ ہوٹل کا دروازہ کھولنے سے پہلے Key hole سے جھانک کر دیکھ لیں

☆ ان دنوں ملائیشیاء کا سکہ ڈالر کہلاتا تھا اور ۱۰۰ امریکی ڈالر کے بدلے ۲۵۰ ملائیشین ڈالر ملتے تھے

ملائیشیا آنے سے پہلے ہم نے ان کی کتاب دوبارہ نہیں پڑھی تھی۔۔۔ اگر پڑھ لیتے تو ہرگز یہاں نہ آتے۔۔۔ لیکن اچھا ہوا کہ ہم ''چلا مسافر سنگاپور'' پڑھ کر بھول گئے۔۔۔۔ اب ملائیشیا کی حکومت کو ہمارا شکر گذار ہونا چاہئے کہ ہم نے جدید ملائیشیا کو سیاحوں سے متعارف کروایا ہے۔۔۔۔ ہمارا یقین ہے کہ ہماری کتاب کی اشاعت کے بعد ملائیشیا میں سیاحت کی صنعت کو مزید فروغ حاصل ہوگا۔۔۔۔ اب زمانہ بدل گیا ہے۔۔۔۔ قمر علی عباسی نے جس ملائیشیا کو دیکھا تھا وہ بھی بدل گیا۔۔۔۔۔ لیکن چائنا ٹاؤن جاتے وقت ہم ذرا ڈرے ہوئے تھے۔۔۔۔ موجودہ ''چائنا ٹاؤن'' کا حال ہم بعد میں لکھیں گے پہلے قمر علی عباسی کی مذکورہ نصیحتوں میں سے صرف تین پر تبصرہ کرتے چلیں

قمر علی عباسی نے مشورہ دیا تھا کہ قیمتی چیزیں ہوٹل کے لاکرز میں رکھیں۔۔۔۔ قمر تمہارا بہت شکریہ بڑا صائب مشورہ ہے مگر کیا کریں۔۔۔۔ پاسپورٹ، ہوائی ٹکٹ اور ہوٹلوں میں بکنگ کے کاغذات کے علاوہ اپنی اکلوتی بیگم اور ''ہینڈ میڈ ٹکیاؤں'' کے سوا کوئی اور قیمتی چیز ہمارے پاس نہیں تھی۔۔۔۔ ہماری معلومات کے مطابق حیران کن ترقی کرنے کے باوجود اب تک ملائیشیا کی Hotels میں اتنے کشادہ لاکرز موجود نہیں ہیں جہاں بیگم کو محفوظ کیا جائے ورنہ سچ بات تو یہ ہے کہ تمہارا یہ مشورہ ہمارے مفاد میں تھا۔۔۔ اکیلے ہوتے تو ہم بھی کسی چینی گڑیا سے مساج کرا لیتے اور واپس آکر دوستوں کے طعنے سننے سے بچ جاتے

دوئم یہ کہ اب یہاں کی ہوٹلوں میں Key hole نہیں ہوتے بلکہ Key card ہوتے ہیں۔۔۔ اگر ہم اس زمانے میں کوالالمپور آتے تو صرف اپنے ہی کمرے کے دروازے

سے جھانک کر نہیں دیکھتے بلکہ احتیاطاً تمام کمروں کے Key Hole سے جھانکتے کہ بچپن کی عادتوں کو دہرانے کا اس سے بہتر موقع اور کہاں میسر آ سکتا تھا۔۔۔ہاں تیسرا مشورہ کہ ساحل پر قیمتی سامان نہ رکھیں، ہمیں اپنے لئے پسند آیا۔۔۔لیکن سیاحوں کو اب یہ مشورہ دینا فضول ہے کہ ۔۔۔ساحل پر جانے والوں کے پاس ان دنوں سب سے قیمتی سامان ان کا جامہ ہوتا ہے۔۔۔آپ قیمتی سوٹ پہن کر ساحل پر گئے ہونگے۔۔۔اب بدن کی کل کائنات اپر اور شارٹ ہوتی ہے۔۔۔بعض منچلے تو ساحل پر پہنچنے سے پہلے ہی جامہ سے آزاد ہو جاتے ہیں۔۔۔

چائنا ٹاؤن کے آس پاس کا علاقہ شہر کا پرانا حصہ ہے، ۔۔۔چائنا ٹاؤن جانے کے لئے بس سے اترے تو میٹھادر اور کھارادر کی طرح گلیاں اور بازار ہیں لیکن نسبتاً زیادہ کشادہ ہیں، دکانیں اور مکانات دو تین منزلوں سے زیادہ نہیں ہیں۔۔۔مگر تمام عمارتیں صاف ستھری ہیں، پرانا طرز تعمیر ہے لیکن اکھڑے پلاسٹر کی دیوار خستہ حال گیلریاں اور مخدوش مکانات نہیں ہیں، تمام عمارتوں کے بیرونی حصہ میں رنگ یا پتائی کی ہوئی ہے۔۔۔خیال رہے کہ ملائیشیاء کے قانون کے مطابق اپنے گھر، مکان یا عمارت کے بیرونی حصوں کو ہر سال رنگ کرانا ہے۔۔۔اسے داغ دھبوں سے محفوظ رکھنا لازمی ہے۔۔۔یہی وجہ ہے کہ قدیم علاقہ ہونے کے باوجود صاف ستھرا ہے۔۔۔چائنا ٹاؤن کے آس پاس کی گلیوں میں ٹرانسپورٹ کی آمدورفت پر پابندی ہے۔۔۔ لوگوں کی اتنی ہی بھیڑ ہے جتنی صدر اور لیاقت آباد کی تجارتی گلیوں میں ہوتی ہے یہاں سیاحوں کا اژدھام تھا۔۔۔بلاشبہ آپ کہہ سکتے ہیں کہ کھوے سے کھوا چھلتا ہے، ہمیں تو یہ جگہ پسند آئی کہ کھلے بازوؤں اور ننگی پیٹھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے ۔۔۔۔Sorry اور Excuse روانی سے بولنے لگے۔۔۔چائنا ٹاؤن کی گلیوں میں ٹھیلے لگا کر اور دکان کا مال فٹ پاتھ پر رکھ کر بیچا جاتا ہے۔۔۔یہاں کا منظر دیدنی تھا۔۔۔نوجوان لڑکوں کی ٹولیاں لڑکیوں کو چھیڑنے کے لئے اسی طرح سج دھج کے آتی ہیں جیسے چاند رات کو طارق روڈ کراچی اور انارکلی لاہور میں نوجوان اپنے اپنے چاند چہروں کی تلاش میں آتے ہیں۔۔۔۔نوجوان ہاتھوں میں سامان لئے ہر آنے جانے والے کے پیچھے پڑ جاتے ہیں، Belt۔۔۔۔wrist watch۔۔۔ٹی شرٹس، لڑکیوں کے اسکارف۔۔۔۔پرس۔۔۔۔اور جانے کیا کیا چیزیں کندھوں اور ہاتھوں پر لٹکائے خواتین پر لٹکے پڑتے ہیں اور گاہکوں کی جان کو اٹک جاتے تھے، بھاؤ تاؤ کا یہ عالم ہے کہ 20 رنگٹ کی چیز، گاہک کے منع کرنے کے باوجود پیچھا کرتے ہوئے گلی کے آخری نکڑ تک پہونچ جاتے ہیں اور 5 رنگٹ

میں بیچ دیتے ہیں۔۔۔۔ ہماری عمر دیکھ کر ذرا ہم پر تو توجہ کم دی لیکن Belt اور گھڑی بیچنے والے پیچھے لگ گئے۔۔۔۔ ہم کبھی ادھر جا کر کھڑے ہو جائیں کبھی کسی اور طرف نکل کر کھڑے ہوں کیونکہ بیگم Shopping میں مصروف اور ہم۔۔۔۔؟؟۔۔۔۔ خیر جانے دیں

''چائنا ٹاؤن'' کے بازار کے اوپر فائبر گلاسز کی رنگ برنگی چھت ڈالی ہوئی تھی تاکہ بارش سے بازار محفوظ رہے اور سورج کی روشنی بھی جھانکتی رہے۔۔۔۔ اسے فیشن ایبل کورڈ مارکیٹ بھی کہہ سکتے ہیں۔۔۔۔ برسوں پہلے سندھ اور پنجاب کے قصبوں میں عام طور پر ٹاٹ کے پردے۔۔۔ ٹین کی چھت یا لکڑیوں کی بلی پر گھاس پھونس بچھا کر سایہ کیا جاتا تھا۔۔۔ البتہ لاہور کی ٹولنٹن مارکیٹ باقاعدہ کورڈ مارکیٹ ہوا کرتی تھی۔۔۔ اب ہم نے برسوں سے دیکھی نہیں، سنا ہے کہ پرانا Elevation برقرار رکھتے ہوئے دوبارہ تعمیر کی گئی ہے

آرٹس کونسل آف پاکستان کراچی کو بھی گورنر سندھ ڈاکٹر عشرت العباد خان نے 50 لاکھ روپے دیئے ہیں تاکہ۔۔۔۔۔ جس سڑک پر ہر اتوار کو کوچہء ثقافت لگایا جاتا ہے اس روڈ پر فائبر گلاس کی چھت تعمیر کی جائے۔۔۔ اس کام کے لئے یہ رقم کم ہے مگر سٹی ناظم مصطفیٰ کمال نے فائبر گلاس کی چھت کی تعمیر میں خرچ ہونے والی فاضل رقم کی بھی منظوری دیدی ہے۔۔۔ اگر آرٹس کونسل یہ کام کر لے تو ہفتہ میں ایک دن ہی سہی کراچی کے لوگ بھی کوچہء ثقافت میں آ کر ''چائنا ٹاؤن'' کوالالمپور کا لطف لے سکیں گے

ہم کھڑے کھڑے تھک گئے تو بیگم سے کہا بھئی اب بس کریں، وقفہ کر لیں تاکہ کہیں بیٹھ سکیں کہنے لگیں کہ چلو کھانا کہیں کھاتے ہیں

چائنا ٹاؤن میں ہر پانچ دس دکانوں کے بعد ہوٹل۔۔۔ ریستوران۔۔ کافی شاپس۔۔۔ اور پھل بیچنے والوں کی دکانیں موجود ہیں۔۔۔۔ یہاں ایک چھوٹی سی چورنگی ہے دونوں طرف گلیاں ہیں، انہیں سڑک کہنا چاہیئے لیکن ٹریفک کی آمد و رفت ممنوع ہے اور سڑک کے درمیان ٹھیلے والے بھی اپنا سامان سجائے کھڑے ہیں۔۔۔ ایک ہوٹل میں رکھی ہوئی Dishes کا ہم نے جائزہ لیا۔۔۔ کھانے پسند آئے۔۔۔ ہم ہوٹل کے اندر چلے گئے۔۔۔ عمارت کا نام ٹام سٹی فوڈ سینٹر تھا۔۔۔ ہوٹل کا کھانا بھی لذیذ تھا۔

خاصا وقت ہو گیا تھا اس لئے بیگم کو ہم نے ہوٹل واپس چلنے پر آمادہ کیا، مختلف گلیوں سے بس اسٹاپ کا پتہ پوچھتے پوچھتے ہم چلتے رہے۔۔۔۔ ویڈیو اینڈ آڈیو کیسٹس کی متعدد دکانیں تھیں

اوران سے چینی گانوں کی آوازیں آرہی تھیں۔۔۔۔۔ذرا آگے چلے تو معلوم ہوا کہ یہ سینٹرل مارکیٹ ہے ہم وہاں سے گذرے، سینٹرل مارکیٹ میں نسبتاً جدید دکانیں ہیں مگران میں زیادہ مقامی چیزیں ملتی ہیں۔ Antiques کی دکانیں بھی تھیں، ان میں پرانے زمانے کی اشیاء سجی ہوئی تھیں۔۔۔۔یہ چیزیں نوادرات میں شامل ہیں اورڈیکوریشن کے کام آتی ہیں شوقین حضرات انہیں بھاری قیمت میں خرید لیتے ہیں۔۔۔بہت سی پرانی چیزوں کے علاوہ یہاں ایک چوڑی باجہ بھی دیکھا۔۔۔اور برسوں بعد His Master Voice کے توے جیسے کالے ریکارڈ بھی دیکھے۔۔۔جن پر کتے کی تصویر چھپی ہوئی تھی۔۔۔۔یہاں دکانوں میں مختلف اشیاء موجود تھیں ان میں چشمے۔آرائش وزیبائش کی چیزیں۔چاندی کے چھلے۔۔۔مقامی گڑیا۔۔۔بچوں کے کھلونے۔۔۔کتابیں وغیرہ شامل تھیں۔۔۔۔،ہم چائنا ٹاؤن سے نکل کر Jalan Hang Lekir سے گذرتے ہوئے سینٹرل مارکیٹ کی دکانوں کو دیکھتے ہوئے ایک سڑک پر آئے۔۔۔۔ یہاں دورویہ سڑک پر بسیں آجارہی تھیں۔

ہم پاکستان سے جو سگریٹ کا اسٹاک لائے تھے وہ تقریباً ختم ہوچکا تھا۔۔۔سڑک کے ساتھ ایک کشادہ فٹ پاتھ پر ہم نے سگریٹ کی دکان دیکھی۔۔۔پان اور گٹکے کے سوا باقی تمام چیزیں یہاں موجود تھیں۔۔۔۔ہم نے ان سے گرانڈ ہوٹل جانے کا پتہ پوچھا اس شریف آدمی نے ہمیں اشارہ سے ذرا آگے کھڑی ہوئی بسوں کی نشاندہی کرتے ہوئے بس نمبر بتایا۔۔۔ہم نے شکریہ ادا کیا اوران سے مقامی سگریٹ Luffman۔۔۔۔خریدا۔۔۔ہم Lnffwomen خریدنا چاہتے تھے مگر دکاندار نے بتایا کہ ملاایشیاء میں اس نام کی سگریٹ ابھی بننا شروع نہیں ہوئی۔

مطلوبہ بس ہمیں مل گئی۔۔۔۔اس کے چلنے میں ابھی دیر تھی کہ یہاں سے بسیں اپنے مقررہ وقت پر روانہ ہوتی ہیں۔۔۔پندرہ منٹ بعد بس روانہ ہوئی اور تقریباً اتنی ہی دیر میں ہم جالان راجہ لاؤٹ پر انٹرنیشنل یونیورسٹی کالج کے بس اسٹاپ پر اتر گئے۔۔۔ہمارے سامنے پلازہ ہوٹل اور اس کے برابر ہماری ہوٹل۔۔۔۔سڑک پار کرکے ہم اپنے ہوٹل آگئے۔

شام کو آرام کیا۔۔۔مغرب سے پہلے اٹھے شاور لیا۔۔۔تیار ہوئے بیگم نے چاء بنائی۔۔۔مغرب کی اذان کا انتظار تھا۔۔۔دیوار پر گرے پردہ کو ہم نے پہلے ہی سرکا دیا تھا۔۔۔ بستر پر لیٹے لیٹے ٹوئن ٹاور اور KRL Tower دونوں ہماری نگاہوں کے سامنے تھے۔۔۔چاء تیار ہوئی تو صوفے پر آکر بیٹھ گئے یہاں سے بھی شہر کی عمارتیں نظر آرہی تھیں۔۔۔سینکڑوں بلند

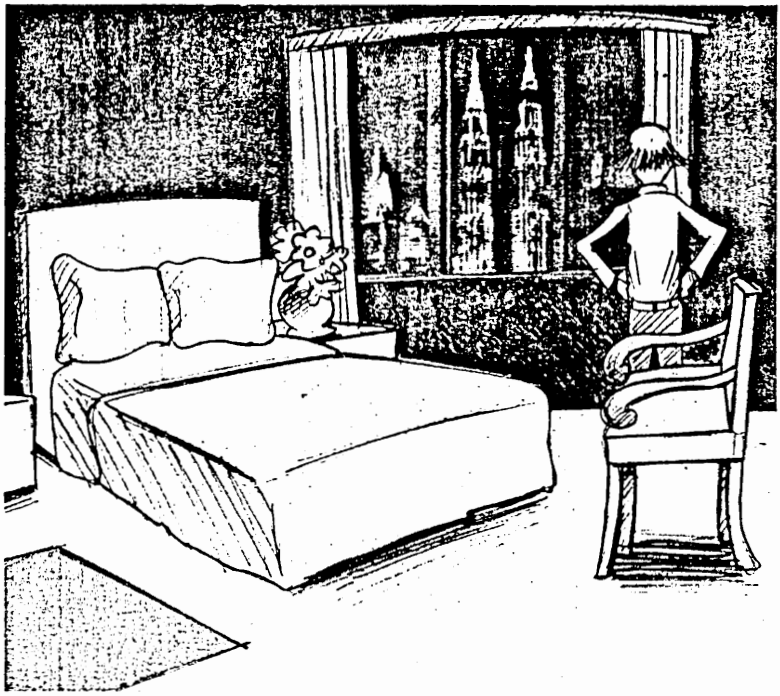

عمارتیں جہاں خلاء تھا وہاں سرسبز وشاداب پہاڑیاں، بہت خوبصورت منظر تھا۔۔۔اس وقت چاء کے ساتھ بسکٹس اور نکیاؤں نے بڑا مزہ دیا۔۔۔

اچانک مغرب کی اذان کی آواز سنائی دی۔۔۔پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے ٹوئن ٹاور سے روشنی پھوٹنے لگی۔۔۔ ساتھ ساتھ آس پاس کی عمارتوں کےNeon signروشن ہونے لگے پھر سب سے بلند عمارتKRL Tower کی ابتدائی منزلوں پر دودھیا اجالوں کے کے اندر سے رنگ برنگی روشنیاں طلوع ہونے لگیں۔

KLR Tower دنیا کی ایک بلند عمارت ہے۔بنیادی طور پر یہ ایک ٹاور ہے انتہائی بلندی پر جا کر اس میں گیارہ فلور بنائے گئے ہیں اور دور سے دیکھنے میں یہ گیارہ فلور ایک گیند کی شکل میں نظر آتے ہیں اس کے اوپرTelecomunication ٹاور ہے ۔۔۔ اسی بلندی پر ایکRevolving ریستوران ہے۔۔۔۔عام سیاحوں کے لئے صبح سات بجے ٹوکن تقسیم کئے جاتے ہیں۔۔۔جو لوگ ٹاور کے اوپر جانے کے خواہشمند ہیں وہ صبح سویرے قطار میں آ کر شامل ہو جاتے ہیں ۔۔مقررہ ٹوکن کی تعداد محدود ہے اس لئے جو پہلے آئے وہ پہلے پائے ۔۔۔

۔۔۔کہیں اس ٹاور کو پانچواں بلند ترین ٹاور لکھا گیا ہے۔۔۔بلند عمارتوں کے بارے میں ہمارے پاس معتبر ریکارڈ موجود نہیں ہے۔۔۔اصل میں بعض عمارتیں رہائشی عمارتیں ہیں۔۔۔بعض عمارتیں ٹاور ہیں، ان میں رہائشی حصہ نہیں ہے۔۔۔بلکہ۔۔۔ٹاور کے طور پر تعمیر کئے گئے ہیں جیسے C.N Tower ٹورنٹو کینیڈا۔۔۔چند عمارتیں پانی میں تعمیر کی گئیں ہیں۔۔۔جیسے Gulf of Maxico میں Petronius Plate Form پر ایک ٹاور بنایا گیا ہے اسکی بلندی 610 میٹر ہے۔۔۔لیکن سطح سمندر سے اسکی اونچائی کم ہے۔۔۔ہم نے پچھلے صفحات میں دنیا کی بعض بلند عمارتوں اور ٹاورز کا تذکرہ کیا ہے۔۔

1975 تک متفقہ طور پر دنیا بھر میں C.N Tower ٹورنٹو کو دنیا کا بلند ترین Tower ہونے کا اعزاز حاصل تھا۔۔۔اس کی اونچائی 533 میٹر بتائی جاتی ہے۔۔۔رہائشی عمارتوں میں تائیوان کی TAI PE نامی بلڈنگ 101 منزلہ ہے اور اس کی بلندی 510 میٹر ہے

دنیا کی کونسی عمارت اور ٹاور بلند ترین ہے۔۔۔ یہ ایک دلچسپ بحث ہے لیکن ۱۲ مئی 2007ء کو ''برج دبئی'' کی تعمیر نے یہ بحث ختم کر دی کیونکہ ''برج دبئی'' 636 میٹر بلند رہائشی وتجارتی عمارت ہے لیکن یہ بحث ابھی ختم نہیں ہوئی کہ دبئی ہی میں ''البرج'' کے نام سے ایک اور عمارت کا تعمیراتی کام شروع ہو گیا ہے۔۔۔''مقامی کمپنی'' اسے تعمیر کر رہی ہے منصوبہ کے مطابق یہ 1400 میٹر بلند عمارت ہوگی۔۔160 فلور ہونگے اور اس میں 56 Elevator Lifts ہونگی۔۔۔خیال رہے کہ Emaar کمپنی کی عمارت ''برج دبئی'' جو نہایت خوبصورت اور دیدہ زیب عمارت ہے۔۔۔اس کا تعمیراتی کام جاری ہے اور یہ کمپنی اس بات کو راز میں رکھے ہوئے ہے کہ مزید اس میں کتنے فلور تعمیر کئے جائیں گے۔۔۔قصہ مختصر۔۔۔دبئی دنیا کا واحد ملک ہے جہاں دو بلند ترین عمارتیں موجود ہونگی۔

ہم اعداد وشمار میں کھو گئے۔۔۔بیگم نے توجہ دلائی تو پہلے مغرب کی نماز ادا کی اور اس کے بعد کمرے سے شہر کا نظارہ کرنے لگے۔۔۔آپ یقین جانئے کہ ٹون ٹاور اور KLR Tower کی لائٹنگ اس قدر سحر انگیز ہیں کہ انسان انہیں دیکھنے میں محو ہو جاتا ہے۔۔۔مجھے تو یہ منظر اس قدر پسند آیا کہ ہوٹل میں اپنے چار روزہ قیام کے دوران رات کے وقت جب بھی میں کمرہ میں ہوتا شہر کی روشنیاں دیکھتا رہتا ہے۔۔۔تقریباً ۱۲ بجے عمارتوں کی بتیاں بجھنے لگتی ہیں اور تقریباً پندرہ منٹ کے بعد ''نیون سائن'' سمیت عمارتوں میں روشنیاں برائے نام رہ جاتی ہیں۔۔

صبح اٹھ کر ہم پہلے ناشتہ کے لئے آئے ۔۔۔۔ ناشتہ کے بعد کچھ دیر لابی میں بیٹھے ۔۔۔ ملا ایشیاء میں ہمارے ایک میزبان عبدالباسط ہیں ان سے طے ہوا کہ وہ کل آ کر ہمیں شہر کی سیر کرائیں گے ۔۔۔ بیگم کا اصرار کہ کسی طرح ''قومی یادگار'' چلیں کہ نیشنل مانومنٹ میں جو سونیر شاپس تھیں میں نے وہاں سفیان کے لئے ایک کھلونا پسند کیا تھا ۔۔۔۔ عجلت میں فیصلہ نہیں کر سکیں ۔۔۔۔ اب کل شام سے ملال ہے کہ کیوں نہیں خریدا ۔۔۔ اب بضد ہیں مجھے وہ کھلونا پسند ہے ۔۔ اور میں صوفو کے لئے لینا چاہتی ہوں ۔۔۔۔ ''ریو پٹھا'' تو اپنی اماں کے ساتھ امریکہ سے بہت سے Toys لائے گا (میرا چھوٹا پوتا ریان اور میری بہو ان دنوں میرے بھائی مظہر کے ساتھ ہیوسٹن میں ہے جبکہ بڑا پوتا سفیان جو دادی کا چہیتا ہے اسے کراچی میں اسکے ننہیال میں بیگم چھوڑ کر آئیں ہیں) ۔۔۔۔ میں نے چائنا ٹاؤن میں بھی وہ کھلونا بہت تلاش کیا ۔۔۔۔ مگر وہاں بھی نہیں ملا ۔۔۔۔ میں نے سمجھایا بیگم پہلے ہم ٹوئن ٹاور چلتے ہیں، بیچ شہر میں ہے، آسانی سے سواری مل جائے گی ۔۔۔۔ اس کے بعد تمہاری خوشی کی خاطر ''قومی یادگار'' بھی چلے چلیں گے کہ مجھے یہاں کی جامع مسجد National Mosque دیکھنی ہے سٹی ٹور والوں نے بس دور سے اس کے گنبد اور مینار دکھا دیئے ۔۔۔ اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کل ہم باسط صاحب کے ساتھ وہاں چلے چلیں ۔۔۔۔ بیگم راضی تو ہو گئیں مگر کہنے لگیں کہ کل ہر قیمت پر وہاں جانا ہے، رستہ میں نے سمجھ لیا ہے اگر آپ نہ جانا چاہیں تو میں اکیلی چلی جاؤنگی ۔۔۔۔

کمرہ میں آ کر تیار ہوئے ۔۔۔۔ باہر آ کر معلومات حاصل کی تو پتہ چلا کہ سامنے بس اسٹاپ سے ہمیں ٹوئن ٹاور کے لئے بس مل جائے گی ۔۔۔۔ بس میں بیٹھ کر شہر کی رونقیں دیکھتے رہے ۔۔۔ بہت خوبصورت عمارتیں ۔۔۔۔ جدید طرز تعمیر کی شاہکار ۔۔۔۔ ایک سے ایک حسین عمارت ۔۔۔ SIMDABY سے آگے چلے یونی ایشیا کی خوبصورت عمارت ۔۔۔ اس کے قریب سبز رنگ کی چوکور بلڈنگ C.N Parada ۔۔۔۔ اس سے آگے اور بہت سی عمارتیں ۔۔۔ Concorde Hotel ۔۔۔۔ ٹریفک رواں ۔۔۔۔ فٹ پاتھ میں لوگوں کی آمد و رفت ۔۔۔۔ ڈاؤن ٹاؤن میں زندگی دوڑ رہی تھی ۔۔۔۔ بس ''ٹوئین ٹاور اسٹاپ'' پر رک گئی ۔۔۔ بس سے اتر کر گردن کو پوری طرح اوپر کی طرف دیکھا ۔۔۔۔ شاندار بلڈنگ ۔۔۔۔ مگر ہمارے کمرے سے جو نظارہ تھا وہ یہاں کہاں ۔۔۔۔۔؟

عمارت دو حصوں پر مشتمل ہے ۔۔۔۔ دونوں ٹاور بہت کشادہ ہیں پچاس ساٹھ فلور کے

بعد دونوں حصوں کو آپس ملانے کے لئے ایک پل بنا ہوا ہے۔۔۔جیسا کہ پہلے عرض کیا تھا کہ یہاں پانچ منزلوں میں۔۔۔شاپنگ سینٹرز۔۔۔ریستوران۔۔۔ہوٹلیں۔۔۔اور جانے کیا کیا ہیں۔۔۔یہاں پہونچ کر پتا چلا کہ اس کا اصلی نام SURIA KLCC ہے۔۔۔اس عمارت میں آرٹ گیلری ہے۔۔۔سینما ہاؤ سیز ہیں جہاں ہندی اردو سمیت مختلف زبانوں کی فلموں کی نمائش جاری رہتی ہے۔۔

ہم پر تو اب تک ''کومتار ٹاور'' کا نشہ چڑھا ہوا تھا۔۔۔یہاں آئے تو پتہ چلا کہ اس کی سج دھج تو ''ٹوئن ٹاور'' کے ایک فلور پر قربان۔۔۔۔ٹوئن ٹاور میں داخل ہونے کے بہت سے دروازے ہونگے ہم جس دروازے سے داخل ہوئے وہ خود کار شیشوں کا بنا ہوا تھا۔۔۔جوں ہی آپ قریب پہونچیں۔۔۔شیشوں کے پٹ بچھڑے دوست کی بانہوں کی طرح کھل جاتے تھے۔۔۔دروازہ کا لفظ تو ہم نے روایتی طور پر استعمال کیا ہے ورنہ شیشوں کی ایک وسیع اور کشادہ کھلتی اور بند ہوتی دیوار ہے جس سے سینکڑوں لوگ بیک وقت آ جا رہے ہیں۔۔۔اندر داخل ہوئے تو منظر اتنا روشن کہ کونے میں PIN بھی پڑی ہو تو نظر آ جائے۔۔۔صفائی اتنی کہ ایک ذرہ بھی فرش پر نظر نہیں آیا انتہائی قیمتی ٹائلز کا فرش۔۔۔اتنا بڑا شاپنگ پلازہ۔۔۔۔۔۔دائیں بائیں آگے پیچھے پیدل چلیں تو خاصا وقت لگ جائے۔۔۔سینکڑوں شورومز۔۔۔انتہائی جدید اور خوبصورت رستورانز۔۔۔کافی شاپس۔۔۔۔سب کا ڈیزائن ایک دوسرے سے مختلف ریستوران کا فرنیچر مختلف۔۔۔قابل دید اور لائق ستائش۔۔

فرسٹ فلور سے نظر اٹھا کر اوپر دیکھا تو پانچویں فلور کی چھت نظر آ رہی تھی، چار فلور اس طرح بنائے ہیں کہ درمیان میں بہت بڑی جگہ دائرے کی شکل میں چھوڑ دی ہے۔۔۔آپ ہر فلور سے فرسٹ فلور اور دیگر فلورز کا نظارہ کر سکتے ہیں۔۔۔ہر طرف خود کار زینے۔۔۔آس پاس دکانوں کے ساتھ کرسٹل لفٹس۔۔۔صرف فرسٹ فلور پر موجود دکانوں کو رک رک کر دیکھنے کے لئے گھنٹوں چاہئیں

ٹوئن ٹاور میں 250 بین الاقوامی کمپنیوں کے شورومز ہیں۔۔ہم نے اب تک جتنی کمپنیوں کے بارے میں سنا تھا، ان کی Product دیکھیں یا استعمال کیں اور جن Products کے اشتہارات دیکھے تھے وہ سب یہاں موجود۔۔۔کوئی شے ایسی نہیں جو یہاں دستیاب نہیں۔۔۔گارمنٹس کے شورومز ایک طرف۔الیکٹرونکس کے سامان ایک علیحدہ فلور پر۔۔۔خوشبو۔۔۔

چشمے۔گھڑیاں۔۔اٹیچی کیس۔۔۔پرس۔۔۔موبائل فون۔۔۔جوتے۔۔۔آڈیو ویڈیو کا سامان ۔۔۔۔گرم کپڑے۔۔۔بچوں کے استعمال کی چیزیں۔۔۔Gift Items۔۔۔۔جیولری ۔۔۔ہیرے موتی۔۔۔کیمرے۔۔۔۔۔۔پھر fast food کی دکانیں۔۔۔۔یعنی Pizza Hut۔۔۔Mc Donald's۔۔۔۔۔KFC۔۔۔۔اور جانے کون کون سے کھانوں کی دکانیں۔۔۔۔قیمتیں ہماری قوت خرید سے باہر۔۔۔اندر سیاحوں کا ہجوم۔۔۔۔دکانوں پر خریداروں کی بھیڑ۔۔۔دنیا بھر کے لوگ۔۔۔۔ہر رنگ اور نسل۔۔۔۔ہر قوم اور ملک۔۔۔۔۔ ہر مذہب اور عقیدے کے لوگ۔۔۔۔بس ایک دنیا تھی۔۔۔۔۔دولت کے کرشمے۔۔۔۔۔ ڈالر کی چمک۔۔۔۔رنگٹ کی روشنی۔۔۔۔یورو کی قوت خرید۔۔درہم و ریال۔۔۔۔یان اور یورو ہر طرح کی کرنسی گردش میں تھی۔۔۔۔جیسا کہ پہلے بتایا پانچ منزلہ شاپنگ سینٹر میں دنیا کی مشہور کمپنیوں کی 250 مصنوعات کے بڑے بڑے شوروم تھے۔۔۔۔دس، بیس نہیں 250 ۔۔۔۔Branded Products۔۔۔۔امریکہ، یورپ، جاپان، جرمنی، فرانس، اٹلی، چین، کوریا، تائیوان وغیرہ وغیرہ۔۔۔۔دنیا میں 57 مسلم ممالک ہیں ان کے پاس ایٹمی قوت، پیٹرول کی فراوانی، گیس کی روانی۔۔۔۔کوئلے کے ذخائر۔۔۔۔علم و حکمت کے دفاتر سونے چاندی اور زمرد کی کانیں۔۔۔۔۔افرادی قوت سے بھری دکانیں ہیں۔۔اور ان گنت قدرتی وسائل سے مالا مال۔۔۔۔مگر۔۔۔اتحاد، یگانگت، محنت، دیانت اور ترقی کی امنگ خال خال ہے۔۔۔۔ملائیشیاء کے اس جدید ترین شاپنگ مال میں مسلم ممالک کا کوئی مال نہیں۔۔۔کوئی Product نہیں، کوئی برانڈ نہیں۔۔۔۔نام کو مسلم مصنوعات کا ایک گوشہ بھی نہیں۔۔۔۔یہاں کھانے پینے کے اکثر اسٹال فاسٹ فوڈ کی تمام ہوٹلیں غیر ملکی۔۔۔۔دنیا بھر میں مسلم فوڈ سب سے لذیذ ہوتا ہے۔۔۔۔مگر ہم آج تک بین الاقوامی سطح پر اپنا ایک فاسٹ فوڈ متعارف نہ کرا سکے۔۔۔ برنس روڈ میں بکنے والا 30 روپے کا بن کباب، جدید شکل میں ہم پاکستان میں 300 روپے کا لیکر کھاتے ہیں مرغی کی ایک ٹانگ ہمارے ملک میں 50 طرح سے پکائی جاتی ہے۔۔۔سینکی جاتی ہے۔۔۔تلی جاتی ہے۔۔۔بھونی جاتی ہے۔۔۔مشین میں Broost کی جاتی ہے۔۔بہتر مصالحے ہوتے ہیں، ذائقہ ہوتا ہے۔۔۔مگر KFC سے 300 روپے کی Deal پسند کرتے ہیں۔۔۔۔مک ڈونلڈ کے برابر جدہ کے علاقہ بلد میں، میں نے خود دیکھا ہے کہ ''البیک'' بہت پسند کیا جاتا ہے۔۔۔ایک بار بلد کے علاقہ سے گذر ہوا مکڈونلڈ کی دکان میں دو تین گاہک بھی

نہیں تھے لیکن ''البیک'' میں گاہکوں کی اتنی بھیڑ تھی یوں لگا کہ لنگر تقسیم ہو رہا ہے۔۔''البیک'' والوں نے زبردست Presentation کی ہے مقدار بھی زیادہ ہے، ذائقہ بھی بہت لذیذ ہے اور قیمت بھی کم ہے۔۔۔سعودی عرب تو امیر ملک ہے میں سوچتا ہوں کہ ''البیک'' والوں نے اسے دیگر ممالک میں Introduce کیوں نہیں کرایا۔۔۔ملا ایشیاء کی مقامی Dish ''ناسی کندا'' اتنا مقبول ہے کہ صرف کوالالمپور میں اس کی 62 پبلک رجسٹرڈ ہوٹلیں ہیں مگر دنیا کے کسی اور ملک میں اس Dish کی کوئی دکان نہیں۔۔۔ملا ایشیاء کے اس شاپنگ سینٹر میں وہی چند کولڈ ڈرنکس تھیں جنکی ملکیت یہودیوں کے پاس ہے۔۔۔57 مسلم ممالک کے اربوں ڈالرز یہودی بنکوں میں محفوظ ہیں۔۔۔مگر آج تک کسی مسلم ملک نے کوئی کولڈ ڈرنک متعارف نہیں کرائی، روح افزا۔۔۔نورس ،جام شیریں وغیرہ بہت خوش ذائقہ ہیں لیکن صرف پاکستان تک محدود ہیں۔۔۔۔ پاکستان اور بنگلا دیش دنیا کے بہترین Garments بناتے ہیں مگر Sticker دوسرے ملکوں کے لگے ہوتے ہیں۔۔۔کپاس پر ہماری اجارہ داری ہے مگر Cotton کے لباس دوسری کمپنیوں کے نام سے فروخت ہوتے ہیں۔۔۔ہم کبھی کبھی غیر ملکی مصنوعات کے بائیکاٹ کی تحریک چلاتے ہیں۔۔۔یہ صحتمند مقابلہ کے منافی سوچ ہے۔۔۔ہمیں خود معیاری مصنوعات تیار کر کے بین الاقوامی مارکیٹ میں مقابلہ کرنا چاہئے۔۔شاید ہمارے لئے یہ مشکل ہے۔۔۔۔بائیکاٹ کی اپیل کرنا زیادہ آسان۔۔۔۔پچھلے دنوں کی بات ہے کہ ہم یار دیرینہ دوست محمد فیضی کے دفتر میں بیٹھے مشہور زمانہ فاسٹ فوڈ منگا کر لنچ کر رہے تھے کہ۔۔۔۔ایک SMS آیا لکھا تھا۔۔۔۔فاسٹ فوڈ کا بائیکاٹ کریں کہ یہ کمپنی آئندہ پندرہ روز کی آمدنی،اسرائیل کو عطیہ کریگی۔۔۔۔۔۔۔۔۔ہم غیرت قومی سے گڑ گئے۔۔۔فوراً اس SMS کو دو تین دوستوں کو forward کر دیا۔۔۔یوں اس کار خیر میں شریک ہو کر ہم ثواب الدارین حاصل کرنے والوں کی صف میں شامل ہو گئے۔

ملا ایشیاء میں بہت سی غیر ملکی مصنوعات کے کارخانے ہونگے لیکن نام تو ان کی کمپنیوں کے ہیں۔۔۔منافع تو وہ کما کر لے جاتے ہیں۔۔۔۔دنیا بھر میں مسلم آبادی فیشن سے مرعوب ہو کر اپنی مصنوعات خریدنے کی بجائے غیر ملکی برانڈیڈ مصنوعات خرید کر فخر محسوس کرتی ہے۔۔۔دنیا بھر میں چینی کھانے مشہور ہیں، کیا ہم ان سے بہتر چاول نہیں پکا سکتے۔۔۔۔؟

کب سوچیں گے۔۔۔۔۔۔۔؟

میں جذباتی ہوگیا۔۔۔ اتنی بڑے شاپنگ سینٹر کی چمک دمک اور جانی پہچانی چینی جاپانی۔۔مصنوعات دیکھ کر مرعوب ہورہا تھا۔۔۔ تھکن محسوس ہونے لگی کچھ سمجھ نہیں آیا۔۔۔قریب کی کافی شاپ پر گیا۔۔۔۔Pepsi کا ایک ٹن خریدا۔۔۔ دو گھونٹ لئے تو طبیعت بحال ہو گئی۔۔۔

بیگم Window شاپنگ میں مصروف تھیں اور میں خوشبویات وعطریات کی دکانوں میں cologne کی نت نئی پیکنگ میں بند مصنوعات کو تک رہا تھا۔۔۔ پاگل کر دینے والی سینکڑوں خوشبوئیں نت نئے ڈیزائن کی شیشوں میں بند تھیں ان کی قیمتیں ہمارے ہاں کے عام ملازموں کی ایک ماہ کی تنخواہ کے برابر۔۔۔۔ ہمارے پاس عطریات ہیں، اچھے قسم کے عطر کو ایک بار کپڑوں پر لگالو تو کئی روز تک خوشبو نہیں جاتی۔۔۔ ہزاروں روپے کا Scent لگا کر جاؤ تو تقریب میں کوئی محسوس نہیں کرتا کہ ہم نے خوشبو لگائی ہے کبھی تو بے تکلف دوستوں سے پوچھنا پڑتا ہے کچھ محسوس ہورہا ہے

کیا۔۔۔وہ حیرت سے پوچھتا ہے۔۔

کچھ پتہ نہیں چلا۔۔۔۔ہم پھر پوچھتے ہیں۔۔۔۔۔

نہیں تو کوئی خاص بات ہے کیا۔۔۔۔۔؟

کمال ہے بھئی آج میں نے نیا Cologne لگایا ہے، میرے عزیز کامل شیخ نے امریکہ سے بھیجا ہے۔

اچھا۔۔۔۔ہاں ہاں، کچھ محسوس تو ہورہا ہے۔۔۔ بے تکلف دوست تکلفاً جواب دیتے ہیں۔۔۔ہم ان دکانوں کے پھیرے اس لئے لگا رہے تھے کہ اچھی خوشبو سے لطف اٹھائیں گے ۔۔۔۔مگر وہ Seal Packed تھیں۔۔۔

Nike کے شوروم میں گئے۔۔۔ عام سی T. Shirts۔۔۔۔ قیمت ہزاروں میں بیگم نے Gucci کا پرس پوچھا جو اس کے کندھے پر لٹکا ہوا تھا۔۔ قیمت بتائی 700 رنگٹ حساب لگایا تو =/14000 روپے۔۔۔ بالی کا جوتا دیکھا۔۔۔۔Levi's کی جینز دیکھی۔۔۔۔شوفر کا قلم ۔۔۔۔ رولیکس کی گھڑی ۔۔۔۔Delsey کا اٹیچی کیس ۔۔۔۔Next کی قمیض ۔۔۔ Mont Blanc کی ٹائی ۔۔۔ پتلون کی ایک Belt کی قیمت پوچھی ہوش اڑ گئے۔۔۔ Armani کے بوٹ۔۔Dolce & Gabana کے چشمے۔۔۔۔خوشبوؤں کے شوروم

میںChanel, Boss, Dvnhill, Coolwaterاور جانے کتنی قسم کے Scents

تھک گئے ۔۔۔ہم دونوں نے فرسٹ فلور میں واقع ''بختاور ہوٹل'' سے Nescafe کے دو مگ لئے اور آرام سے بیٹھ کر کوفی پینے لگے۔۔۔اسطرح ہم نے بھی غیر ملکی کمپنی کے منافع میں اپنا حصہ شامل کر دیا۔۔۔

گھومتے گھامتے ٹوئن ٹاور کے جس دروازہ سے باہر نکلے تو حیرت زدہ رہ گئے ۔۔۔کھلا کشادہ، قیمتی ٹائلز سے مزین ایک پیلٹ فارم اس کے ساتھ ایک وسیع اور کشادہ Pool۔۔۔۔۔ سینکڑوں فوارے۔۔۔فواروں سے مختلف انداز میں پانی اچھل کر فضاء میں لہرا رہے تھے۔۔۔ ایک ترتیب اور ردھم کے ساتھ اس طرف کے فوارے پھوٹتے تھے۔۔۔کبھی اس طرف کے۔۔۔فواروں کا پانی فضاء میں بلند ہو جاتا تھا۔۔۔آپ نے اولمپک گیمز میں فائر ورک تو دیکھا ہے۔۔۔ ہمارا مطلب ہے T.V پر دیکھا ہے نا۔۔۔بس سمجھ لیجئے ایسا ہی Water work تھا۔۔۔۔تالاب کا شفاف پانی۔۔۔۔نیلے رنگ کے ٹائلز کی وجہ سے pool میں پانی نیلگوں محسوس ہو رہا تھا۔۔۔پھر Pool کے ساتھ ساتھ رنگ برنگے ٹائلوں کی راہداری اور اس کے بعد پودوں اور پھولوں کی حسین تزئین وآرائش اور اس کے پیچھے ایک ہی قد وقامت کے دھلے دھلائے درختوں کی قطاریں، جسے ہم pool سمجھ رہے تھے وہ ایک خوبصورت نہر ہے اور ایک قطار میں دور تک سینکڑوں چھوٹے بڑے فوارے اچھل رہے ہیں۔۔۔۔بے پناہ خوبصورت منظر تھا۔۔۔ہم تصویر بنوانا چاہتے تھے کہ اپنے ہی جیسے خدوخال کے آدمی کو کیمرہ دے کر انگریزی میں درخواست کی کہ ایک فوٹو بنا دیجئے۔۔۔ اردو میں پوچھا۔۔۔

آپ پاکستانی ہیں۔۔۔

ہم نے کہا۔۔۔ہاں ہم پاکستانی ہیں۔۔

کہنے لگا میں انڈیا سے آیا۔۔۔یہیں رہتا ہوں۔۔۔۔باتیں شروع ہوئیں۔۔۔اس کے ہاتھ میں سگریٹ تھا اور لائیٹر کی تلاش تھی۔۔۔ہم بھی اس کے ساتھ سگریٹ نوشی میں شریک ہو گئے یہاں سگریٹ پینے کی اجازت تھی۔۔۔آس پاس بڑے بڑے ''ایش ٹرے کم ڈس بن'' رکھے تھے اس نے بتایا کہ یہاں بہت سی بھارتی فلموں کی شوٹنگ ہوئی ہے۔۔۔شاہ رخ خان کی فلاں فلم ایشوریا رائے کی فلاں فلم۔۔۔

کہنے لگا آپ لوگ اردو بولتے ہیں۔۔

ہم نے جواب میں کہا کہ آپ بھی تو اردو بول رہے ہیں۔۔

بڑے یقین سے کہا کہ نہیں میں تو ہندی میں بات کر رہا ہوں۔۔

میں نے کہا زبان ایک ہے۔۔۔ بولی بھی ایک ہے۔۔۔۔ آپ ہندی کہکر خوش ہو جائیں، ہم اسے اردو زبان سمجھ کر شاد ہو جاتے ہیں

ہماری بات سے مطمئن نہیں ہوا۔۔۔۔ کہنے لگا کہ Star Plus اور Zee TV کے ڈرامے تو ہندی میں ہوتے ہیں۔۔۔۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔۔۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں مگر میں بھی غلط نہیں کہتا۔۔۔۔۔ وہ ڈرامے اردو میں ہوتے ہیں وہ ہنسنے لگا۔۔۔۔ پھر بولا ۔۔۔۔ کمال ہے۔۔۔۔ جب زبان ایک ہی ہے تو ہم لڑتے کیوں ہیں۔

میں نے کہا اپنے نیتاؤں سے پوچھو

وہ زور سے ہنسا اور کہنے لگا آپ بھی اپنے لیڈروں سے پوچھنا۔۔۔۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ قہقہہ لگایا۔۔۔۔۔ آس پاس کھڑے لوگوں نے ہماری جانب مڑ کر دیکھا۔۔۔۔ ہم چپ ہو گئے۔۔۔۔ پھر کیمرہ ہاتھ میں لیکر ہمیں اچھلتے رنگین فواروں کے درمیان کھڑا کر کے ہماری تصویریں بنائیں۔۔۔ ہم نے اس کا شکریہ ادا کیا۔۔۔۔ وہ اجازت لیکر چلا گیا اور ہم پھر اس خوبصورت منظر میں کھو گئے

خاصی دیر ہم اس نہر کے کنارے کنارے ٹہلتے رہے۔۔۔۔ کل ''سٹی ٹور'' کی بس میں ایک خاتون نے بیگم کو B.B Center کے بارے میں بتایا تھا کہ وہاں چیزیں سستی ملتی ہیں ۔۔۔۔ بیگم نے کہا کسی سے معلوم کریں کہ بی بی سینٹر کہاں ہے۔۔۔۔۔ وہاں چلنا ہے۔

میں نے ایک ایشیائی سے پوچھا۔۔۔

کہنے لگا۔۔۔۔ آپ واپس شاپنگ سینٹر جائیں۔۔۔۔ اور سیدھے چلتے ہوئے اس طرف کے گیٹ سے باہر نکلیں۔۔۔۔۔ اور بس پکڑ لیں۔۔۔۔ ویسے پیدل بھی جا سکتے ہیں۔۔۔۔۔ آدھ گھنٹے کی واک ہے

ہم نے اس کا شکریہ ادا کیا۔۔۔۔۔ لیکن ہم نے فیصلہ کیا کہ ہوٹل کے اندر جانے کی بجائے اس عمارت کے ساتھ ساتھ چلیں۔۔۔۔ آس پاس کا علاقہ بھی دیکھ لیں گے اور گھوم کر بس اسٹاپ پہونچ جائیں گے۔۔۔۔۔ پوری عمارت کے چاروں طرف خوبصورت سلور اسٹیل کی بڑی چوڑی پٹی لگی ہوئی ہے۔۔۔۔۔ اس سے عمارت میں حسن کے ساتھ ساتھ وقار پیدا ہو گیا

ہے۔۔۔۔ہم نے ٹوئن ٹاور کے ساتھ ساتھ خوبصورت راہداری پر چلنا شروع کر دیا لیکن یہ فیصلہ مشکل ثابت ہوا۔۔۔ٹوئن ٹاور اتنی بڑی عمارت ہے کہ ختم ہونے میں نہ آئے بہر حال ۔۔۔۔شہر کی دیگر سڑکیں اور بلند عمارتیں دیکھتے ہوئے ہم بس اسٹاپ کی تلاش میں چلتے رہے۔۔۔ایک راہگیر سے پوچھا۔۔۔کہنے لگے۔۔۔ٹوئن ٹاور کے احترام میں اس کے قریب سے بسیں نہیں چلتیں۔۔۔۔ذرا فاصلہ پر عام سڑک ہے۔۔۔۔پھر ایک شخص سے پوچھا اس نے کہا۔۔۔۔ ادھر چلے جایئے۔۔۔۔ ہم راہنما بدلتے رہے۔۔۔۔ اور چلتے چلتے تھک گئے۔۔۔۔ بہت سی عمارتیں دیکھیں۔۔۔۔ایک پرانی عمارت دبلی پتلی جیسے شاہراہ فیصل پر Sea Breeze بلڈنگ ہے۔۔۔براؤن کلر۔۔۔۔کافی اونچی۔۔۔۔

دیکھنے میں مختلف لگی۔۔۔۔۔ہم لوگوں سے پوچھتے پوچھتے آگے بڑھتے رہے۔۔۔۔ تھک کر ایک جگہ کھڑے ہوگئے کہ اب ہمیں سڑک پار کرنا تھی۔۔۔۔ایک ملائے خاتون حجاب پہنے ہوئے ہمارے قریب آ کر کھڑی ہوئیں، ہم نے ان سے پوچھا تو بڑے اخلاق اور اپنائیت سے ہمیں تفصیل کے ساتھ راستہ بتایا ہم ایک بار پھر پیدل چل کھڑے ہوئے۔۔۔۔پیرس یاد آ گیا۔۔۔ہم دونوں نے صبح سے رات ۸ بجے تک پورا پیرس پیدل چل کر دیکھا تھا۔۔۔۔ دریائے سین کے کنارے کنارے چہل قدمی بھی کی تھی ان دنوں وہاں شدید سردی تھی۔۔۔۔یخ بستہ ہواؤں سے برا حال تھا۔۔۔۔پیروں میں چھالے پڑ گئے تھے، مگر گھومنے کا شوق تھا۔۔۔۔ میلوں پیدل چلے ہونگے ۔۔۔۔مگر یہ پرانی بات ہے، اس وقت دونوں مسافر جوان تھے۔۔۔۔۔پھر بھی شوق کا کوئی مول نہیں۔۔۔ اب کی بار بھی ہم نے ہمت نہیں ہاری اور چلتے رہے۔۔

اب ہم انیکا انشورنس کمپنی کی عمارت سے گذر کر۔۔۔۔۔۔''مینارہ پینانگ'' تک آ گئے ۔۔۔۔یہ عمارت بھی کوالالمپور کی مشہور اور قابل دید عمارتوں میں سے ہے۔۔۔۔آگے بڑھے ملائے خاتون کے بتائے راستے کے مطابق ایک Pedestrain Bridge آ گیا۔۔۔۔ حیرت ہوئی کہ یہاں راہگیروں کے لئے پل پر چڑھنے کے لئے خود کار زینہ موجود تھا۔۔۔۔۔ہم اس زینے سے گذر کر آگے بڑھے راستے میں ایک خوبصورت شاپنگ سینٹر آیا Paviliar SPRITE یہاں خوبصورت ٹائلوں کی کشادہ اور صاف ستھری گذرگاہ تھی۔۔۔۔۔دونوں طرف جدید دکانیں۔۔۔۔یہاں بھی ریستوران اور کافی شاپ۔۔۔۔اس راستے سے گذر کر ہم

ایک ایسی سڑک پر آ گئے جہاں قطار سے مسلم ممالک کی ہوٹلیں تھیں اسے عام طور پر ''عرب اسٹریٹ'' کہا جاتا ہے ۔۔۔تقریباً ایک سی ہوٹلیں تھیں ۔۔۔۔فرنیچر ذرا مختلف ۔۔۔۔سعودی ہوٹل ۔۔۔۔ایرانی ہوٹل ۔۔۔۔۔ترکی ہوٹل وغیرہ وغیرہ ۔۔۔۔۔۔فٹ پاتھ پر ہر ہوٹل کے باہر ایک لڑکی ہاتھ میں Menu card لئے کھڑی تھی ۔۔۔۔۔اور ہر آنے جانے والوں کو روک کر ہوٹل میں آنے کی دعوت دے رہی تھی ۔۔۔ یہاں یہی طریقہ رائج ہے ۔۔۔۔۔ہم نے لنکاوی اور پینانگ میں بھی ہوٹلوں کے باہر ملازمین کو مینو کارڈ لئے کھڑا دیکھا تھا جو لوگوں کو اپنی ہوٹل میں آنے کی دعوت دیتے ہیں ۔۔۔۔ پاکستان میں بھی بہت سے مقامات پر بیرے آپ کی کار کی طرف لپکتے ہیں اور اپنی ہوٹل میں آنے کے لئے اصرار کرتے ہیں جالان سلطان اسماعیل سے گذر کر ہم کچھ دور چلے ہونگے کہ B.B Shopping Centre تک پہونچ گئے ۔۔۔اصل میں کل شام بس کے سفر کے دوران ایک بھارتی خاتون نے بیگم کو بتایا تھا کہ B.B Shoping Centre بہت اچھا ہے ۔۔۔اور سستا ہے ۔۔۔بس اسی اطلاع پر ہم تقریباً تین کلومیٹر پیدل چل کر یہاں تک پہنچے تھے ۔

B.B Shop ایک عام سی تین منزلہ عمارت ہے، کوالالمپور کا یہ پرانا علاقہ ہے ۔ یہاں کی رونق دیدنی تھی ۔۔۔آس پاس دو تین منزلہ رہائشی مکانات ۔۔۔۔متوسط طبقے کے لوگ رہتے تھے ۔۔۔۔شاپنگ چورنگی کے تقریباً نکڑ پر واقع ہے ۔۔۔ٹریفک رواں دواں تھی ۔۔۔۔۔آمنے سامنے فٹ پاتھ پر رونق میلہ لگا ہوا تھا ۔۔۔۔سگریٹ کی دکانیں بھی تھی اور چھوٹے چھوٹے چاء خانے بھی ۔۔۔فٹ پاتھ پر مقامی لوگوں کا ہجوم ہے ۔۔۔یہاں آ کر یوں لگا جیسے ہم اپنے شہر میں آ گئے ۔۔۔۔سمجھو برنس روڈ کا منظر تھا ۔۔۔ٹھیلوں پر سامان بک رہا تھا ۔۔۔۔ پھلوں کی دکانیں تھیں ۔۔۔خربوزہ ۔۔۔تربوز اور پپیتے کو کاٹ کر ان کی قاش پنی میں لپیٹ کر فروخت کی جاتی ہیں

بیگم شاپنگ سینٹر میں چلی گئیں ۔۔۔۔ سامنے کشادہ فٹ پاتھ پر میز کرسیاں رکھی تھیں ۔۔۔درمیان میں آنے جانے کا راستہ تھا ۔۔۔اور اس کے ساتھ ہوٹلیں تھیں ۔۔۔۔گویا ۔۔۔چائے یا کافی آپ ہوٹل سے خریدیں اور باہر آ کر کرسیوں پر بیٹھ جائیں ۔۔۔نکڑ پر امپیریل ہوٹل تھی ۔۔۔۔۔اس کے سامنے عام سی کرسیاں لگی ہوئی تھیں اور چار رنگٹ میں کافی ملتی تھی ۔۔۔۔امپیریل ہوٹل کے برابر ''گلوریا جینز کافی'' یہ نسبتاً بہتر جگہ تھی اس کے سامنے ایک کشادہ

جگہ پر بہتر کرسیاں تھیں، سر پر چھتری نما پینا فلیکس کی چھت تھی۔۔۔اندر Coolers لگے ہوئے تھے اور گھومنے والے پیڈسٹریل فین چل رہے تھے۔۔۔یہاں آٹھ رنگٹ کی کافی تھی۔۔۔اس کے ساتھ ہی ایک سگریٹ والے کی دکان تھی۔۔۔اور ایک بڑا سا ایش ٹرے بھی رکھا تھا۔۔

B.B Shopping Centre ۔۔۔۔ بو کے بنتان روڈ پر قائم تھا۔۔۔اسی کی مناسبت سے شاپنگ سینٹر کا نام ہے۔۔۔۔۔ اس سے آگے بھی اس طرح کی کافی شاپس تھیں۔۔۔فرسٹ فلور سے بیگم واپس آگئیں کہ اس کے Basement میں بھی دکانیں تھیں ۔۔۔۔ہم بھی بیگم کے ساتھ اندر چلے گئے ۔۔۔ایک بہت بڑا ہال۔۔۔۔ چاروں طرف چھوٹی چھوٹی دکانیں درمیان میں ٹھیلے نما دکانیں راہداریوں میں قطار سے Hangers پر ملبوسات لٹکے ہوئے تھے بالکل صدر کی اندرونی گلیوں کا منظر تھا۔

بیگم نے چند چیزیں خریدیں۔۔۔۔مناسب دام تھے۔۔۔باہر نکل کر ہم نے جالان راجہ لاؤٹ جانے کا راستہ دریافت کیا۔۔۔معلوم ہوا کہ بالکل قریب سے مونو ریل جاتی ہے۔۔ہم خوش ہوگئے۔۔۔۔ پروگرام کے مطابق ہمیں مونو ریل میں سفر بھی کرنا تھا۔۔۔قریب ہی سے سیڑھیاں چڑھ کر بو کے بنتان اسٹیشن پر آگئے۔۔۔چھوٹا سا پلیٹ فارم۔۔۔۔ چند مسافر پہلے سے موجود تھے۔۔۔۔ٹکٹ گھر سے ''چوکٹ'' کا ٹکٹ خریدا کہ ''چوکٹ اسٹیشن'' سے تھوڑے فاصلے پر ہمارا ہوٹل ہے۔

کوالالمپور میں مونو ریل بھی چلتی ہے۔۔۔کوالالمپور میں پبلک ٹرانسپورٹ کے چار ذرائع ہیں

۱۔	بس	۲۔	مونو ریل
۳۔	L.R.T	۴۔	کمیوٹر ٹرین

شہر میں ہر علاقہ میں آنے جانے کے لئے بسیں موجود ہیں۔۔۔شہر کے بعض علاقوں میں مونو ریل چلتی ہے۔۔۔ یہ دراصل سڑک کے ساتھ ستونوں پر قائم پٹری پر چلتی ہے۔۔۔ دو بوگیاں ہوتی ہیں، انہی میں سے ایک میں انجن بھی لگا ہوتا ہے۔۔۔L.R.T (لوگٹ ریلوے ٹرین) شہر کے دور دراز علاقوں تک جاتی ہے جبکہ کمیوٹر ٹرین، جدید اور تیز رفتار ہے بڑے شہروں کو آپس میں ملاتی ہے اور پڑوسی ملک سنگاپور بھی جاتی ہے ٹکٹ بہت خوبصورت جیسے ہمارے ہاں پلاسٹک کا کریڈٹ کارڈ ہوتا ہے۔۔۔مشین کے ایک خانے میں ٹکٹ Insert کرتے ہیں تو

چرخی نما دروازہ کھل جاتا ہے اور مسافر پلیٹ فارم میں داخل ہو جاتا ہے۔۔۔۔۔۔۔ چند منٹ بعد ٹرین آئی۔۔۔ لفٹ کے دروازوں کی طرح ٹرین کے دروازہ کھل گئے۔۔۔۔ ایک حصہ اترنے والے مسافروں کے لئے دوسرا حصہ ٹرین میں چڑھنے والے مسافروں کے لئے مشکل سے ایک منٹ بعد ٹرین کے دروازے بند ہو گئے۔۔۔۔ ٹرین کا ڈبہ ہماری پرانی کار ریل کی طرح تھا دونوں طرف نشستیں۔۔۔ باقی حصہ مسافروں کے کھڑے ہونے کے لئے۔۔۔ چار اسٹیشن کے بعد ہمارا مطلوبہ اسٹیشن ''چوکٹ'' آنا تھا چند منٹ بعد گاڑی راجہ چولان اسٹیشن پر رکی۔۔۔ پھر بکٹ ناناز۔۔۔۔ اس کے بعد بعد میڈان اور پھر Sance۔۔۔ اب ہمارا اسٹیشن آنے والا تھا۔۔۔ ہم اٹھ کھڑے ہوئے دس منٹ میں ہم چوکٹ پہونچ گئے۔

چوکٹ، کوالالمپور کا ایمپریس مارکیٹ ہے۔۔۔ یہاں ہر قسم کا گوشت۔۔ سبزی۔ پھل۔۔۔ اور کچن کا سامان تھوک کے بھاؤ ملتا ہے۔۔۔ ہم تھکے ہوئے تھے اس لئے اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔۔۔ 9 بج چکے تھے۔۔۔ دکانیں بند ہو رہی تھیں فٹ پاتھ پر بھی رونق دم توڑ چلی تھی۔۔۔ مونوریل کا سفر تجربہ کے لئے ضروری تھا لیکن مہنگا پڑا کیونکہ ہمیں اپنی ہوٹل تک پہونچنے کے لئے مزید ایک کلومیٹر چلنا پڑا، بہر حال۔۔۔ جالان راجہ لاؤٹ پہونچ گئے۔۔۔ فیصلہ کیا کہ اسی ہوٹل میں کھانا کھائیں جہاں کل رات کھایا تھا

ہوٹل میں گئے۔۔۔ تندوری روٹی ختم ہو چکی تھی۔۔۔۔ چاول پر تکیہ کرنا پڑا۔۔ مچھلی۔۔ دال۔۔۔ سبزی۔۔۔ سب چیزیں بہت لذیذ تھیں۔۔۔

ہوٹل کا مالک مسلمان تھا کبھی اس کے والد ساؤتھ انڈیا سے آئے تھے۔۔۔ اب وہ یہیں کا شہری ہے۔۔۔ ہوٹل مالک سے اچھی گفتگو رہی۔۔۔ ازراہ میزبانی انہوں نے مقامی برانڈ کا سگریٹ پیش کیا ہم نے سلگایا اور شکریہ ادا کر کے اپنے ہوٹل لوٹ آئے۔۔۔ ایک تھکا دینے والا دن برقی اجالوں میں ڈوب چکا تھا۔۔۔ آرام دہ اور یخ بستہ ماحول نے جلد ہی طبیعت بحال کر دی اب کافی کی طلب تھی اور بیگم نے کمرہ کھولنے ہی پانی گرم کرنے رکھ دیا تھا۔۔۔۔

صبح سو کر اٹھے ناشتہ پر جانے کی جلدی نہیں تھی، کیونکہ پروگرام کے مطابق باسط کو صبح 10 بجے ہمارے ہوٹل آنا تھا۔۔۔ ہم نے رات ہی طے کر لیا تھا کہ تیار ہو کر ناشتہ کے لئے نیچے اتریں گے اور اس کے بعد لابی میں باسط کا انتظار کریں گے۔۔۔

گذشتہ چند دنوں میں یہ عادت سی بن گئی تھی کہ میں بستر سے اٹھتے ہی دیوار کے پردے

کھول دیتا تھا۔۔۔ پردے ہٹے تو تازہ دم سورج کی دھندلی دھندلی روشنی کمرے میں در آئی۔۔ آسمان پر بادلوں کے بکھرے بکھرے ٹکڑے انسانی زندگی کی سرگرمیوں کا جائزہ لے رہے تھے ۔۔۔۔۔ انہیں خود علم نہیں ہوتا کہ انہوں نے کب اور کہاں اسی حالت میں برسنا ہے یا ملکر، یعنی گھنگھور گھٹا بن کر موسلا دھار برسنا ہے یہ بھی قدرت کے ضابطہ حکمت کے اسیر ہوتے ہیں ۔۔۔۔۔ چیرا پونجی کے علاقوں میں ہر وقت برسنا ہی ان کا کام ہے افریقہ کے بعض ممالک میں ہفتوں جھانکتے بھی نہیں ۔۔۔ قحط زدہ علاقوں میں جب زمین بوڑھے لوگوں کے چہرے پر پڑی ہوئی جھریوں کی مانند جگہ جگہ سے تڑخ جاتی ہے اور ہر طرف دھول اڑتی ہے بگولے چکر کاٹتے رہتے ہیں اور خشک سالی کے شکار لوگ اپنی بھیگی، پلکوں، کانپتے ہوئے ہونٹوں اور لرزتے ہاتھوں میں دعائیہ جملے سجاتے رہتے ہیں ۔۔۔ اگر کائنات کا رب، اٹھے ہاتھوں میں کھلتی مناجات اپنی بارگاہ میں قبول کر لے تو دھول دب جاتی ہے، بندوں کی بھول معاف ہو جاتی ہے پھر نادیدہ بادل گھنگھور گھٹائیں بن کہ ہواؤں کے پروں پر اٹھلاتے آجاتے ہیں اور دھرتی کو جل تھل کر کے چلے جاتے ہیں ۔۔۔۔ ہم نے سنا تھا کہ ملائیشیاء میں روز بارش ہوتی ہے ہم تو اسی شوق میں کراچی سے چھتری بھی ساتھ لائے تھے ۔۔ ہم نے جینٹنگ ہائی لینڈز سے واپسی پر کوسٹر میں بیٹھے بیٹھے ہلکی ہلکی بارش دیکھی تھی ۔۔۔۔ یوں دیکھو تو ہمہ وقت عمارتوں کی چھتیں دھلی رہتی ہیں میں نے خیال کیا کہ رات بارش پڑی تھی یا بوندا باندی ہوئی تھی کیونکہ موسم خوشگوار تھا

بیگم باتھ روم سے نکل آئیں تو کہنے لگیں جلدی کریں ۔۔۔ تیار ہو کر نیچے ناشتہ پر جانا ہے اونچی اونچی عمارتوں والے چھوٹے شہر میں یہ ہماری آخری صبح تھی کہ رات ہمیں کراچی کے لئے روانہ ہونا ہے ۔۔۔۔

9 بجے لفٹ سے نیچے آئے ۔۔۔ ڈائنگ روم میں، کچھ نئے اور کچھ دیکھے بھالے مسافر ناشتہ میں مصروف تھے ۔۔۔ سردار جی اپنے بچوں کے ساتھ ناشتہ کر رہے تھے لیکن آخری وقت میں آنے والے مسافر ہاتھوں میں پلیٹ لئے انڈہ فرائی کرنے والے کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹک رہے تھے یہ دیکھ کر ذرا مایوسی ہوئی کہ ڈشوں میں رکھی ہوئی چیزیں ختم ہو گئیں تھیں یا کھانے کی صرف نشانیاں باقی تھیں ۔۔۔ مغربی ممالک کے کئی گورے مسافر نہایت صبر سے ایک ایک ڈش میں جھانک رہے تھے میں نے تو ایک مسافر کو مشورہ بھی دیا کہ کاؤنٹر پر جا کر شکایت کریں ۔۔۔۔

ہم ہوٹل کے بیرونی حصہ میں بیٹھے کافی پی رہے تھے ۔۔۔ اس دوران باسط کو فون کیا تو پتہ

چلا کہ وہ پہنچنے والے ہیں ۔۔۔ پانچ منٹ بعد ہم ڈائننگ روم سے نکل کر ہوٹل کی لابی میں آ گئے ۔۔۔ بیگم وہاں صوفے پر بیٹھ گئیں اور میں باہر پورچ میں جا کر کھڑا ہو گیا کہ اپنے میزبان سے پہلی بار ملاقات ہونی تھی

چند منٹ بعد پورچ میں ایک گاڑی آ کر رکی، چہرہ پاکستانی، خشخشی ڈاڑھی ۔۔۔ سیاہ بالوں میں کہیں کہیں سفیدی در آئی تھی ۔۔۔ یوں پہلی نظر میں سنجیدہ دکھائی دیئے ۔۔۔۔ گاڑی کی پچھلی نشست سے اترے، بازو پر لٹکے ہوئے کوٹ کو پہنا، مجھے دیکھ کر مسکرائے ۔۔۔ میں آگے بڑھ کر گاڑی تک پہونچا ۔۔۔ ہاتھ ملا کر وہ بغل گیر ہو گئے ۔۔۔ یوں لگا جیسے

''آ ملے ہوں سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک''

رضوان صدیقی ۔۔۔ میں نے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا ۔۔۔ عبدالباسط ۔۔۔ انہوں نے اپنا تعارف کرایا ۔۔۔ چند لمحوں بعد گاڑی کے دوسرے دروازہ سے ایک دراز قد خاتون ۔۔۔ سرتا پیر مقامی لباس میں ملبوس ۔۔۔۔ سانولا رنگ ۔۔۔ ہونٹوں پر سنجیدہ اور اجنبی مسکراہٹ ۔۔۔ نپے تلے قدموں سے باوقار انداز میں چلتی ہوئیں ہمارے قریب آئیں عبدالباسط نظامی نے تعارف کرایا ۔۔۔ یہ میری بیگم اور یہ رضوان صدیقی ۔۔۔۔ گفتگو انگریزی میں شروع ہو گئی ۔۔۔۔ ہوٹل کی لابی میں آئے ۔۔۔ میں نے اپنی بیگم سے ملوایا ۔۔۔۔ دونوں خواتین گلے ملیں ۔۔ ہم واپس ڈائننگ روم میں آ کر بیٹھ گئے ۔۔۔ رسمی باتوں سے گفتگو کا آغاز ہوا ۔۔۔۔ اجنبیت کے بہت سے پردے حائل تھے جو ایک ایک کر کے کھلتے گئے ۔۔

عبدالباسط پاکستانی ہیں گذشتہ بیس بائیس سال سے ملائیشیا میں رہتے ہیں ان کا اپنا بزنس ہے ۔۔۔ بیگم ڈکٹور ہیں ۔۔۔ یہ اعزاز سلطان کی طرف سے انہیں ان کی سماجی خدمات پر دیا گیا ہے ۔۔۔ کئی NGOs کی چیئر پرسن ہیں ۔۔۔

طویل بحث مباحثہ کے بعد طے پایا کہ پہلے باسط کے دفتر چلا جائے جو ایک گھنٹہ کی ڈرائیو پر ہے ۔۔۔ ان کے دفتر کو ہم Visit کریں گے ۔۔۔ پھر پروگرام بنائیں گے ۔۔۔ عبدالباسط Sobang میں رہتے ہیں یہ ایک علیحدہ شہر ہے عبدالباسط کی بڑی گاڑی تھی جو سڑکوں پر کم کم نظر آتی ہیں ۔۔۔ شہر سے نکلنے کے بعد کشادہ اور رواں موٹروے پر گاڑی دوڑتی رہی ۔۔۔ راستے میں کئی جگہ Toll Crossing آئے مگر ہم نے دیکھا کہ ٹول ٹیکس کی ادائیگی کے بغیر ان کی گاڑی کے لئے خود بخود گیٹ اوپر اٹھ گیا ہم سے رہا نہ گیا اس لئے پوچھ لیا ۔۔۔

باسط بھائی ! ہم پچھلے چند دنوں کے دوران جب بھی کسی ''ٹول پلازہ'' سے گذرے تو ڈرائیور نے ٹول ٹیکس ادا کیا تب رکاوٹ دور ہوئی مگر آپ۔۔۔۔بات کاٹ کر بولے! چونکہ ہمارا روز کا آنا جانا ہے اس لئے ہم پورے مہینہ کا ٹول ٹیکس یک مشت پیشگی ادا کر دیتے ہیں۔

لیکن کیسے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے ٹول ٹیکس ادا کیا ہوا ہے؟

باسط بھائی نے ونڈ اسکرین کے قریب رکھی ہوئی چھوٹی سی ڈبیا ہمیں دکھائی جس کے ایک سرے پر ایک چھوٹا سا گول شیشہ لگا ہوا تھا۔۔۔کہنے لگے جب یہ گاڑی ٹول پلازہ پر پہونچتی ہے تو اس مشین سے Rays نکلتی ہیں جو گیٹ پر لگی ہوئی اسی قسم کی ایک مشین تک پہونچتی ہیں۔۔۔۔ اس کے بعد خود کار دروازہ اوپر اٹھ جاتا ہے اس سے وقت بھی بچتا ہے۔۔۔۔اور رقم بھی کہ Monthly Toll Tax کم ہوتا ہے۔۔۔ہمیں حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی کہ یہاں کس طرح ٹیکنالوجی سے استفادہ کیا جارہا ہے۔۔کئی جگہ ہم نے مسجدیں اور آبادیاں دیکھیں۔۔۔۔۔ Selangar میں ان کا دفتر ہے۔۔۔شہر کے ایک حصہ میں چند عمارتیں تین چار منزلہ ہیں ان میں سے ایک عمارت کے دوسرے فلور پر ان کا دفتر ہے دفتر کئی کمروں پر مشتمل ہمیں کانفرنس روم میں بٹھایا گیا، اس دوران ہم نے ان سے ملائیشیاء کے بارے میں معلومات حاصل کرتے رہے ان دنوں عبدالباسط کی بھانجی اور داماد کراچی سے آئے ہوئے تھے، دفتر میں باسط کی صاحبزادی سے ملاقات ہوئی جوان کے ساتھ بزنس میں شریک ہے بھابی کو اچانک ایک ضروری کام سے کہیں جانا پڑ گیا اس لئے طے پایا کہ بھانجی اور داماد کو ساتھ لے چلیں، تاکہ کراچی کے تمام مسافر سیر میں شریک ہو جائیں۔ہم ڈیڑھ گھنٹے بعد واپس کوالالمپور کے لئے روانہ ہوئے۔۔۔دوران گفتگو باسط کو پتہ چلا کہ ہم گورنر ہاؤس کراچی میں پریس سیکریٹری رہے ہیں تو انہوں نے گروپ کیپٹن (ر) فہیم بیگ کا ذکر کیا ہم نے بتایا کہ وہ ہمارے دوست ہیں۔۔۔فوری طور پر باسط نے کراچی میں فون کر کے فہیم بیگ سے ہماری بات کرادی۔۔۔اس وقت خیال آیا۔دنیا بہت چھوٹی ہے۔۔۔

گاڑی میں بیٹھے تو طے پایا کہ ''قومی یادگار''۔۔۔۔اور State Mosque ضرور جانا ہے۔۔باسط نے کہا جہاں کہو گے چلیں گے لیکن پہلے لنچ کیا جائیگا۔۔۔۔اس کے ساتھ ہی پوچھا کہ کیا آپ نے ملائیشیا کے کھانے کھائے۔۔۔۔ہم نے نفی میں سر ہلا دیا۔۔۔۔حیرت سے بولے کہ ملائیشیاء کے کھانے تو بے حد لذیذ ہیں، اور پاکستانی کھانوں کی طرح ان میں نمک مرچ اور مصالحے استعمال کئے جاتے ہیں۔۔۔۔۔ہم نے کہا اصل بات یہ ہے کہ کھانوں کے نام سے

پتہ نہیں چلتا کہ مقامی، چینی اور مغربی کھانوں میں کیا فرق ہے پھر سچ بات یہ ہے کہ انجانے کھانے کا انتخاب کرنے میں حرام، حلال کا شبہ بھی ذہن میں رہتا ہے۔

باسط نے بتایا کہ یہاں تمام کھانے حلال ہوتے ہیں اس معاملہ میں حکومت بہت سخت ہے ۔۔۔آپ کے یہاں تو مرغی یا جانور کے ذبح ہوتے وقت صرف اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے نا کہ جھٹکے کا نہ ہو۔۔۔ ہمارے یہاں تو فوڈ انسپکٹر جانوروں کی غذا کے Ingredients بھی چیک کرتا ہے کہ کہیں مرغی کی خوراک میں کوئی ایسی چیز تو شامل نہیں جو خلاف شرع ہو۔۔۔۔اور ایک بات اور عرض کروں کہ فوڈ انسپکٹر کسی سے رشوت لے۔۔۔ یہ ممکنات میں سے نہیں اس لئے آپ کسی بھی ہوٹل میں بلا جھجک اور بغیر کسی شک کے کھانا کھا سکتے ہیں۔۔

☆☆☆

اسٹیٹ مسجد

ہم شہر کی حدود میں داخل ہو گئے ۔۔۔۔۔ باسط بھائی کہنے لگے State Mosque راستے میں پڑتی ہے پہلے وہاں چلتے ہیں ۔۔۔ ظہر کا وقت ہے شاید جماعت سے نماز مل جائے ۔۔۔۔ چند منٹ بعد کار ایک جگہ رک گئی ہمارے سامنے State Mosque کا بلند چوکور مینار تھا ۔۔۔۔ گاڑی سے اترے تو لاؤڈ اسپیکر سے پیش امام کی آواز آرہی تھی ۔۔۔۔ آیات ربانی کی تلاوت جاری تھی ۔۔۔ گاڑی سے اتر کر سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ہم تیز تیز قدموں سے مسجد کے صحن کی طرف لپکے کیونکہ ہمیں وضو خانے کی تلاش تھی ۔۔۔۔ ادھر ادھر دوڑے، جب وضو خانے پر نظر پڑی تو پیش امام سلام پھیر رہے تھے اصل میں جوتے اتارنے اور وضو خانہ کی تلاش میں وقت گذر گیا ۔۔۔

مسجد کا اندرونی حصہ بے حد کشادہ اور خوبصورت ۔۔۔۔ بہت سے دروازے تھے ۔۔۔ تمام دروازے سرکنے والے تھے ۔۔۔۔ آپ قریب جائیں، دروازہ وا ہو جائے گا ۔۔۔ دلکش ڈیزائن کے قالین کی خوبصورت اور نرم نرم صفیں ۔۔۔۔ محراب و منبر بے حد خوبصورت ۔۔۔۔ مسجد کا ہال مکمل ائیر کنڈیشنڈ ۔۔۔ مرکز کے اوپر چھتری نما گنبد کی گولائی ۔۔۔ تین طرف ستونوں پر کھڑی پہلی منزل کی چھت ۔۔ اس کے کنارے ۔۔۔۔ لکڑی کی منقش گیلریاں ۔۔۔۔ اوپر جانے کے لئے مسجد کے اندر ہی سے گھومتی ہوئی سیڑھیاں ۔۔۔۔ مسجد کا ایک حصہ خواتین کے لئے مختص ۔۔۔۔ یہ مسجد بھی نیگری مسجد سے ملتی جلتی تھی مگر زیادہ وسیع اور کشادہ ۔۔۔۔ مسجد میں کمال کی تزئین و آرائش، ستونوں پر پچی کاری اور چنڈی کاشی کارنگین کام ۔۔

ڈیڑھ سو کے قریب نمازی، پندرہ بیس خواتین ۔۔۔۔ ہمیں یہاں تین چار مسجدوں میں نماز ادا کرنے کی سعادت حاصل ہوئی ۔۔۔۔ ہر مسجد میں پیش امام سلام پھیرنے کے بعد زیر لب وظیفہ پڑھتے ہیں اس کے بعد طویل دعا مانگتے ہیں ۔۔۔ باسط بھائی نے بتایا کہ یہاں یہی طریقہ ہے اس لئے بہت سے لوگ دفتری اوقات کے دوران مسجد میں نماز ادا کرنے سے گریز کرتے ہیں ۔۔

کافی دیر تک ہم مسجد کے حسن و جمال اور کاریگروں کے حسن کمال کی زیارت کرتے رہے

روشنیوں کا اس قدر خوبصورت اہتمام تھا کہ قوس وقزح کا تصور ذہن میں آتا تھا۔۔

مسجد سے باہر آئے۔۔۔۔خیال رہے کہ مسجد ایک بڑے پلیٹ فارم پر ہے اس کے نیچے چاروں طرف پانی کے حوض ہیں اور حوض میں شفاف پانی۔۔۔ان گنت فوارے۔۔۔۔عمارت سے باہر مسجد کا حصہ بہت زیادہ کشادہ۔۔۔۔ دائیں بائیں بھی نمازیوں کے لئے بہت گنجائش۔۔۔۔مسجد کے اطراف میں بہت بڑا باغ۔۔۔وسیع اور دور تک پھیلا ہوا سبزہ زار ۔۔۔مسجد کے ایک طرف ذرا نشیب میں، ایک خوبصورت گوشہ، کشتی کے انداز میں تعمیر کیا گیا تھا اس پر ایک ستون پر چھتری نما چھت۔۔۔اس کے نیچے ملاایشیاء کے چار وزراء اعظم آسودۂ خاک ہیں۔۔۔۔چند قبریں اور بھی ہیں، قبروں پر ناموں کے کتبے لگے ہوئے ہیں۔۔۔ وزیر ہو کہ کبیر۔۔۔امیر ہو کہ فقیر، انجام کار دو گز زمین میں تا قیامت اسیر۔۔۔۔خلق خدا کا بھلا کیا تو انعام میں خیر کثیر۔۔۔ برا کیا تو دوزخ میں پابہ زنجیر۔۔لبوں پر دعا ٹھہر گئی۔۔۔اے رب قدیر ۔۔۔اس ادنیٰ پاکستانی ادبی سفیر کا انجام بخیر۔۔۔۔۔۔۔۔۔!!

باسط بھائی نے بتایا کہ ہر جمعہ کو چالیس سے پینتالیس ہزار نمازی یہاں موجود ہوتے ہیں اور عیدین پر اس سے بھی زیادہ۔۔۔مسجد کے ایک طرف انتظامیہ کے بہت سے دفاتر۔۔۔قریب ہی اسلامک سینٹر، اس کے ساتھ ہی تین سبز گنبدوں والی خوبصورت عمارت، یہاں قرآن کریم کے متعدد نادر نسخے۔۔۔اور مختلف انداز میں آیات ربانی کی خطاطی کے نمونے محفوظ ہیں۔۔۔معلوم ہوا کہ اسلامک سینٹر کا انتظام ایک پرائیوٹ ادارہ کے پاس ہے ادارہ کے سربراہ کی والدہ پاکستانی تھیں۔۔۔۔باسط بھائی نے بتایا کہ ہر جمعہ کو حکومت کی جانب سے ملک بھر کی مسجدوں میں نماز جمعہ سے پہلے تحریر کردہ خطبہ FAX کیا جاتا ہے، جہاں فیکس کی سہولت نہ ہو تو سرکاری کارندہ سواری کے ذریعہ خطبہ لیکر پیش امام کو پہونچاتا ہے، خطبہ اسلامی تعلیمات کے عین مطابق ہوتا ہے تاہم مسلم دنیا کی پریشانیوں کے بارے میں دعائیں شامل ہوتی ہیں، خطیب کو تقریر کرنے کی مکمل آزادی ہے صرف سیاسی معاملات پر تبصرہ کرنیکی اجازت نہیں، تاہم کوالالمپور میں ایک مسجد ایسی ہے جسے سرکاری خطبہ پڑھنے سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے۔۔۔اور وہ ہے Masjid Jameek ۔۔۔۔۔یہ مسجد ''لٹل انڈیا'' کے قریب ہے، اصل میں اس مسجد کو ساؤتھ انڈیا سے آنیوالے مسلمانوں نے تعمیر کیا تھا، وہی اسکی دیکھ بھال کرتے ہیں۔۔۔۔یہ مسجد گوم بیک اور کلنگ دریا کے نزدیک واقع ہے۔۔۔اس مسجد کا ڈیزائن ممتاز آرچیٹیکٹ A.B Hubbockny نے تیار کیا

تھا، جنوبی ہند کی طرز تعمیر کا خوبصورت نمونہ ہے۔۔تین گیند ہیں جن پر سفید اور سرخ پٹیاں بنی ہوئی ہیں۔مرکزی گیند 21.3 میٹر اونچا ہے جبکہ اس کا مینار 26.8 میٹر بلند ہے۔۔۔افسوس ہم اس مسجد کو نہ دیکھ سکے۔

State Mosque کو عام طور پر Federal Mosque اور جامع مسجد بھی کہا جاتا ہے۔۔۔ اس مسجد کے تمام داخلی دروازوں پر وال کلاک لگے ہیں جن میں عام وقت کے علاوہ نمازوں کے اوقات بھی ظاہر کئے گئے ہیں۔

مسجد سے نکل کر واپس کار میں آ کر بیٹھ گئے۔تھوڑی مسافت کے بعد ہم ''نیشنل مانو منٹ'' پہونچ گئے۔۔دو دن پہلے ہم بس کے ذریعہ آئے تھے اس لئے پیدل چل کر آنا پڑا تھا۔۔لیکن اب کی دفعہ بذریعہ کار آئے تھے اس لئے گاڑی پارکنگ میں کھڑی کی۔۔۔ یہاں سے ''قومی یادگار'' میں داخل ہونے کا ایک اور راستہ ہے۔۔۔لیکن ہماری بیگم نے کہا ۔۔۔آپ لوگ چاہیں تو یہاں ٹہریں۔۔۔مجھے راستہ پتہ ہے۔۔۔یہ کہکر وہ سیڑھیاں چڑھتی ہوئیں درختوں کی اوٹ میں غائب ہوگئیں ہم خوبصورت اور دیدہ زیب ٹائلوں کے کشادہ دالان میں ایک درخت کے سائے تلے کھڑے باتیں کرتے رہے درختوں کے ساتھ دو فٹ اونچی منڈیریں ہیں جو بیٹھنے کے لئے بنائی گئیں ہیں۔۔۔ہم ان پر بیٹھ گئے۔۔۔ہمارے سامنے مینار تھا اور اس کے چاروں طرف حوض۔۔۔اور یہ حوض آگے جا کر ''مجسمہ اخوت'' کے دائیں بائیں سے گذر کر ایک خوبصورت چوکور حوض کی شکل اختیار کر لیتا ہے جہاں بہت سے فوارے لگے ہوئے تھے۔۔

کچھ دیر بعد بیگم آ گئیں، خوشی سے ان کا چہرہ تمتما رہا تھا۔۔۔بالآخر انہوں نے صوفو کے لئے اپنی پسند کا کھلونا خرید لیا تھا۔۔۔یہاں باسط بھائی کے ساتھ تصویریں بنوائیں۔۔۔گاڑی میں بیٹھ کر ڈاؤن ٹاؤن کے لئے روانہ ہوگئے۔۔۔ہم پچھلے تین دنوں سے شہر کی سڑکوں پر قطار اندر قطار ایستادہ بجلی کے کھمبوں پر پینا فلیکس کا ایک بینر لگا دیکھ رہے تھے۔۔۔اس پر بادشاہ اور ملکہ کی تصویر چھپی ہوئی تھیں، ہمارے ہاں بھی اس قسم کے بینرز لگے ہوتے ہیں، انتخابات کے زمانے میں امیدوار کی تصویر بھی چھاپی جاتی ہے اور عام دنوں میں کسی Product کی تشہیری مہم کے بینرز لگے ہوتے ہیں۔۔۔میں نے باسط صاحب سے معلوم کیا کہ یہ کن کی تصویریں ہیں۔۔۔ انہوں نے بتایا کہ یہ ہمارے King تنکو میزان زین العابدین اور ان کی ملکہ کی تصویریں ہیں

جون کے پہلے ہفتے میں ان کی سالگرہ منائی جاتی ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ کوئی بھی بادشاہ سر پر آرائے تخت ہو، سرکاری طور پر ان کی سالگرہ جون ہی کے پہلے ہفتہ میں منائی جاتی ہے۔۔۔۔ یہی یہاں کی روایت ہے۔۔۔ پینا فلیکس کے بینرز کی چھپائی ہمیں پسند نہیں آئی اس سے بہتر تو ہمارا چھوٹا بھائی اسلم صدیقی بنوا سکتا تھا کہ وہ اسی شعبہ سے وابستہ رہا ہے۔

شاہ تنکو میزان زید العابدین کی پیدائش جون کی نہیں ہے۔۔ ہم نے پوچھا۔

نہیں، ان کی اپنی تاریخ پیدائش کے دن وہ محل میں اپنے اہل خانہ کے ساتھ اگر سالگرہ منانا چاہیں تو ان کی مرضی، لیکن سرکاری طور پہ ہر سال جون میں ان کی سالگرہ منائی جاتی ہے اس دن کی خوشی میں لوگ اپنی دکانوں اور گھروں میں بھی ان کی تصویریں آویزاں کرتے ہیں اور سڑکوں کے کنارے الیکٹرک پولز پر بھی اس طرح کی تصویر لگاتے ہیں۔

ہمیں حیرت ہوئی ملا ایشیاء کے بادشاہ سلامت کس قدر بے اختیار ہیں اپنی اصل تاریخ پیدائش کے بجائے یکم جون کو اپنی سالگرہ منانے پر مجبور ہیں۔۔۔۔ اس موقع پر مجھے ایس۔ ایم منیر یاد آئے میں نے ان کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ منیر بھائی جو پاکستان کی بزنس کمیونٹی میں بہت مقبول ہیں اور کراچی کے تمام مکاتب فکر کے لوگ ان سے بہت پیار کرتے ہیں

عبدالباسط منیر بھائی کے نام پر چونکے پھر بولے عقیل کریم ڈیڈی اور پاکستان میں میرے کافی دوست ان کا ذکر کرتے ہیں۔۔۔۔ پوچھا آپ کو ایس۔ ایم منیر کیسے یاد آ گئے۔۔۔

میں نے کہا اوّل تو وہ ہم پر بہت مہربان ہیں، اس لئے ہم انہیں کبھی بھولتے نہیں، لیکن اس وقت سالگرہ کے تذکرے پر وہ بے اختیار یاد آ گئے۔۔ آپ کو پتہ ہے منیر بھائی کی ''ماہ گرہ'' ہر مہینے کی 17 تاریخ کو بڑے اہتمام سے منائی جاتی ہے۔۔۔۔۔ شاید دنیا بھر میں یہ پہلی مثال ہے۔۔۔۔ ''شاید'' کا لفظ میں نے اس لئے استعمال کیا ہے کہ ''گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ'' میں جلد ہی ان کا نام شامل ہونے والا ہے۔۔

ہر ماہ ان کی سالگرہ منائی جاتی ہے، باسط بھائی نے حیرت سے پوچھا!

جی ہاں، سالگرہ نہیں ''ماہ گرہ'' اسی تقریب کی وجہ سے ''ماہ گرہ'' کا لفظ استعمال ہونے لگا۔۔۔ آئندہ چند ماہ کے بعد انشاءاللہ ان کی ''سویں ماہ گرہ'' منائی جائیگی اور خیال رہے کہ عام طور پر ان کی ماہ گرہ میں چار پانچ سو مہمان مدعو ہوتے ہیں۔۔۔ سابق وزیر اعظم شوکت عزیز۔ سابق وزیر اعلیٰ پنجاب چوہدری پرویز الٰہی، گورنر سندھ ڈاکٹر عشرت العباد خان اور شاید صدر پاکستان بھی

ان کی ماہ گرہ میں شرکت فرما چکے ہیں۔کراچی ہی میں نہیں۔۔۔لاہور۔اسلام آباد۔کینیڈا وغیرہ میں بھی یہ ماہ گرہ منائی جا چکی ہے۔

ایس۔ایم منیر صاحب ہر مہینے اپنے گھر میں یہ تقریب کرتے ہیں۔۔۔عبدالباسط نے حیرت سے پوچھا!

نہیں جناب!ان سے محبت کرنے والے اپنے گھروں میں یا اپنی جانب سے ہوٹلوں میں یہ تقریب منعقد کرتے ہیں اور آپ حیران ہونگے کہ کئی کئی مہینے کی ایڈوانس بکنگ رہتی ہے۔۔ پچھلے برس سردار یٰسین ملک نے اپنی رہائش گاہ پر ان کی سالگرہ منائی تو خصوصی طور پر سابق وزیر اعظم پاکستان شریک ہوئے تھے اور انہوں نے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ مجھے بھی موقعہ دیا جائے کہ میں پرائم منسٹر ہاؤس میں منیر بھائی کی ''ماہ گرہ'' کی تقریب منعقد کروں۔

رضوان بھائی! ہر مہینے ان کی سالگرہ میں لوگ آجاتے ہیں باسط بھائی نے حیرت سے پوچھا۔۔

ارے بھئی لوگ تو 17 تاریخ کا انتظار کرتے ہیں اپنی گھریلو تقریبات کی تاریخ آگے پیچھے کر دیتے ہیں بلکہ بعض دفعہ تو دعوت نامے بقول کسے بلیک ہوتے ہیں اس لئے کہ شہر کی سیاسی، سماجی اور بزنس کمیونٹی سے وابستہ اہم شخصیات اس تقریب میں شرکت کرتی ہیں۔۔۔حکومت کے وزراء کرام خاصی تعداد میں آتے ہیں۔۔۔وفاقی وزراء بھی شریک ہوتے رہتے ہیں۔۔۔اور ہاں بہت سے لوگوں کے کام بھی ہو جاتے ہیں۔

بڑی دلچسپ باتیں آپ نے بتائیں آپ نے۔۔۔کبھی ۱۷ تاریخ کو کراچی میں ہوئے تو ہم اس تقریب میں شریک ہونگے۔

ضرور میری طرف سے آپ کو دعوت ہے

اچھا رضوان صاحب اب ہم شہر کے بیچوں بیچ آگئے ہیں۔۔یہ دیکھیں یہ یہاں کا کنونشن سنیٹر ہے اس کے قریب Renansan ہوٹل ہے اور یہ جو آپ ایک خوبصورت عمارت دیکھ رہے ہیں یہ انکل سرائے بلڈنگ کہلاتی ہے یہاں PIA کا دفتر ہے۔۔۔اس کے ساتھ آپ کے بالکل الٹے ہاتھ پر پاکستانی سفارتخانہ ہے۔۔۔۔ہم نے دیکھا سڑک کے کنارے ایک چہار دیواری کے اندر وکٹورین طرز کی سفید گنبد والی ایک چھوٹی سی عمارت ہے، وائٹ ہاؤس واشنگٹن کی ہلکی سی جھلک نظر آتی ہے۔۔۔اسی دوران سفارتخانے کے دروازہ پر ایک کار آکر رکی اس پر

پاکستانی جھنڈا لہرا رہا تھا۔۔۔ پرچم کو دیکھ کر خوشی کی لہر رگ و پے میں دوڑ گئی۔۔۔ باسط بھائی کہنے لگے۔۔۔ پاکستان کے سفیر کار کی پچھلی نشست پر بیٹھے ہیں۔۔۔ ہم نے دیکھنے کی کوشش کی مگر اس وقت تک چوکیدار نے دروازہ کھول دیا تھا اور کار اندر داخل ہو چکی تھی۔۔۔ سفیر پاکستان تنہا گاڑی میں بیٹھے تھے۔۔۔ ہمیں ذرا تعجب ہوا۔۔۔ ملائیشیا حکومت کی سرد مہری پر طبیعت مکدر ہوگئی۔۔۔ ہمارے کراچی میں تو غیر ملکی سفیروں کے ساتھ موبائل چلتی ہے۔۔۔ ہم نے اپنی ناراضگی کا اظہار کیا تو باسط بھائی نے بتایا یہاں پروٹوکول کا وہ طریقہ رائج نہیں ہے جو آپ کے ملک میں ہے یہاں تو وزیر آپ کے پاس سے گذر جائے گا اور آپ کو پتہ بھی نہیں چلے گا۔۔۔ رضوان بھائی یہاں افراد نہیں ادارے مضبوط ہیں۔۔۔ عام آدمی کو وزیروں سفیروں سے کوئی دلچسپی نہیں۔۔ کیونکہ عام آدمی کو اپنے مسائل کے حل کے لئے وزیروں سے ملنے کی خواہش نہیں، لوگ نا ان کے دفتر کے چکر کاٹتے ہیں اور نہ وزیروں سے ملنے کی انہیں ضرورت پیش آتی ہے یہاں کا سسٹم ایسا ہے کہ آپ کا ہر معاملہ متعلقہ دفتر میں بغیر کسی رکاوٹ کے آرام سے حل ہو جاتا ہے۔۔۔ ہمارے ہاں تو غیر ملکی سرمایہ کار کو بھی سرکاری سفارش کی ضرورت نہیں۔۔۔ وہ ملائیشیاء آئے ضابطے کی کاروائی مکمل کرے، اور پندرہ دن کے اندر اپنا بزنس یا کارخانہ شروع کر دے۔۔۔ اللہ اللہ خیر صلا اللہ،

ہم نے باسط بھائی سے پوچھا کہ یہاں رہائشی مکانات، سب کے سب ایک سے ہیں اور کم لاگت میں تعمیر ہونے والی بیس بیس منزلہ عمارتوں کا ناک نقشہ بھی ایک سا ہے۔۔۔

باسط صاحب نے بتایا کہ چھوٹے پلاٹوں کے لئے دو تین طرح کے نقشے حکومت نے منظور کئے ہوئے ہیں۔۔۔ ان میں سے کسی ایک نقشہ کو پسند کر کے آپ گھر بنالیں۔۔۔ عام آدمی کے پاس مکان تعمیر کرنے کی فرصت نہیں ہے اس لئے یہاں کے Builders سستے مکان تعمیر کرتے ہیں۔۔۔ حکومت بھی ان کی مدد کرتی ہے۔۔۔ آپ فلیٹ یا مکان Book کرائیں اور رہائش اختیار کرلیں۔۔۔ بس مقررہ قسط ہر ماہ ادا کرتے رہیں۔۔۔ اور یہ جو کم لاگت کے فلیٹس آپ نے دیکھے ہیں یہ تو بہت سستے ہیں اور حکومت آسان قسطوں پر مہیا کرتی ہے۔۔۔ اگر آپ 500 رنگٹ مہینہ بھی کماتے ہیں تو آسان قسطوں پر مکان خرید سکتے ہیں۔۔

ہم نے یہاں کوئی کچی بستی۔۔۔ جھونپڑ پٹی۔۔۔ خستہ حال مکان یا جھگیاں نہیں دیکھیں۔۔۔ باسط مسکرائے۔۔۔ ٹھیک کہتے ہیں، مگر آپ جانتے ہیں، کچی بستیاں، سرکاری

زمین پر ناجائز قابضین آباد کرتے ہیں، یہاں تو سرکاری یا نجی زمینوں پر ناجائز قبضہ کا تصور ہی نہیں ہے جب آپ کو رہنے کے لئے گھر مل رہا ہے تو آپ جھگی کیوں ڈالیں گے۔۔۔؟؟

ہم اندر ہی اندر شرمندہ ہو رہے تھے۔۔۔اس لئے موضوع بدل دیا۔۔۔

یہ بتائیے یہاں کتنی سرکاری چھٹیاں ہوتی ہیں۔۔

پانچ۔۔۔باسط صاحب نے جواب دیا۔۔۔

صرف پانچ۔۔۔ہم حیران ہو گئے۔۔۔

اور مذہبی تہوار۔۔۔۔؟

سب منائے جاتے ہیں، عید، بقرعید، رمضان۔۔۔مگر صرف عید پر ایک روز کی تعطیل ہوتی ہے اور رمضان کا مہینہ پوری قوم مناتی ہے۔۔مگر دفاتر۔دکانیں۔بازار سب کھلے رہتے ہیں۔۔ بدھسٹ۔ہندو۔چینی اور عیسائی پورے رمضان روزے کا احترام کرتے ہیں۔۔۔کسی ہوٹل میں خواہ وہ چینی کا ہو۔۔۔ہندو کا ہو عیسائی کا ہو۔۔۔کھانا۔۔چاء۔۔۔کافی۔۔۔کولڈ ڈرنک سب بند ہوتی ہیں۔۔۔لیکن افطار کا اہتمام قابل دید ہوتا ہے۔۔۔بلا رنگ و مذہب تمام لوگ افطاری کا اہتمام کرتے ہیں۔۔۔شام سے پہلے لوگ افطاری کی چیزیں خریدتے ہیں اور مغرب کی اذان پر کھانا پینا شروع ہو جاتا ہے۔۔۔رات بھر ہوٹلیں کھلی ہوتی ہیں، ایک رونق میلہ ہوتا ہے۔۔۔ مساجد میں تراویح پڑھائی جاتی ہیں۔۔۔اور ہاں یہ سب رضا کارانہ طور پر ہوتا ہے۔۔۔یہاں ایسا کوئی قانون نہیں جس کے خوف سے رمضان کا احترام کیا جائے۔۔۔۔رہائشی ہوٹلوں میں البتہ غیر مسلموں کو ان کے کمرہ میں کھانا Serve کیا جاتا ہے۔۔۔

لیکن عید پر چھٹی صرف ایک ہوتی ہے۔۔۔ہم نے پھر سوال دہرایا؟

جی ہاں عید پر ایک چھٹی ہوتی ہے اس کے علاوہ کرسمس ڈے۔۔۔۔بدھسٹ اور دیوالی پر سرکاری تعطیل ہوتی ہے جبکہ ۳۱ اگست کو یوم آزادی نہایت جوش و خروش سے منایا جاتا ہے۔

کیا ملا ایشیاء کے تمام قومی ہیروز زندہ ہیں، ہم نے سوال کیا؟

کیا مطلب؟؟

ہمارا مطلب ہے کہ ہم تو اپنے محسنوں، صوفی بزرگوں اور مرحوم قومی رہنماؤں کا یوم مناتے ہیں اور چھٹی کرتے ہیں۔۔۔۔ہمارے ہاں تو ''نو چندی جمعرات'' پر بھی یار لوگ چھٹی کر لیتے ہیں۔۔۔ہنگامے۔۔۔ہڑتال۔۔۔مظاہرے۔۔۔احتجاج۔۔۔تیز بارش، الیکشن، سیاسی جلسے

اور جلوس وغیرہ کے مواقع پر چھٹی ہو جاتی ہے۔

ہوتی ہوگی۔۔۔ہمارے ہاں لوگ کام کرتے ہیں۔۔۔قائداعظم نے کہا تھا نا کہ کام ۔۔۔کام۔۔۔اور کام۔۔۔ان کے قول پر یہاں عمل ہوتا ہے۔۔۔ہم خاموش ہو گئے اور گفتگو بدلنے کے لئے نیا موضوع تلاش کرنے لگے۔۔۔کہ اچانک ہم نے ان سے ایک اونچی عمارت کے بارے میں دریافت کیا ،جس کا ڈیزائن بالکل مختلف اور دیدہ زیب تھا۔۔۔ بولے یہ دکتور خالد کی ملکیت ہے۔۔۔پچپن منزلہ ہے۔۔

یہ دکتور خالد کون ہیں۔۔

کہنے لگے۔۔۔ملاایشیاء کی سب سے مقبول گلوکارہ حئ نوحلیزا ہے، سمجھو یہاں کی نور جہاں ۔۔۔بہت مشہور ہے۔۔۔دکتور خالد ان کے شوہر ہیں، ملاایشیاء کے جتنے قومی اعزاز ہیں وہ سب حئ نوحلیزا کو مل چکے ہیں،عوام اس کے دیوانے ہیں گلی کوچوں میں اس کے کیسٹ بجتے رہتے ہیں۔۔۔

کیا عربی زبان میں بھی گیت گاتی ہیں،بیگم نے پوچھا

ہاں کئی زبانوں میں گاتی ہیں لیکن بنیادی طور پر ملائے زبان کی گلوکارہ ہیں، مذہب سے گہرا لگاؤ ہے۔۔۔۔

میوزیکل کنسرٹ وغیرہ میں گاتی ہیں۔۔

بولے ہاں بھئی۔۔۔لیکن With covered dress۔۔۔۔

اس کے بعد ہم ایک پرانے سے شاپنگ پلازہ کے پاس سے گذرے،لوگوں کی بڑی بھیڑ تھی یہاں۔۔۔دکانیں ایسی جیسے ہمارے یہاں میلے ٹھیلوں یا نمائش میں ہوتی ہیں کہنے لگے۔۔۔ یہ کوالالمپور کا پرانا بازار ہے ''ان پام پارک'' کہلاتا ہے۔۔۔ہم عرب اسٹریٹ سے گذرے تو باسط صاحب نے ایک ہوٹل کے دروازے پر گاڑی روک کر کہا آپ لوگ اتر جائیں۔۔۔ میں کار پارک کرلوں۔۔۔بیگم۔۔۔بھانجی۔۔۔اور ان کے شوہر اتر گئے۔۔۔میں ان کے ساتھ رہا۔۔۔ ایک گیٹ میں داخل ہوئے۔۔۔۔لمحہ بھر کو ر کے دروازہ اوپر اٹھا اور وہ ایک احاطہ میں گاڑی لیگئے ۔۔۔کہنے لگے یہاں کرایہ پر گاڑیاں پارک کی جاتی ہیں۔۔۔اس سے پہلے ایک شخص نے انہیں ایک پرچی تھمادی۔۔۔

کیا طریقہ ہے۔۔۔؟

بولے۔۔۔اگر جگہ خالی ہوتی ہے تو یہ گیٹ کھول دیا جاتا ہے، یہاں تین رنگٹ فی گھنٹہ کے حساب سے پارکنگ فیس لی جاتی ہیں۔۔۔

باسط نے گاڑی پارک کی۔۔۔ہم کار سے نیچے اتر آئے سر اٹھا کر دیکھا تو

ایک خوبصورت بلند عمارت ہمارے سروں پر کھڑی تھی پچاس منزلہ عمارت کے بیرونی حصہ پر ابتدائی منزلوں سے لیکر آخری منزل تک نہایت فنکارانہ مہارت کے ساتھ ''اللہ'' لکھا نظر آرہا تھا۔۔باسط بھائی ہمیں اس عمارت کے بارے میں بتانے لگے کہ اس عمارت کا نام ''تابن حاجی'' ہے۔۔۔تابن ملائے زبان میں گلے کو کہتے ہیں، بھیڑ بکریوں کا نہیں بلکہ گلک جس میں بچوں کے لئے سکے جمع کئے جاتے ہیں'' تابن حاجی'' محکمہ حج واوقاف کی ملکیت ہے۔۔۔ ملائیشیاء میں ہر مسلمان کو سرکاری طور پر حج کی سہولت حاصل ہے۔۔پورے ملک میں ہر مسلمان کی تنخواہ سے تین فیصد رقم ''حج فنڈ'' کے لئے مہنا کر لی جاتی ہے خواہ وہ سرکاری ملازم ہو یا کسی نجی ادارے میں کام کرتا ہو یا ذاتی کاروبار کرتا ہو، ہر مسلمان شہری کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جب چاہے زندگی میں ایک بار حج کی سعادت حاصل کر سکتا ہے۔۔۔یہ بھی ضروری نہیں کہ اس کے اکاؤنٹ میں حج کے اخراجات جمع ہوئے ہیں۔

باسط بھائی نے حکومت کی جانب سے عوام کو حج ادا کرنے کی اسکیم کا تفصیلی ذکر کیا ہمیں پاکستان میں رہنے والے غریب اور محدود وسائل رکھنے والے حج کے ہزاروں لاکھوں خواہش مند یاد آگئے۔۔۔۔جو عمر بھر دعائیں کرتے رہتے ہیں مگر ان کی غالب اکثریت خانہ کعبہ کا طواف اور حضور اکرمؐ کے روضہء اطہر کی زیارت کرنے کی آرزو دل ہی میں لئے اس دنیا فانی سے رخصت ہو جاتی ہیں۔۔۔۔کم ہی لوگ ایسے ہیں جو عمر بھر حج کے لئے چھوٹی چھوٹی رقم جمع کرتے رہتے ہیں اور فریضہء حج ادا کر پاتے ہیں۔۔۔۔بہت سے لوگ ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد ملنے والی رقم سے حج کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔۔۔۔ہاں غریب والدین کی اولاد لائق ہو جائے تو ان کے بچے حج کے لئے زادراہ فراہم کرتے ہیں۔۔۔میں نے باسط بھائی کو مزید بتایا کہ ہمارے یہاں بہت سے صاحب ثروت اور نیک طینت لوگ ایسے ہیں جو ہر سال اپنی بساط کے مطابق خواہش مند مگر وسائل سے محروم لوگوں کو عمرہ یا حج کرانے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔۔۔پاک لینڈ'' کے طارق محسن نے دو تین برس تک سینکڑوں لوگوں کو حج پر بھجوایا پھر یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔۔۔اس موقع پر مجھے سردار یسٰین ملک اور عبدالحسیب خان یاد آگئے۔۔۔اللہ

تعالیٰ نے انہیں فیاض دل اور کشادہ دست عطا کیا ہے۔۔۔کئی برس سے سردار یٰسین ملک اور عبدالحسب خان باقاعدگی سے آرٹس کونسل آف پاکستان کراچی کے پانچ اراکین کو عمرہ کا ٹکٹ مہیا کرتے ہیں۔۔۔اس کار خیر میں کبھی کبھی یحییٰ پولانی بھی شامل ہو جاتے ہیں۔۔۔سردار یٰسین ملک اور عقیل کریم ڈیڈی کے بارے میں سنا ہے کہ وہ بہت سے لوگوں کے لئے حج اور عمرہ کا بندوبست کرتے ہیں۔۔۔سردار یٰسین ملک کا ذکر میں نے اس لئے بھی کیا ہے کہ ایک بار انہوں نے مجھے اور میری اہلیہ کو عمرہ کا ٹکٹ فراہم کیا تھا اس موقع پر ایس۔ایم منیر، منظور روفی، شیخ منظر عالم کا ذکر نہ کروں تو زیادتی ہوگی کہ انہوں نے میری درخواست پر انجمن شیدائیان رسول کے زیر اہتمام منعقدہ محفل نعت کے شرکاء میں بذریعہ قرعہ اندازی عمرہ اور حج کے ٹکٹ مہیا کئے تھے۔۔۔نیکو کاروں کا ذکر کرنا بھی نیکی ہے۔۔۔اور اپنے مہربانوں کو یاد رکھنا بھی عمل خیر ہے۔۔۔

گاڑی پارکرتے ہوئے باسط بھائی نے بتایا کہ یہ عمارت اسی حج فنڈ سے تعمیر کی گئی ہے۔۔

گاڑی سے اتر کر ہم ٹہلتے ہوئے باہر آئے۔۔۔باقی لوگ ہمارے منتظر تھے

باسط صاحب کی بھانجی اور بھانجہ کہنے لگے۔۔۔انکل ہمیں اس ہوٹل کا کھانا بہت پسند ہے یہ پاکستانی کھانوں کا سب سے مشہور ہوٹل ہے۔۔

عبدالباسط بتانے لگے کہ دراصل یہاں پاکستانی، انڈین اور ملائیشین کھانا ملتا ہے پاکستانیوں کو خاص طور پر اس ہوٹل کا کھانا بہت پسند آتا ہے۔۔یہاں پر مقیم پاکستانیوں کے جو مہمان آتے ہیں انہیں وہ اس ہوٹل میں ضرور لاتے ہیں۔۔۔ہم ہوٹل میں داخل ہوئے صاف ستھرا بہت کشادہ حصہ۔۔۔ایک وقت میں دو ڈھائی سو افراد کھانا کھا سکتے ہیں۔۔۔ہم ایک بڑی میز کے گرد بیٹھ گئے۔۔۔ویٹر نے مینو کارڈ لا کر دیا۔۔۔باسط بھائی نے ہم سے پوچھا کیا پسند کریں گے۔۔۔ہم نے کہا جو آپ چاہیں منگوالیں۔ہاں مچھلی ضرور منگوائیں۔۔

باسط بھائی نے بہت ساری چیزوں کا آرڈر دیدیا۔۔۔ہم منع کرتے رہے مگر انہوں نے کہا کہ میں نے ملائیشیاء کی وہ تمام Dishes منگالی ہیں جو پاکستانی کھانوں سے ملتی جلتی ہیں، آپ حیران ہونگے کہ مقامی کھانے تقریباً پاکستانی ہوتے ہیں

ہم نے مڑ کر دیکھا ہماری پشت پر ہی Open Kitchen تھا۔۔وہاں ایک آدمی بیلن سے روٹی کو پھیلائے جا رہا تھا جس طرح پوری بنانے والے ذرا سے پیڑے کو بیلن پھیر پھیر کر بہت بڑا کر لیتے ہیں۔۔۔پیڑہ کا سائز کافی بڑا تھا۔۔۔اس کے بعد پھیلی ہوئی روٹی کو بل دے کر سمیٹا

اور پراٹھے پکانے کی طرح اسے ایک بار پھر پیڑہ کی شکل دی اور اس کے بعد چکلے پر رکھ کر بیلن چلانا شروع کیا۔۔کئی بار یہ عمل دہرایا اور اس کے بعد گرم توے پر رکھ دیا۔۔۔دونوں طرف سے باری باری سینکا اور پراٹھا تیار۔۔۔ہم نے سوچا یہ تو بالکل ہماری طرح کا پراٹھا ہے۔۔۔باسط صاحب نے ہمیں متوجہ پاتے ہوئے کہا کیا یہ پاکستانی پراٹھہ نہیں ہے۔۔

ہم نے کہا بالکل پاکستانی ہے۔۔۔۔۔۔۔!!

بولے یہاں پر اسے ''روٹی چنائے'' کہتے ہیں اس میں آٹے کے ساتھ بیسن بھی ملایا جاتا ہے۔۔لیکن اس کی خوبی یہ ہے کہ جب آپ کھائیں گے تو آپ کے ہاتھوں میں اس کی چکنائی محسوس نہیں ہوگی اور ذائقہ بھی پراٹھے سے مختلف مگر اچھا ہوگا۔۔

روٹی چنائے جب ہمارے سامنے آئی تو واقعی انگلیوں میں معمولی سی چکنائی بھی محسوس نہیں ہوئی۔۔۔اور اتنی خستہ کہ آپ توڑ کر اور اپنی مرضی سے موڑ کر لقمہ نہیں بنا سکتے

باسط صاحب نے بتایا کہ یہاں سب سے مقبول ڈش ''ناسی کندا'' ہے۔۔۔یہ آپ نے ضرور کھائی ہوگی۔۔۔آپ نے چاول تو کھائے ہونگے۔۔۔

جی ہاں تقریباً روز ہی، میں نے جواب دیا

کہنے لگے پاکستان میں چاول دال۔۔۔چاول مچھلی۔۔۔چاول سبزی کھاتے ہیں

ہم نے کہا کل ہی ہم نے چاول کے ساتھ مچھلی۔۔۔چکن کا سالن اور دال کھائی ہے۔۔

بولے بس اسی ڈش کو ناسی کندا کہتے ہیں۔۔۔سو سال پہلے ساؤتھ کے مسلمان جب ملایا میں آئے تو اپنے کندھے پر رکھ کر ابالے ہوئے چاول فروخت کرتے تھے۔۔۔سادہ چاول میں، کچھ لوگ دال ڈال کر کھاتے کچھ لوگ سبزی وغیرہ ڈال کر کھاتے ہیں۔۔۔اصل میں مقامی زبان میں ناسی کا مطلب چاول ہے اور چونکہ ساؤتھ انڈین اسے کندھے پر رکھ کر بیچتے تھے اس لئے کندھا بگڑ کر کندا بن گیا۔۔۔اب پورے ملک میں ''ناسی کندا'' سب سے زیادہ مقبول Dish ہے ہوٹلوں میں مختلف طرح کے سالن ہوتے ہیں۔۔۔لوگ ایک پلیٹ میں چاول لیتے ہیں اور اس پر اپنی پسند کا سالن ڈال لیتے ہیں ''ناسی کندا'' ناشتہ میں دوپہر اور رات کے کھانے میں باقاعدگی سے استعمال ہوتا ہے۔۔۔

بالکل اسی طرح ایک مقامی ڈش ہے SATAY۔۔۔۔۔ساتے۔۔۔۔گوشت کی چھوٹی چھوٹی بوٹیاں تنکے میں پرو کر سینکی یا پکائی جاتی ہیں۔۔۔آپ بھی پاکستان میں کھاتے

ہیں۔۔۔ یہاں اس کا نام ساتے ہے۔۔۔ عید، بقرعید پر ہر گھر میں ساتے پکایا جاتا ہے۔۔۔ اس طرح عید اور بقرعید کے تہوار پر یہاں سویوں کی جگہ Rengang پکایا جاتا ہے چکن مصالحہ کی طرح ہوتا ہے اور تہوار کے موقعہ پر ضرور پکایا جاتا ہے۔۔۔

یہاں کی ایک اور خاص ڈش Lamang ہے۔۔۔ اس کے پکانے کا طریقہ یہ ہے کہ خالی بانس میں چاول بھر کر کوئلوں کی آنچ میں رکھدیا جاتا ہے جب بانس جل جاتا ہے تو اسے نکال کر ڈبل روٹی کی طرح پکے ہوئے چاول کے سلائس کاٹ لئے جاتے ہیں۔۔۔ اس طرح کتو پات (Ktu Pat) بھی تہوار ہی کی ڈش ہے اسے پکانے کا طریقہ یہ ہے کہ چاول ابال کر بانس کے چھلکوں میں رکھ دیتے ہیں اس طرح Rendang لمیان اور کتو پات تینوں کو ملا کر کھاتے ہیں ،عید بقرعید کے موقع پر مذکورہ تینوں چیزیں ضرور پکائی جاتی ہیں۔۔

اس دوران ویٹر نے میز پر بہت سی Dishes چن دیں، مختلف طریقوں سے پکی ہوئی مچھلی چاول ناسی کندا روٹی چنائے۔۔۔ دال۔۔۔ تلے ہوئے پران۔۔۔ کھانا بے حد لذیذ تھا۔۔۔ ساتھ میں تنوری روٹیاں۔۔۔ اس دوران بھانجے نے ویٹر کو بلا کر کچھ طلب کیا۔۔۔ ملائے نام تھا اس لئے ہم سمجھ نہیں سکے کونسی Dish منگوائی ہے۔۔۔۔ کچھ دیر بعد وہم نے دیکھا کہ ایک بڑے سائز کے ''جام'' میں وہ گولا گنڈا لے آیا۔۔۔ جام (پیالہ) کا سائز اتنا بڑا تھا کہ ہمارے ہاں کے پانچ گولے گنڈے اس میں سما جائیں۔۔۔ پیالے کے نیچے روح افزا ٹائپ شربت پیالے میں کٹی ہوئی برف (گولہ گنڈا) اور برف کے اوپر کون آئسکریم۔۔۔ ایک ہی پیالہ تین چار لوگوں کے لئے کافی تھا۔۔۔۔ ہم نے اس کا نام پوچھا تو کہا اے۔ بی۔ سی یعنی ''آپر باتو چمپور'' اب آپ خود بتائیے کہ مینو کارڈ میں یہ نام پڑھ کر کون آرڈر دے گا۔۔۔ ہمیں تو نام سن کر ایسا لگا کہ آرڈر دینے والا خود اعتراف کر رہا ہے کہ ''میں چمپو ہوں''۔۔۔ بھئی میں تو کبھی بھی اس آپر بی سی کا آرڈر دینے کے لئے اس کا پورا نام لینے کو تیار نہیں۔۔۔ بھانجہ نے منگوالیا اور ہم سب نے چھک لیا بس یہاں تک ٹھیک ہے۔۔۔ ذائقہ ایسا ہی تھا جیسے فالودے والے گولے گنڈے کا ہوتا ہے

باسط صاحب نے ملک روز بھی منگوایا۔۔۔ دودھ میں سرخ رنگ کا شربت ڈالا گیا تھا روح افزا ہوتا تو بہت مزہ آتا۔۔۔ کیونکہ بہت زیادہ خوش ذائقہ نہ تھا۔

کھانے کے آخر میں کہنے لگے۔۔۔ چاء پیئں گے۔۔۔ یہاں کی خاص چائے کو۔۔۔ تاری۔۔۔۔ کہتے ہیں ہم نے خوش دلی سے اثبات میں جواب دیا

اور پوچھا تتاری چاء میں کیا خوبی ہوتی ہے۔۔۔

باسط کہنے لگے۔۔۔ جیسے پاکستان میں ''کھیر پتی یا دودھ پتی چاء ہوتی ہے۔۔۔۔ بالکل ایسی ہی ہوتی ہے لیکن گھروں میں بہت اہتمام سے بنائی جاتی ہے۔۔۔ اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ پانی ابال کر چاء کی پتی اور دودھ ڈالتے ہیں اس کے بعد دو برتنوں میں لیکر اسے خوب پھینٹتے ہیں یعنی ایک برتن سے دوسرے برتن میں ڈالتے رہتے ہیں آپ چاء کو جتنی دیر پھینٹیں گے اس میں اتنی ہی لذت بڑھ جائے گی۔۔۔

یہ سن کر ہمیں اپنے بچپن کا زمانہ یاد آ گیا، ہم شاید کچی پکی پہلی میں پڑھتے تھے، میرے والد بزرگوار قاضی ظہور احمد صدیقی روز تو نہیں لیکن ہفتہ میں دو تین بار مجھے اور میرے چھوٹے بھائی چمن کو اپنے ساتھ ایڈوانی گلی میں لے جاتے جہاں دودھ کی دکان تھی اور ایک بہت بڑی اور چوڑی کڑھائی میں دودھ بھرا ہوتا تھا۔۔ ابا۔۔۔۔۔ ہمارے لئے پاؤ پاؤ دودھ کا آرڈر دیتے۔۔۔۔ دودھ والا کڑھائی سے ایک پاؤ دودھ نکالتا، اس میں دو چمچے شکر ڈالتا اور اس کے بعد دو برتنوں میں کافی دیر تک دودھ کو پھینٹ کر ٹھنڈا کرتا۔۔۔ ہمیں دودھ سے زیادہ دودھ پھینٹنے کا انداز پسند آتا تھا۔۔۔ دودھ والا لمبا تڑنگا آدمی تھا۔۔۔ شفیق اور بچوں سے پیار کرنے والا۔۔۔ وہ ایک برتن میں دودھ لیکر اپنے بازو کو اوپر تک بلند کرتا اور اس کے بعد برتن سے دودھ کی دھار نیچے والے برتن میں ڈالتا۔۔۔ اس کے بعد نیچے والے برتن کو فضا میں بلند کرتا اور اس میں موجود دودھ کو نیچے والے برتن میں ڈالتا، پتلی سی دودھ کی سفید دھار بن جاتی ہے کافی دیر دودھ پھینٹنے کے بعد وہ ایک پاؤ دودھ کو ایک بڑے پیالے میں ڈالتا اس کے بعد ایک لمبا کرچھا لیکر وہ کڑھائی کے آخری سرے پر جمی ہوئی دودھ کی موٹی بالائی کو نشانہ باندھ کر کاٹتا اور موٹی بالائی کا ایک ٹکڑا نکال کر دودھ بھرے پیالے میں ڈال دیتا۔۔۔ ہم نے زندگی بھر دودھ سے رشتہ استوار رکھا، اماں جب تک زندہ رہیں ہمارے لئے دودھ کا پیالہ الگ سے بھر کر رکھ دیا کرتی تھیں۔۔۔ اب بھی ہم دودھ ہی سے ناشتہ کرتے ہیں۔۔۔ لیکن سچ یہ ہے کہ اس جیسا دودھ پھر کبھی نہیں پیا۔۔۔۔ باسط صاحب نے چاء پھینٹنے کا ذکر کیا تو نصف صدی سے پرانا منظر آنکھوں میں در آیا۔۔۔ جب پھینٹنے سے دودھ میں سواد بڑھ جاتا ہے تو تتاری چاء میں بھی لذت بڑھ جاتی ہوگی۔۔۔ ہوٹل والے نے چاء لا کر دی۔۔۔ چاء پی مگر وہ مزہ نہیں جو اپنی دودھ پتی میں ہے۔۔۔ تتاری چاء میں بھی ہوتا ہوگا، اگر گھر میں پھینٹ کر بنائی جائے۔۔۔ اسی طرح دودھ کو پھینٹتے دیکھ کر کسی نازک مزاج نے دودھ فروش

سے کہا تھا۔۔۔ بھائی صاحب! اگر زحمت نہ ہو تو ایک گز دودھ دیجئے گا۔۔

کھانا کھانے کے بعد ہوٹل سے نکلے۔۔۔۔ اب ہمیں یاد آیا کہ یہ تو وہی راستہ ہے جہاں سے گذر کر ہم B.B Shopping Centre گئے تھے۔۔۔۔ گاڑی میں بیٹھے دروازہ پر آئے تو باسط صاحب نے Parking Chit دربان کو دی اس نے کمپیوٹر میں ڈال کر پارکنگ ٹائم سے رقم کا اندازہ کیا باسط بھائی نے مطلوبہ رقم ادا کی اور ایک بار پھر ہماری گاڑی سڑک پر سبک روی سے چلنے لگی۔۔۔ خیال رہے کہ جس ہوٹل میں ہم نے کھانا کھایا تھا اس کے سامنے نیکو ہوٹل ہے۔۔۔۔۔

گاڑی ایک بار پھر پرانے شہر میں داخل ہوگئی یعنی چائنا ٹاؤن کے آس پاس۔۔۔۔ باسط صاحب ہمیں ہوٹل پہونچانا چاہتے تھے۔۔۔ بیگم کی رائے تھی کہ ہم چائنا ٹاؤن اتر جائیں، بچوں کے لئے کچھ چیزیں خریدنا ہے۔۔۔۔ بھانجی نے بھی چائنا ٹاؤن اترنے کی خواہش کی کہ انہیں سینٹرل مارکیٹ میں شاپنگ کرنا تھی۔۔۔۔ باسط صاحب نے بھانجی سے پوچھا تم لوگ واپس گھر کیسے آؤ گے بھانجی اور بھانجے نے کہا ہم ٹیکسی یا بس سے پہنچ جائیں گے۔۔۔ باسط صاحب راضی ہوگئے۔۔۔

رخصت ہوتے وقت ہم نے باسط صاحب کا شکریہ ادا کیا۔۔۔۔ بھابھی کو سلام کہا۔۔۔۔ بھانجی کو بھی بیگم نے پیار کر کے دعائیں دیں اور دونوں پارٹیاں الگ الگ ہوگئیں۔۔۔ ''کنگ میان ریستوران'' کے قریب ہمیں اتار کر باسط صاحب چلے گئے

تنگ گلیوں کی فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے ہم چائنا ٹاؤن میں داخل ہوگئے۔۔۔ رنگ رنگے اور بارونق بازار میں دکانیں کھل گئیں تھیں مگر سڑک کے بیچوں بیچ ٹھیلہ نما دکانیں کھل رہی تھیں۔۔۔۔ چینی لڑکیاں اپنے اپنے اسٹالز میں سامان سجا رہی تھیں۔۔۔ کہا جاتا ہے کہ چائنا ٹاؤن میں دوپہر تین بجے کے بعد کاروبار شروع ہوتا ہے۔۔

چائنا ٹاؤن سے باہر کا علاقہ ''یہوم پانگ'' کہلاتا ہے۔

بیگم چھوٹی چھوٹی دکانوں میں تانک جھانک کرتی رہیں۔۔۔۔ ہم بھی ان کی دیکھا دیکھی یہی کام کرتے رہے مگر دکانوں سے باہر کل ہم نے جس چورنگی کا ذکر کیا تھا یہاں ٹھیلوں پر پھل فروخت ہو رہے تھے، تربوزہ اور پپیتا کاٹ کر ایک ایک قاش کی صورت بیچا جاتا ہے

یہاں ایک پھل انار کی طرح کا تھا کالے رنگ کی جلد۔۔۔ موٹا چھلکا ہٹاؤ تو اندر سے سفید

گودا نکلتا ہے بہت لذیذ ہوتا ہے۔۔۔اسے Mango Streen کہتے ہیں۔۔۔۔

یہاں نارنگی کی ایک اور بھی قسم ہوتی ہے۔۔Dark orange کہلاتا ہے۔۔۔اندر سے سرخ ہوتا ہے۔۔ایک اور پھل Rambutau۔۔۔۔لیچی کی طرح ہوتا ہے مگر جلد پر بہت بال ہوتے ہیں دیکھنے میں اچھا نہیں لگتا۔۔

ماتا کوچی (Mata Kucin) لوکاٹ کی طرح کا پھل ہے لگتا ہے بلی کی آنکھیں چھبڑی میں پڑی ہیں اس کی کھال بھورے رنگ کی ہوتی ہے، کھال اتار دو تو بالکل لیچی کی طرح اور ذائقہ بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔۔۔ایک پھل Star کہلاتا ہے اسے چھیل کو سلائس بنائے جاتے ہیں تو اس میں ستارے نظر آتے ہیں۔

ایک پھل بینگن کی طرح کا ہوتا ہے سائز میں ذرا چھوٹا۔۔۔یہاں چھوٹے بیروں کی طرح کا پھل بھی دیکھا۔۔ہم نے اپنے قیام کے دوران بہت سے پھل کھائے۔۔۔لیکن تربوز کے علاوہ کسی بھی پھل میں، پاکستانی پھلوں کا سا ذائقہ نہیں۔۔آم۔۔نارنگی۔۔سیب۔۔۔کیلے۔۔ پپیتا۔۔خربوزہ۔۔موسمی۔۔یہ تمام پھل ہیں مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی۔۔''

چائنا ٹاؤن میں ایک اور پھل دیکھا، چورا ہے پر آمنے سامنے دو ٹھیلوں پر گیس کے چولہوں پر دو بڑے برتن رکھے تھے۔۔۔دیگچے سے ذرا بڑا اور دیگ سے چھوٹا۔۔ اس برتن میں سمندری ریت بھری ہوئی تھی اس کے اندر ایک خود کار کرچھا لگا ہوا تھا جو گرم ریت کو الٹ پلٹ رہا تھا آپ یوں سمجھ لیجئے جس طرح ہمارے ہاں ایک مشین میں بجری، سیمنٹ اور روڑی ڈال کر چھت بھرائی کے لئے مصالحہ تیار کیا جاتا ہے بالکل اسی طرح کی مشین مگر چھوٹی۔۔۔اس گرم ریت میں بادام سے ذرا زیادہ بڑا مگر گول گول سا ایک پھل مونگ پھلی کی طرح بھونا جا رہا تھا۔۔جب وہ اچھی طرح بھون لیا جاتا ہے تو سوراخوں والے بڑے کرچھے سے نکال لیا جاتا ہے۔۔۔اسے Wallnut کہتے ہیں۔۔۔اس کا چھلکا سخت ہوتا ہے اندر سے اس کی گری سفید ہوتی ہے کھانے میں شکر قندی کا سا ذائقہ محسوس ہوتا ہے۔۔۔یہ پھل ہمیں بہت پسند آیا۔۔

چائنا ٹاؤن کی ایک گلی میں پھولوں کی دکانیں ہیں۔۔یہاں گلدستے فرخت ہوتے ہیں ہم نے بکے نہیں دیکھے۔۔۔خوبصورت اور خوش رنگ تازہ تازہ پھولوں کو اس خوبصورتی سے سجایا جاتا ہے کہ نظریں ہٹتی نہیں ایسا ہی ایک گلدستہ جاوید حسن اور رضوان مرچنٹ نے ہمیں کوالالمپور ائیر پورٹ پر بھجوایا تھا۔۔۔لاتعداد چھوٹے بڑے گلدستے۔۔۔نہایت خوش سلیقگی کے ساتھ پھولوں کو

آپس میں گھوند کر گلدستے بنائے گئے تھے، دیکھو تو آنکھوں میں ٹھنڈک پیدا ہوتی تھی دکان سے آگے کے تخت نما حصہ میں پھول ہی پھول تھے۔۔۔ مجھے رنگوں کی زیادہ تمیز بھی نہیں اور ان کے نام بھی نہیں معلوم لیکن قدرت نے جتنے رنگ اس دھرتی کے پودوں اور پھولوں میں اتارے ہیں وہ سب موجود تھے ان پھولوں کے پیچھے ایک نوخیز چینی پھول کھلا ہوا تھا وہ پھولوں کے گلدستوں میں سے ایک گلدستہ ہی محسوس ہو رہا تھا، یوں لگتا تھا کہ پھولوں کے سارے خوش رنگ اس کے چہرے پہ سمٹ آئے ہیں یا اس نے اپنے چہرے کے رنگ پھولوں پہ چھڑک دیئے ہیں۔۔۔۔ میں نے اس کی ادھ کھلی موتیا آنکھوں میں دیکھا تو بیبا کیاں ابلی پڑ رہی تھیں میں قریب گیا تو چینی پھول اور کھل اٹھا۔۔۔ ہونٹوں کی نازک و نرم پتیوں میں خوشگوار حرکت پیدا ہوئی جیسے سرسراتی ہوا چھیڑتی ہوئی گذر گئی ہے۔۔۔۔ پھولوں کے گلدستے کی طرف اشارہ کرتی ہوئی بیباک نگاہوں نے پوچھا ان میں سے کیا چاہیئے۔۔۔۔ مجھے اچانک وسیم بریلوی کی بات یاد آ گئی کہ ان بیباک آنکھوں میں تعلقات ٹک نہیں سکتے۔۔۔۔ میں وہاں سے اگلی دکان کیطرف بڑھ گیا۔۔۔ یہاں پھولوں کے پیچھے ایک سانولی سلونی مالن کھڑی تھی، مجھے قریب آتا دیکھ کر پھولوں کی طرف جھکی۔۔۔ میں نے اشارہ سے کاسنی چہرہ کے قریب ایک گلدستہ کی طرف اشارہ کیا اور قیمت پوچھی۔۔

کہنے لگی!۔۔60 رنگٹ

60 رنگٹ میں نے پاکستانی روپے میں حساب لگایا تقریباً ڈیڑھ ہزار روپے۔۔۔ ہم سمجھے مالن اپنی قیمت بتا رہی ہے۔۔

اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ذومعنوی نظروں سے دیکھا اور کہا۔۔۔ نہیں۔۔۔۔ نہیں، آپ کی نہیں، اس گلدستہ کی قیمت؟

اس کا کھلتا چہرہ اور شگفتہ ہونٹ لمحہ بھر کو مرجھا گئے۔۔۔۔ پھر اس نے دکھے دل سے مسکرانے کی کوشش کی۔۔۔۔ اور کہا، میں نے اسی گلدستہ کی قیمت بتائی ہے۔۔60 رنگٹ آپ کو 50 رنگٹ میں دیدونگی۔۔۔۔ یہ کہتے ہوئے اس کی سانولی رنگت پر ہلکی سی سیاہی غالب آ گئی۔۔۔ اس کے بجھتے چہرے اور آنکھوں میں کانپتے دیئے کی روشنی۔۔۔۔ ندامت کے گرم موم کے قطروں کی طرح میرے وجود میں اتر گئی۔۔۔ میرے دل نے کہا۔۔۔ عورت کی بے توقیری بہت بڑا جرم ہے۔۔۔ اور میں اس جرم کا مرتکب ہو چکا تھا۔۔۔ میں نے پھولوں کے پاس کھڑے کھڑے دوبار اس سے معافی مانگی۔۔۔ اعتراف کے چھینٹوں نے اس کے پھول چہرے

پر تازگی پھیلا دی۔۔۔۔ سانولی سلونی رنگت پہ نور اتر آیا، آنکھوں میں کانپتے دیئے پھر روشن ہو گئے، گلاب رنگ ہونٹوں میں تازہ مسکراہٹ کھل اٹھی۔۔۔۔

کوئی بات نہیں۔۔۔۔ Its ok۔۔۔

میں نے گردن جھکائی اور آگے بڑھ گیا۔۔۔ پھولوں کی اور بھی دکانیں تھیں ان دکانوں کے پیچھے اور بھی پھول کھلے تھے۔۔۔ ملائے پھول۔۔۔ چینی پھول۔۔۔ تامل پھول۔۔۔۔ لیکن ایک پھول نے شگفتہ طبیعت کو دھول دھول کر دیا۔۔۔۔ ملول خاطر ہوتا ہوا میں اپنے مرکز کی طرف گیا یعنی بیگم کی طرف پلٹ آیا۔۔۔۔ وہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کی خریداری میں کھوئی ہوئی تھیں۔۔۔ آہٹ پر چونکیں اور کہنے لگی منی مومی اور نوشین کے لئے یہ برسلیٹ۔۔۔۔ کیسا ہے۔۔۔۔ (مجھے کیا معلوم) میں نے کہا بہت اچھا ہے۔۔۔۔

شاپنگ کر کے بیگم پھولوں والی گلی میں آ گئی۔۔ گلدستے دیکھے اور کہا بہت پیارے ہیں آپ کو یاد ہے نا ایسا ہی ایک گلدستہ۔۔۔

ہوں۔۔۔ میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔۔۔ یہیں ''ملایا ہوٹل'' ہے اس چھوٹی سی گلی کے دکانداروں نے فٹ پاتھ پر تخت رکھ کر سامان سجایا ہوا تھا۔۔ چھوٹی چھوٹی چیزیں۔۔۔۔ علاقائی اور مقامی ثقافت کے فن پارے۔۔۔ گھریلو دستکاری کے نمونے۔۔۔ بچوں کے کھلونے۔۔۔ گھر سجانے کی چیزیں۔۔۔۔ یہاں گھومتے پھرتے اپنائیت کا احساس ہوتا تھا۔۔۔۔ ہم واپس چائنا ٹاؤن کے بڑے دروازے کی طرف بڑھے ملایا ہوٹل کے آس پاس کا علاقہ Jalan

Hang Leaker کہلاتا ہے اسے کلچرل اسٹریٹ بھی کہتے ہیں۔۔۔آگے بڑی سڑک کا نام Raja Balai Polis ہے۔۔

چائنا ٹاؤن کی گلیوں میں متعدد آڈیو ویڈیو شاپس ہیں مقامی فلمی گانوں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔۔۔۔ان میں یہاں کی مقبول اور ممتاز گلوکارہ حیئی لیزا کی آواز بھی کانوں میں رس گھولتی ہوگی۔ چائنا ٹاؤن سے بالکل ملحق Sam Arcade ہے اور اس پرانی طرز کی عمارت کا نام Washa Sing CHU ہے۔۔۔ بڑے بڑے محراب نما دروازے دیوار پر نیلا رنگ غالب اور سنہری رنگ سے جنڈی کاشی کا کام کیا ہوا تھا۔۔۔الٹے ہاتھ پر سڑک پار کرنے والوں کے لئے ایک پرانے طرز کا پل۔۔۔مگر کم لوگ ہی اسے استعمال کر رہے تھے، زیادہ تر پیدل چلنے والے دھیمی رفتار سے گذرنے والی گاڑیوں سے بچتے بچاتے سڑک پار کر رہے تھے۔۔۔بسیں آجا رہی تھیں۔۔۔ٹریفک رواں دواں۔۔۔راستہ دیکھا بھالا تھا کہ کل ہم نے اس علاقہ سے پیدل گذر کر بس پکڑی تھی۔۔۔آگے چلے تو فٹ پاتھ پر سگریٹ کی دکان بھی دکھائی دی جس کے مالک سے ہم نے اپنی ہوٹل تک جانے والی بس کا پوچھا تھا۔۔۔پیدل چلنے کا ایک فائدہ یہ ہے کہ مسافر لوگوں ہی کو نہیں، دکانوں اور مکانوں کے در و دیواروں کو بھی پہچاننے لگتا ہے۔۔

ساڑھے چھ بجے AOS کی صوفیہ ہم سے ملنے آئے گی۔۔۔میں نے بیگم کو یاد دلایا

ابھی ساڑھے پانچ بجے ہیں۔۔۔ہم انشاءاللہ وقت پر پہونچ جائیں گے۔۔۔ہم پرانے شہر کی گلیوں سے گذرتے رہے ایک گلی میں۔۔۔ہم نے دیکھا، ایک آدمی ٹھیلے پر سگھڑی لئے کوئلوں کی جلتی بجھتی آنچ پر بھٹے بھون رہا تھا۔۔کوئلوں کی آنچ کی گود میں مکئی کا سٹہ جب سینکا جاتا ہے یا بھونا جاتا ہے تو ایک خوشبو نکلتی ہے اور آس پاس فضا میں بکھر جاتی ہے۔۔۔راہگیروں کے اٹھتے قدم تھم جاتے ہیں ہم بھی رک گئے۔۔۔اچانک خیال آیا، اس زندہ قوم کا شہری ''بھٹے'' کیوں بھون رہا ہے۔۔۔یہ کام تو ہماری ساری قوم 60 برس سے کر رہی ہے۔۔۔ہمیں اسی ایک کام میں تو ملکہ حاصل ہے۔۔۔ہمیں مکئی کے سٹے کی خوشبو اچھی لگی۔۔۔مگر اس شخص کا بھٹے بھونا اچھا نہیں لگا۔۔۔اس لئے ہم آگے بڑھ گئے۔۔۔

بس مل گئی۔۔۔وقت مقررہ پر روانہ ہوگئی۔۔۔تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ٹریفک سگنلز تھے ہمیں چونکہ جلدی تھی۔۔۔اور بس ڈرائیور کا یہ عالم تھا کہ دور سے پیلی روشنی نظر آئے تو بریک پر پہلے ہی سے پیر دبا دیتا تھا۔۔۔یہی حال دوسری گاڑیوں کا۔۔۔ہم نے دیکھا موٹر سائیکل سوار

نوجوان بھی سرخ رنگ کا انتظار کئے بغیر پیلی بتی پر ہی گاڑی ہلکی کر دیتے ہیں ۔۔۔۔ بڑا غصہ آیا۔۔۔ بس ڈرائیور تو چلو ٹھیک ہے اتنی بڑی لاش لیکر چل رہا ہے لیکن ان لڑکوں کو کیا ہوا۔۔۔ بھئی تم کیوں اس قدر خوفزدہ ہو۔۔۔۔۔ یوں زندگی میں ٹھہر ٹھہر کر چلو گے تو اپنی منزل تک کب پہونچو گے۔۔۔ میں نے تو ایک بار کھڑکی کا شیشہ ہٹا کر کہا بھی کہ میاں صاحبزادے تم پر کیا افتاد پڑی ہے جو تم نے بریک لگا دیئے۔۔۔ دائیں بائیں زگ زیگ کر کے تم تو سرخ بتی جلنے سے پہلے سگنل پار کر سکتے تھے۔۔۔ قانون کا ایسا بھی کیا خوف۔۔۔ آواز سن کر موٹر سائیکل سوار نے ہیلمٹ اتارا۔۔۔ وہ صاحبزادے نہیں ایک چینی گڑیا تھی اردو کیا سمجھتی۔۔۔ اور کچھ سمجھتی تو تب جب اس کے کان کھلے ہوتے ۔۔۔ ہیلمٹ پہن کر کیا خاک سنائی دیا ہوگا۔۔۔ مگر صاحب صبر وضبط کا یہ عالم کہ مسکراتی ہیلمٹ پہنا اور جوں کی توں کھڑی رہی۔۔۔ گرین سگنل پر بھی اٹھلاتی ہوئی دھیرے دھیرے آگے والی کار کے پیچھے رینگنے لگی۔۔۔ کراچی میں تو اب تک بیس موٹر سائیکل سوار سگنل توڑ کر ایک فرلانگ کا فاصلہ طے کر چکے ہوتے۔۔۔ دل نے کہا کیا خاک آزاد ہوئے ہیں، انگریز سے آزادی حاصل کی تو اس کے بناتے ہوئے قوانین کی غلامی کر لی۔۔

بس ڈرائیور بھی اتنی فرصت سے بس چلا رہا تھا جیسے ''سلوسائیکلنگ'' کے مقابلے میں حصہ لے رہا ہو۔۔۔ ہم بار بار گھڑی کو دیکھیں اور ڈرائیور ٹریفک سگنلز کی بتیوں کو۔۔۔۔ ایک جگہ آ کر سگنل سے بہت پہلے بس رک گئی۔۔۔ اس لئے رک گئی کہ اس کے آگے کی گاڑیاں رکی ہوئی تھیں۔۔۔ دو چار منٹ گذر گئے۔۔۔۔ مگر وہ ڈرائیونگ سیٹ پر اطمینان سے بیٹھا رہا جیسے ہوٹل میں چاء کا آرڈر دے کر انتظار کر رہا ہے۔۔۔ ڈرائیور کو چھوڑیئے۔۔۔ ہماری بس میں کوئی تیس چالیس مسافر تھے۔۔۔ اور اتنے آرام سے بیٹھے تھے جیسے پکچر ہاؤس میں کوئی روتی ہوئی سوشل فلم دیکھ رہے ہیں، کسی کو عجلت نہیں، کسی کو جلدی نہیں۔۔۔ کسی کو پریشانی نہیں۔۔۔۔ عجیب بے کار اور فالتو لوگ ہیں، مجھے یوں لگا جیسے ان کا نہ کوئی گھر ہے۔۔۔ اور نہ کوئی انتظار کرنے والا۔۔۔ مگر ہمیں تو جلدی تھی اور پھر یہ کم بخت وقت کے بڑے پابند ہیں۔۔۔ صوفیہ تو ساڑھے چھ بجے پہونچ جائے گی اور بس ہے کہ چلنے کا نام نہیں لیتی۔۔۔ ہم پہلو بدلتے رہے۔۔۔ اٹھ اٹھ کر ونڈ اسکرین سے باہر جھانکتے رہے بس ڈرائیور بھی عجیب بونگا آدمی تھا۔۔۔۔ بھائی تم کچھ نہیں کر سکتے ہارن تو بجا سکتے ہو۔۔۔۔ سڑک پر دور تک ٹریفک رکی ہوئی تھی۔۔۔۔ کوئی شور وغل۔۔۔ کوئی سائرن۔۔۔ کوئی ہارن۔۔۔ کوئی احتجاج۔۔۔۔ حتیٰ کہ کوئی جانکاری بھی نہیں۔۔۔ ایک دوسرے سے

ٹریفک جام ہونے پر تبصرہ نہیں کر رہے تھے۔۔۔بس منہ میں گھونگنیاں ڈالے بیٹھے تھے۔۔۔۔ اللہ اللہ کر کے بس نے رینگنا شروع کیا۔۔۔دو منٹ بعد سگنل پار کیا تو ہمارا اسٹاپ آ گیا۔۔۔'' انٹرنیشنل یونیورسٹی کالج'' اور سڑک کے اس پار ہمارا ہوٹل۔۔۔ہمیں ذرا بھی پتا ہوتا تو کب کے بس سے اتر کر دو منٹ میں ہوٹل پہونچ جاتے۔۔

جلدی جلدی کمرے میں گئے۔۔۔منہ پر چھپا کا مارا۔۔۔اجلے اور دھلے ہوئے تولیہ سے منہ پونچھا۔۔۔بیڈ روم میں نگاہ ڈالی تو سفید چادر پر ایک لفافہ اور لفافہ کے اوپر چھوٹے چھوٹے تین پھولوں کی ننھی منی ڈالی۔۔۔لفافہ کھولا تو گرانڈ کانٹی نینٹل ہوٹل کے جنرل مینیجر Ronny Wong کے دستخط کے ساتھ ایک خط۔۔۔ ہوٹل کے قیام پر شکریہ اور نیک تمناؤں کا اظہار۔۔۔طبیعت خوش ہوگئی۔۔۔۔ ننھے منے تین خوبصورت اور خوش رنگ پھولوں نے سفر کی ساری کوفت دور کر دی۔۔۔بیگم نے کافی کا مگ میز پر رکھا۔۔۔میں نے ابھی ایک Sip ہی لی تھی کہ پہلی بار بیڈ روم کے برابر میز پر رکھے ہوئے فون کی گھنٹی بجی۔۔۔آپریٹر نے بتایا کہ لابی میں آپ کے مہمان بیٹھے ہیں۔۔۔میں نے گھڑی میں وقت دیکھا 6 بج کر 28 منٹ۔۔۔وقت کی پابندی کی بہترین مثال۔۔

جلدی جلدی کافی ختم کر کے میں نیچے لابی میں پہونچا۔۔۔دو خواتین لفٹ کے برابر صوفہ میں بیٹھی تھیں۔۔۔میں نے ان کی طرف دیکھا اور مسکرایا تو دونوں خواتین کھڑی ہوگئیں۔۔

صوفیہ۔۔۔دبلی پتلی منحنی سی لڑکی نے کہا۔۔۔اتنی دبلی بلکہ اسمارٹ تھی کہ بھیڑ میں گم ہو جائے تو دوربین کے بغیر تلاش ناممکن ۔۔۔۔پھر اپنی ساتھی کا تعارف کراتے ہوئے کہا حبشہ محمد یوسف یہ AOS میں کسٹمر سروسز ایڈمنسٹریشن میں میری ساتھی ہیں۔۔

صوفیہ نے اب تک اردو میں بات کی، حبشہ نے انگریزی کا سہارا لیا، صوفیہ نے کہا یہ ملائے ہیں کھلتا رنگ نہیں بلکہ گورا رنگ ۔۔۔صوفیہ کے مقابلے میں صحت مند ۔۔۔ گفتگو شروع ہوئی۔۔۔اس دوران صوفیہ نے چند صفحات پر مشتمل لٹریچر مجھے دیا جس کا وعدہ انہوں نے کیا تھا حبشہ نے پوچھا اس سفر کے دوران ہماری طرف سے کوئی شکایت تو نہیں ہوئی۔۔۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا بس ایک شکایت ہے کہ کوئی شکایت کا موقع آپ لوگوں نے نہیں دیا۔۔۔

پھر ملیشیاء کی سماجی زندگی میں گفتگو شروع ہوئی ۔۔۔ میرے سوالوں کے جواب میں انہوں نے بتایا کہ اکثر مسلمان گھرانوں میں نکاح کی رسم مسجد میں ادا کی جاتی ہے اس کے بعد لوگ

اپنے گھر کے سامنے شامیانے لگا کر اپنی استطاعت کے مطابق مہمانوں کو ولیمہ کی تقریب میں بلاتے ہیں۔۔۔۔۔ ہندو، مندر میں پھیرے لگاتے ہیں اور کسی ہوٹل میں عزیزوں کو مدعو کر لیتے ہیں جبکہ چینی اور بدھسٹ Temple میں اپنے عقائد کے مطابق شادی کرتے ہیں، زیادہ مہمان بلانے کا رواج نہیں، دس پندرہ مہمانوں کے لئے ہوٹل میں ایک میز Reserve کرائی اور شادی کی خوشی میں کھانا کھالیا۔۔۔

انہوں نے بتایا کہ کوالالمپور میں ''میرج لان'' نہیں ہیں لیکن ایسے کمرشل ادارے موجود ہیں جو شادی کی تیاریوں میں خدمات مہیا کرتے ہیں۔۔۔ شادی پر فضول اخراجات سے گریز کیا جاتا ہے کوالالمپور پانچ چھ میل میں پھیلا ہوا ہے۔۔۔ یہ مکمل کمرشل سٹی ہے۔۔۔ رہائشی کالونیاں ۔۔مکانات اور کم لاگت کے فلیٹس شہر سے ذرا دور بنائے گئے ہیں آنے جانے کے لئے بہت آسانیاں ہیں کوالالمپور میں، کراچی کی طرح رتجگائی کا تصور نہیں ہے آٹھ نو بجے شہر بند ہو جاتا ہے سوائے ہوٹلوں اور تفریحی مقامات کے۔۔

میرے ایک سوال کے جواب میں حبشہ نے بتایا کہ مسلم گھرانوں میں اسلامی اقدار کا بہت خیال رکھا جاتا ہے۔۔۔ خواتین مکمل لباس پہنتی ہیں ہاں چند گھرانے مغربی تہذیب سے متاثر ہیں لیکن غالب اکثریت بہت محتاط ہے اور اکثر خواتین اسکارف پہنتی ہیں۔۔۔۔ اس ملک میں کوئی بھوکا نہیں سوتا اور کوئی بے گھر نہیں۔۔۔ بھیک مانگنے پر سخت پابندی، یہاں تک کہ بھیک دینا بھی جرم ہے۔۔۔ بیت المال کا نظام بہت موثر اور مستحکم ہے بے روزگاری نہیں ہے لیکن لوگ بہتر ملازمت کی تلاش میں رہتے ہیں۔۔۔

تعلیم کا ایک ہی نصاب اور ایک ہی نظام رائج ہے پانچ ایکڑ رقبہ پر پرائمری اسکول کی عمارت ہوتی ہے، سات ایکڑ رقبہ پر سیکنڈری اسکول کی عمارت ہوتی ہے اور ملک بھر اسکولوں کی تمام عمارتیں ایک جیسی ہوتی ہیں۔۔۔ ضرورت مند طلباء کو کتابیں اور یونیفارم مہیا کرنا بھی حکومت کی ذمہ داری ہے۔۔۔ ہمارے یہاں زندگی کے ہر شعبے میں وقت کی پابندی لازمی ہے دس منٹ کا Margin دیا جاتا ہے۔۔

آپ کے ہاں سیاح کتنے آتے ہیں۔؟

ملائیشیاء میں دنیا بھر سے سیاح آتے ہیں اور بارہ مہینے آتے ہیں کیونکہ پورے سال ایک سا موسم رہتا ہے۔۔۔ ہمارے ملک کی جتنی آبادی ہے اتنی ہی تعداد میں ہر سال سیاح آتے ہیں

میرے ایک سوال کے جواب میں انہوں نے بتایا کہ یہاں رمضان کا پورا مہینہ بڑے اہتمام اور مذہبی خوش وخروش سے منایا جاتا ہے۔۔۔تمام بڑی راتوں میں مسجدیں بھری ہوتی ہیں۔۔۔ مسلمانوں کے ساتھ دیگر مذاہب کے لوگ بھی مسلمانوں کے ساتھ رمضان کی خوشیوں میں شریک ہوتے ہیں۔۔۔۔سڑکوں اور گلیوں میں افطار کا سامان فروخت ہوتا ہے اور شام ہوتے ہی لوگ افطاری خرید کر گھروں کو پہونچ جاتے ہیں۔۔۔پورا شہر سجایا جاتا ہے۔۔۔عید واقعی قابل دید ہوتی ہے لیکن بقرعید پر صرف جانور ذبح کئے جاتے ہیں اور بس۔۔۔انہوں نے بتایا کہ ملک میں مکمل مذہبی آزادی ہے مذہبی حوالے سے کبھی کوئی تنازع نہیں ہوتا۔۔۔عورتیں اور مرد سب لوگ کام کرتے ہیں دس جماعت تک تعلیم اور اس کے دیگر اخراجات حکومت کی ذمہ داری ہے۔۔۔ ابتدائی تعلیم لازمی ہے۔۔۔

صوفیہ نے بتایا کہ لوگوں کی بڑی تعداد مذہبی عبادات میں شرکت کرتی ہے۔

میں نے لٹل انڈیا کے بارے میں پوچھا تو حبشہ نے بتایا کہ آپ کے تو بہت قریب ہے پیدل ہی جاسکتے ہیں۔۔۔۔مگر ۸ بجے بازار بند ہونے لگتے ہیں۔۔۔صوفیہ بھارتی نژاد ملیشین ہیں جبکہ حبشہ ملائے ہیں۔۔۔یہ جوہر اسٹیٹ میں پیدا ہوئیں۔۔۔صوفیہ کی اردو بہت اچھی تھی آواز میں مٹھاس اور لہجہ میں شائستگی۔۔۔مگر دونوں کے رویوں میں بڑا اعتماد۔۔۔دونوں خواتین سرتا پیر ملبوس۔۔۔۔ان سے دیر تک باتیں ہوتی رہیں، میں نے معلوماتی لٹریچر فراہم کرنے پر صوفیہ کا شکریہ ادا کیا اور ان سے اجازت لیکر واپس کمرے میں آ گیا۔

بیگم بستر پر لیٹی بے توجہی سے T.V دیکھ رہی تھیں۔۔

صوفیہ سے مل آئے۔۔۔کیسی رہی آپ کی ملاقات۔۔۔کچھ کام بنا۔۔۔بیگم نے استفسار کیا۔۔

جی۔صوفیہ ہی سے نہیں بلکہ حبشہ سے بھی ملاقات ہوگئی۔۔

حبشہ۔۔۔ذرا مختلف نام ہے۔۔۔۔! کیا سیاہ فام تھی۔۔

نہیں ملائے تھی۔۔۔مگر گوری اور ٹھیک ٹھاک خوبصورت تھی AOS جوہر اسٹیٹ کو ڈیل کرتی ہے۔۔

صوفیہ نے کچھ میٹریل دیا آپ کو۔۔۔بیگم نے سوال کیا۔۔

ہاں، لیکن کام کا نہیں ہے ان تمام شہروں کے بارے میں معلوماتی مواد مہیا کیا ہے، جہاں

ہم گئے نہیں لیکن ملائیشیاء کے سماجی نظام کے بارے میں بہت سی باتیں ہوئیں۔۔۔ یہ سن کر بڑا تعجب ہوا کہ یہاں شادی لان نہیں ہیں اور لوگ بڑی سادگی سے بیاہ شادی کی رسومات ادا کرتے ہیں، بہت سی باتیں ہمیں پہلے سے پتا تھیں۔ تاہم ان سے ملاقات کے دوران معلومات تازہ ہوگئیں۔۔۔

اچھا جناب اب یہ بتائیے کہ رات کھانا کہاں کھانا ہے۔۔

یار کھانے کی بات تو بعد میں کریں گے۔۔۔ میرے خیال سے مغرب کی اذان ہوگئی یہ کہہ کر میں صوفہ سے اٹھا اور دیوار پر پڑا پردہ ہٹا دیا۔۔۔ سارا شہر میلی اوڑھنی لپیٹے آرام کر رہا تھا۔۔۔۔۔۔ میں نے باہر کی طرف دیکھا۔۔۔۔ اور کہا کہ ابھی مغرب نہیں ہوئی۔۔ کیونکہ کسی بھی عمارت میں Neon Sighn اور بتیاں نہیں جلی ہیں۔

آپ کا خیال صحیح ہے، میں نے گھڑی دیکھی ساڑھے سات بجنے میں پانچ منٹ باقی ہیں۔ مجھے تو اس پر حیرت ہے کہ نئے پاکستانی وقت کے مطابق کراچی میں بھی ساڑھے سات بجے اذان ہوتی ہے اور اس وقت یہاں بھی مغرب ہوتی ہے۔

آپ نے ٹھیک سوچا۔۔۔ ورنہ کراچی اور اسلام آباد میں بھی مغرب کی نماز کے وقت میں کافی فرق ہے۔۔۔ اس کے بعد کل کی طرح ہم نے دیکھا ٹوئن ٹاور اور اس کے بعد KLR TOWER کے اوپری حصوں میں بلب جلنے لگے۔۔۔ آس پاس کی عمارتوں میں بھی دو تین نیو سائن طلوع ہوئے اور ساتھ ہی فضا میں اللہ واکبر۔۔۔ کی آواز فضا میں گونجنے لگی۔

دونوں ٹاورز میں دودھیا روشنیوں کی چادروں پر رنگ برنگے ستارے چمک رہے تھے۔۔۔ نیلے رنگ کے موتی زیادہ نمایاں تھے۔۔۔ ان دونوں عمارتوں میں لائیٹنگ کا کمال اہتمام کیا ہے۔۔۔ منو! آپ نے حرمین شریفین کے بلند مینار دیکھے ہیں۔۔۔ مقابلہ کرنا ہرگز مقصود نہیں لیکن مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ خانہ کعبہ کے میناروں پر جگمگاتی روشنیوں کی لاکھوں کرنوں میں سے چند کرنیں چرا کر ڈاکٹر مہاتیر محمد نے ان دونوں ٹاورز میں سجادی ہیں۔۔۔۔ رہ رہ کر مکہ و مدینہ کے مقدس مینار یاد آنے لگتے ہیں اسی لئے مجھے جب بھی موقع ملتا ہے میں ان کی روشنیاں دیکھتا رہتا ہوں۔۔۔۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔۔۔ مجھے بھی ایسا ہی گمان ہوتا ہے۔۔۔ اچھا پہلے میں نماز پڑھ لیتی ہوں۔۔

بیگم نیت باندھ کر اپنے رب کے حضور مودب کھڑی ہوگئیں۔

مجھے یوں ہی خیال آیا کہ یہاں کی ہوٹل میں جاء نماز کیوں نہیں ہوتی۔۔۔صرف Bayview Hotel Pening میں ہمیں جاء نماز ملی تھی۔۔۔اور حیرت کی بات یہ ہے کہ وہاں میز کی دراز میں بائیبل بھی رکھی تھی۔۔۔۔اچھی بات ہے۔۔۔لیکن قرآن کریم کا ایک نسخہ بھی رکھنا چاہیئے۔۔۔۔اور ہاں لنکاوی میں تو ہوٹل والوں نے جاء نماز مہیا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔۔۔وہ تو اچھا ہے کہ یہاں جہازی قسم کے تکیہ ہوتے ہیں ان کا غلاف نکال کر ہم جاء نماز کا کام لیتے ہیں۔۔۔لیکن ایک بات اچھی ہے ہر ہوٹل میں قبلہ کی نشاندہی کے لئے چھت پر تیر کا نشان لگا ہوتا ہے۔۔

وقت کی پابندی کے علاوہ یہاں صفائی کا انتظام بہت اچھا ہے۔۔۔ملیشین قوم نے صفائی کو واقعی اپنا نصف ایمان سمجھا ہے۔۔۔ہوٹلوں میں صفائی کا معیار ہمارے لئے چونکا دینے والا تھا لیکن ٹھیک ہے یہ کمرشل ادارہ ہے اور اپنے مہمانوں کو بہتر سہولیات فراہم کرنا ان کی ذمہ داری ہے۔۔۔۔لیکن پورے شہر میں کمال کی صفائی ہے۔۔۔سڑکوں پر۔۔۔۔فٹ پاتھ پر۔۔۔۔ گلیوں میں دکانوں کے اندر ہی نہیں بلکہ باہر۔۔۔۔ پھر تفریحی مقامات اور پارکوں میں ۔۔۔۔ہر جگہ اتنی صفائی کہ نہ کہیں پلاسٹک کی تھیلی۔۔۔۔نہ کاغذ کا ٹکڑا۔۔۔۔نہ پیکنگ کے خالی ڈبے۔۔۔ریت۔۔۔دھول۔۔۔اور کچن کی باقیات تو دور کی بات ہے۔۔۔لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ اگر کچرا چننے والے نوعمر بچے یہاں ہوتے تو بھوکوں مر جاتے۔۔۔۔کیا خبر ایسے بچے بچارے بھوکوں مر رہے ہوں۔۔۔عجیب تضاد ہے، ایک طرف تو عوام کو روزگار مہیا کرنے کے لئے مختلف مواقع مہیا کئے جاتے ہیں اور دوسری طرف کچرا ڈھونڈنے والے بچوں کو روزگار سے محروم کیا جا رہا ہے۔۔۔ایسی بھی کیا صفائی۔۔۔۔!! کہ گھر کے باہر اگر غلطی سے بھی کچرا گر جائے یا شاپنگ بیگ۔۔۔۔کولڈ ڈرنک کا خالی ٹن۔۔۔سگریٹ کا خالی پیکٹ تو بغیر کسی مقدمہ کے گھر کے مالک پر ایک ہزار رنگٹ تک کا جرمانہ عائد کر دیا جاتا ہے اور جرمانہ نہ صرف عائد ہوتا بلکہ فوری وصول کر لیا جاتا ہے ۔۔۔بڑی زیادتی ہے۔۔۔یہ شہری آزادی نہیں غلامی ہے۔۔۔۔جب شہر کی گلی کوچوں۔۔۔۔بازاروں اور شاپنگ سینٹرز میں کچرا ہی نہیں ہوگا تو غریب بچے کہاں سے کچرا تلاش کریں گے۔۔۔۔ہم نے تو عوام کی آزادی اور بے روزگار بچوں کو رزق تلاش کرنے کے لئے اپنا ''نصف ایمان'' بھی قربان کر دیا۔۔۔۔ہمارے خیال میں تو مغرب کی نقالی نے ملائیشیا والوں کو اس حال تک پہونچایا ہے۔۔۔یہاں بے چارے عوام قانون

سے اس قدر خوفزدہ ہیں کہ سگریٹ جلا کر ماچس سڑک پر پھینکنے سے ڈرتے ہیں۔۔۔کولڈ ڈرنک۔۔۔یا کافی خرید لیں تو خالی ٹن اور پیپر کپ ہاتھ میں لئے ڈسٹ بن ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔۔۔سڑک پر تھوکنا تو بڑا جرم ہے۔۔۔یہ بیچارے تو رات کو بھی چوکس ہو کر سوتے ہیں کہ کہیں کوئی مخالف پڑوسی ان کو غافل پا کر ان کے دروازے کے باہر اپنے گھر کا کچرا نہ پھینک دے۔۔۔ہم نے خود دیکھا ہے کہ چاکلیٹ یا ٹافی کھا کر بچے تک ان کے ریپر کو چھالے کی طرح مٹھی میں لئے پھرتے ہیں۔۔۔بھلا اتنی پابندیوں کے بعد اس ملک کے بچے آزادی کی نعمت سے کیا خاک لطف اٹھاتے ہونگے۔۔۔پھر ایک اور خیال آیا۔۔۔کیا یہاں درختوں کے پتے پیلے نہیں ہوتے انہیں یرقان کا مرض لاحق نہیں ہوتا۔۔۔یا انہوں نے اقبال کا پیغام سن کر اسے مقصد حیات بنالیا ہے۔۔

پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ"

پتوں کے لئے تو اقبال کا یہ ظاہری پیغام ہی بہت کافی ہے۔۔۔پھر خیال آیا کہ ہم نے پارکوں میں اور سڑکوں کے کنارے کتنے مالی دیکھے جو اکڑوں بیٹھے، سر نیہوڑائے، لان میں موجود ایک ایک۔۔۔پیلی اور مرجھائی ہوئی پتیوں کو چن چن کر جمع کر رہے تھے۔۔۔بہر حال اتنی صفائی دیکھ کر تو ہمیں اکتاہٹ سی ہونے لگی تھی۔

بیگم نماز سے فارغ ہوئیں۔۔۔ہم نے بھی اپنے رب کا شکر ادا کیا۔۔

بیگم نے کہا آپ نے یہاں کسی کو بھیک مانگتے دیکھا۔۔۔؟

میں نے کہا۔۔۔یہاں تو بھیک مانگنا جرم ہے۔۔بلا ضرورت ہارن بجانا بھی منع ہے

آپ ٹھیک کہتے ہیں سڑکوں پر چلتی ٹریفک کے دوران بھی ہارن کی آواز نہیں سنی۔

ہاں میں نے صرف ایک بار ایمبولینس کو ہارن بجاتے گذرتے دیکھا تھا اس کا مطلب ہے کہ یہاں ٹریفک حادثات بھی بہت کم ہوتے ہیں۔۔۔بیگم نے کہا۔۔

جب سواریاں رینگ رینگ کر چلیں گی تو حادثات کیسے ہونگے۔۔

خیر ایسا بھی نہیں ہے موٹروے پر بڑی تیز رفتاری سے گاڑیاں چلتی ہیں۔

ہاں تم ٹھیک کہتی ہو مگر موٹروے پر سڑک بالکل صاف ہوتی ہے

پھر ہمارے یہاں موٹروے اور سپر ہائی وے پر حادثات کیوں ہوتے ہیں۔

آپ کی بات ٹھیک ہے۔۔۔جب کسی ملک کے لوگ بھیڑ اور مجمع کی صورت زندگی

گذارتے ہیں تو یہ مسائل پیدا ہوتے ہیں۔۔۔انبوہ کثیر سے نظم وضبط کی توقع عبث ہے۔۔۔ہم قوم نہیں ہیں۔۔۔لوگوں کا اژدھام ہیں۔۔۔۔''ملیشین ایک قوم ہے''

قوم بننے کے لئے کس چیز کی ضرورت ہے۔۔

میرے خیال میں قانون کی حکمرانی اور عدل۔۔۔یہ دو چیزیں جہاں درست ہو جائیں وہاں تمام مسائل حل ہو جاتے ہیں۔۔۔آپ کو پتہ ہے اگر کسی گھر کے سامنے کچرا پڑا ہو اور مالک مکان اسے صاف نہ کرے تو ایک ہزار رنگٹ کا جرمانہ ہے۔۔۔اور اس کام کے لئے کسی مقدمے یا فیصلہ کی ضرورت نہیں۔۔بلدیہ کا آدمی آئے گا اور ایک ہزار روپے اسی وقت وصول کر لے گا۔۔۔آپ کے پاس نہیں ہے تو بینک سے نکلوالیں۔۔۔کسی رشتہ دار یا دوست مانگ لیں۔۔۔لیکن جرمانہ ادا کرنا ہوگا خواہ آپ با اثر شخصیت ہوں۔۔۔رکن پارلیمنٹ ہوں۔۔۔شاہی خاندان کے فرد ہوں یا عام زن ومرد۔۔۔جرمانہ تو ادا کرنا ہوگا۔۔۔

ایک ہزار رنگٹ۔۔۔یعنی ہمارے تقریباً بائیس ہزار روپے، کس کی مت ماری گئی ہے کہ گھر کے سامنے کچرا ڈالے گا۔۔۔میری جیسی تو بار بار دروازہ کھول کر دیکھے کہ کہیں کوئی دوسرا تو گھر کے سامنے کچرہ نہیں ڈال گیا۔۔۔

یہاں کے لوگ بھی چوکس ہوتے ہونگے۔۔۔میں نے چڑ کر کہا۔

خیر چھوڑو۔۔۔آؤ باہر نکلتے ہیں۔۔۔۔میں نے بیگم سے کہا۔

ٹھیک کہتے ہیں آپ۔۔۔آس پاس کی سڑکوں پر چہل قدمی کریں گے تازہ ہوا اور قدرت کے حسین مناظر سے لطف لیں گے، پھر وہیں کہیں رات کا کھانا کھالیں گے۔۔۔۔

''لٹل انڈیا'' رہ گیا۔۔۔کسی نے ہمیں صحیح طور پر گائیڈ نہیں کیا۔۔۔بیگم نے افسردہ لہجہ میں کہا۔۔۔

ہاں خوب یاد آیا۔۔۔حبشہ نے بتایا تھا کہ ہمارے ہوٹل سے قریب ہے۔۔۔

پیدل جاسکتے ہیں۔۔۔یار آپ نے بتایا نہیں، ہم چلے چلتے۔۔۔۔بیگم نے خفگی کا اظہار کیا۔۔۔

بے کار تھا۔۔۔حبشہ کہہ رہی تھی کہ ۸ بجے بازار بند ہونا شروع ہو جاتے ہیں، ہاں مجھے بھی ''حمیکا مسجد'' نہ دیکھنے کا ملال رہے گا۔۔

خیر چھوڑیئے اب ہمیں چلنا چاہیئے۔۔۔ملا ایشیاء میں یہ ہماری آخری رات ہے پھر جانے

دوبارہ آنا نصیب ہو کہ نہ ہو۔۔

جب آپ کسی شہر یا احباب سے رخصت ہونے لگتے ہیں، تو طبیعت اداس ہو جاتی ہے، پس ہم باہر نکل کر مناظر سے لطف اندوز نہ ہو سکے۔ یوں بھی ہوٹل کے آس پاس کا حصہ ہم کئی بار دیکھ چکے تھے، شاید ذہن میں سفر سوار ہو گیا تھا۔۔۔ یوں ہی بے دلی کے ساتھ فٹ پاتھ پر چلتے رہے، یاد نہیں ہم نے کہاں اور کس ہوٹل میں کھانا کھایا۔۔۔ واپس آ کر۔۔۔ ہوٹل کی لابی میں آ کر بیٹھ گئے۔۔۔ ہمیں یوں لگا کہ ہوٹل میں بھی چاروں اور اداسی چھائی ہوئی ہے۔۔۔ ممکن ہے، لابی میں معمول کے مطابق رونق ہو لیکن ہمیں ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ یہاں چہل پہل کم ہے ۔۔۔ یوں بھی گرانڈ کانٹی نینٹل ہوٹل کی لابی میں دیگر ہوٹلوں کے مقابلے میں ہم نے کم ہی رونق دیکھی تھی۔۔۔ بہر حال، ہمیں سامان کی پیکنگ بھی کرنا تھی اس لئے ہم اپنے کمرے میں آ گئے۔

☆☆☆

گھر کی طرف واپسی

صبح بہت جلدی اٹھے ۔۔۔ شاور لیا کپڑے تبدیل کئے ۔۔۔ اور نیچے ناشتہ کرنے آئے، ناشتہ کیا۔۔۔ کاؤنٹر جا کر اپنے جانے کی اطلاع دی۔۔۔ پورٹر کمرے سے ہمارا سامان لے آیا، واپسی کے لئے AOS کے ڈرائیور کا انتظار نہیں کرنا پڑا کہ وہ وقت مقررہ پر ہوٹل پہونچ گیا۔۔

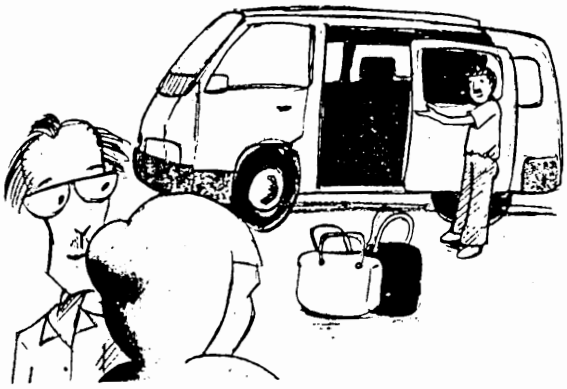

شہر سے کوالالمپور ائیر پورٹ 70 کلومیٹر دور ہے۔۔۔ ڈرائیور نے بتایا کہ ہم ایک گھنٹے میں پہونچ جائیں گے۔۔۔ ہم چار دن پہلے پینانگ سے جب کوالالمپور ائیر پورٹ پہونچے تو پروگرام کے مطابق ہم جینٹنگ ہائی لینڈ روانہ ہو گئے تھے، اب چونکہ ہم شہر سے ائیر پورٹ جا رہے تھے تو یہ راستہ ہمارے لئے نیا تھا۔۔۔ ابتدائی راستہ تو دیکھا بھالا تھا لیکن جب شہر کی آبادی سے آگے بڑھے تو ائیر پورٹ جانے کا راستہ ہمیں بہت خوبصورت لگا۔۔۔ ابھی صبح کے نو بجے تھے سورج نکل آیا لیکن مہربان تھا، دھوپ میں آنکھیں خیرہ کرنے والی شدید روشنی بھی نہ تھی اور نہ ہی فضا میں تمازت تھی۔۔۔ ہلکی ہلکی روشنی چاروں اور پھیلی ہوئی تھی۔۔۔ موٹروے کے اطراف کی ڈھلاوٹ قابل دید تھی نشیب سے فراز تک اٹھتی ہوئی گھاس بہت تازہ اور سبز تھی۔۔۔ گھاس پر گھاس کی مدد سے استقبالیہ اور رخصتی کے کلمات لکھے ہوئے تھے۔۔۔ گھاس کو نہایت مہارت سے تراشا گیا تھا۔۔

سڑک کے کنارے بڑی خوبصورت مسجد تھی۔۔۔ ایک منزلہ۔۔۔ سرخ اور ترچھی چھتوں کے سینکڑوں مکانات تھے اب ہم کھلی سڑک پر آ گئے سڑک کے دونوں اطراف کشادگی تھی کئی رہائشی

بستیاں گذریں کئی فلاورز سے گذرے ۔۔۔۔۔ایک فلائی اور شائد کئی کلومیٹر طویل تھا۔۔۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر رہائشی بستیاں تھیں جہاں شاپنگ سنیٹرز بھی اور دفتری عمارتیں بھی اور لوگوں کی آمد ورفت بھی جاری تھی۔۔۔انڈسٹریل ایریا شروع ہوگیا۔۔۔اسکی تفصیل ہم شاید لکھ چکے ہیں۔۔۔''پترا جایا'' کا ٹول پلازہ سڑک پر کوئی درجن بھر گیٹ تھے۔۔۔ٹول ٹیکس ادا کرنے کے لئے گاڑی روکی گئی۔۔۔ذرا آگے چلے تو ایک بغیر ستونوں کا فلائی اور دیکھا جیسے دریا سندھ پر سکھر کے مقام پر کمان کی صورت ریلوے کے لئے پل بنا ہوا ہے۔۔۔ڈرائیور نے بتایا کہ یہ تمام سڑکیں B.O.T کی بنیاد پر پرائیوٹ سیکٹر نے بنائی ہیں اور ٹول ٹیکس بھی وہی کمپنی وصول کرتی ہے جس نے یہ سڑکیں اور فلائی اوورز بنائے ہیں۔۔۔راستے میں ہم نے بہت سے پھلوں کے باغات دیکھے دونوں طرف مختلف پھلوں کے درخت لگے ہوئے تھے اور یہ سلسلہ کافی طویل تھا۔

☆☆☆